میخائل شولوخوف

دل کے کہنے پر



"میں اس حقیقت‌پسندی کا ذکر کر رہا ہوں جس میں زندگی کو نیا کرنے اور اس کو انسان کے فائدے کے لئے ازسر نو منظم کرنا مضمر ہوا کرتا ہے۔ میں یقیناً اس چیز کا تذکرہ کر رہا ہوں جسے ہم سوشلسٹ حقیقت‌پسندی کہتے ہیں۔ اس میں انوکھاپن یہ ہے کہ یہ ایک ایسے عالمی نقطۂ‌نظر کا اظہار کرتی ہے جو نہ تو گیان دھیان پر ایمان رکھتا ہے، نہ حقیقت سے فرار پر بلکہ جو لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ نوع انسانی کی ترقی کے لئے جدوجہد کریں، انہیں ان مقاصد کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جن کی کروڑوں لوگ حمایت کرتے ہیں اور جو ان کےلئے اس جدوجہد کی راہیں روشن کرتا ہے۔"

میخائل شولوخوف

"آرٹ میں لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کرنے کی قوت ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ فنکار کہلانے کا حق ان مصنفوں کو پہنچتا ہے جو اس تاثر کو نوع انسانی کی بھلائی کے لئے، اور لوگوں کی روح میں حسن کی ایک دنیا تخلیق کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔"

میخائل شولوخوف

میخائل شولوخوف

دل کے کہنے پر

انشائیے، خاکے اور تقریریں

دارالاشاعت ترقی
ماسکو

ترجمہ : امیر اللہ خان
ڈیزائن : س۔ دانیلوف

М. Шолохов
ПО ВЕЛЕНИЮ ДУШИ
На языке урду
Составление и предисловие Ю. Лукина

سوویت یونین میں شائع شدہ

Ш $\frac{70202-868}{014(01)-76}$ 624—76

فہرست

صفحہ

تیسرا حصہ ۔ نوجوان

زندگی — ادیب — نوجوان

زیر نظر کتاب میں شامل کی جانےوالی تصویروں میں سے ایک میں میخائل شولوخوف اپنی میز کے آگے بیٹھے خطوط دیکھ رہے ہیں۔ دراصل دن کا ایک بڑا حصہ اسی میں صرف ہوتا ہے۔ سوویت یونین کے گوشے گوشے سے دریائے ڈان کے ساحل پر واقع گاؤں ویشنسکایا میں، جہاں موصوف رہتے ہیں، ڈاک کے تھیلے بھر بھر آتے ہیں۔ لوگ ان سے مشورہ طلب کرتے ہیں یا خاص ذاتی معاملات سے لیکر ریاستی اہمیت کے مسئلوں تک پر صلاح لیتے ہیں۔ بہت سے اپنے دلی جذبات ان کے گوشگزار کرنا چاہتے ہیں اور اپنے متعلق انہیں اس طرح بتاتے ہیں جیسے کوئی اپنے دانشمند، بزرگ دوست کو بتاتا ہے۔ نوجوان انہیں خط لکھتے ہیں اور نئے نئے ادیب بھی۔

شولوخوف کے بیشتر خطوط خالص کاروباری وضع کے ہوتے ہیں۔ ڈاک سے ان کے ابتدائی افسانوں کے مجموعے کے پروف آتے ہیں، کوئی فلم اسٹوڈیو ان سے کسی نئی فلم کی، جو ان کے کسی افسانے پر مبنی ہوئی ہے، ویشنسکایا میں نمائش کی تاریخ مقرر کرانا چاہتا ہے، کوئی تھیٹر ان کے ناول کو ڈرامے کا روپ دیکر اسٹیج پر پیش کرنے کے سلسلے میں مشورہ طلب کرتا ہے۔

غیر ممالک کے ناشرین اور تنظیموں کے خطوط اور تار آتے ہیں جن میں ان سے دریافت کیا جاتا ہے کہ وہ غیرممالک کے سفر پر تو روانہ نہیں ہونےوالے جو تہذیبی تبادلے میں اور قوموں کے درمیان باہمی مفاہمت کو بہتر کرنے میں نہایت ہی نتیجہ خیز ثابت ہوتے ہیں۔

بین الاقوامی منظر

ٹوکیو ہم بہت دور پیچھے چھوڑ آئے تھے، اور تڑختی ہوئی دھوپ میں بذریعہ کار ہم نکو کے کوہستانی علاقے کی طرف چلے جا رہے تھے۔ ابھی کئی میل اور جانا تھا اور پیاس بری طرح لگی تھی۔

ایک چھوٹے سے قصبے کے بڑے بازار کے چوک سے گذرے تو دیکھا تحفے تحائف کے سامان کی چھوٹی چھوٹی دکانوں کی ایک قطار چلی گئی ہے۔ وہیں سگریٹ بھی مل رہے تھے اور ٹھنڈا شربت بھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ چند منٹ یہاں قیام کیا جائے۔

ان چھوٹی چھوٹی دکانوں میں مقامی جاپانی دستکاروں کی بنائی ہوئی چیزیں فروخت ہو رہی تھیں۔ ابھی ہم ایک دکان پر کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ اس گمنام شہر کی یادگار کےلئے جہاں ہمیں محض اتفاقاً رکنا پڑا تھا، کونسی چیز خریدی جائے نوجوان دکان کرمچاری لڑکی نے ترجمان سے پوچھا کہ ہم لوگ کس ملک سے آئے ہیں۔ جب پتہ چلا کہ ہم سوویت یونین سے آئے ہیں تو اس نے پھر پوچھا کہ کیا مصنف شولوخوف بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ اخباروں میں خبر آئی تھی کہ وہ جاپان کے سیر و سفر پر گئے ہوئے ہیں۔ شولوخوف کہاں ہیں، ان سے ملاقات کیسے ہو سکتی ہے؟ جب ترجمان نے بتایا کہ یہ رہے شولوخوف تو ساری دکانوں میں جیسے ایک بھونچال آ گیا۔ تھوڑی دیر کےلئے لڑکیاں کہیں غائب ہو گئیں لیکن ذرا کی ذرا میں پھر آ گئیں، ہاتھوں میں شولوخوف کی تخلیقات کی خوبصورت جلدیں اور آٹوگراف کی نوٹ بکیں تھیں۔ شولوخوف لینے تو آئے تھے سگریٹ لیکن اب دوست مگر پرعزم مداحوں کے نرغے میں تھے جن سے فرصت اس وقت ہی حاصل ہوئی جب آٹوگراف دینے کی ایک مختصر نشست ختم ہو گئی۔

یہاں زور دیکر یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ اس چھوٹے سے قصبے میں ہمارے قیام کا پہلے سے کوئی بندوبست نہیں تھا، ہمیں سخت گرمی کی وجہ سے پیاس لگی اور اس لئے وہاں رک گئے۔ اس کا پہلے سے کسی کو بھی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا، نہ ہی ہمارے لئے کسی کے لئے کوئی تیاری کرنا ممکن تھا۔ نوجوان جاپانی قارئین سے یہ ملاقات بغیر کسی تیاری کے قطعی اتفاقی ہوئی تھی۔

خود نکو میں ہمیں صبر و استقلال کے ایک چھوٹے سے کارنامے سے سابقہ پڑا۔ شولوخوف کی ایک مداح طالبہ نے اخبارات میں پڑھا کہ وہ جاپانی ادیبوں کی انجمن کی دعوت پر جاپان آ رہے ہیں۔ جس راستے سے وہ گزرنےوالے تھے وہ اندازاً واضح کر دیا گیا تھا اور نکو اس میں شامل تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نکو کا قدیم مندر ایک ایسی جگہ ہے جسے غیرملکی سیاح ضرور دیکھنے جاتے ہیں، اس لئے اس نے فیصلہ کیا

کہ شولوخوف کے آٹوگراف حاصل کرنے کے لئے مندر کے دروازے پر انتظار کیا جائے۔ پانچ گھنٹے انتظار کرنے کے بعد آخر وہ ناامید سی ہونے لگی۔ پھر بھی وہ وہیں جمی رہی۔ صبر کا پھل ملا۔ اور پھر اسے کچھ گھبراہٹ سی ہوئی کہ اخباروں کے رپورٹر اس سے بھی انٹرویو لے رہے تھے اور شولوخوف کے ساتھ اس کی تصویریں کھینچی جا رہی تھیں۔ یہ تصویریں بہت سے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئیں اور ان میں سے ایک میں وہ شولوخوف کے آٹوگراف حاصل کر رہی ہے جس کے لئے اس نے اتنا انتظار کیا تھا۔

اس موقع پر دوسرے اور بہت سے موقعوں کی طرح ان ترجمانوں کے بغیر جو ہمارے ساتھ تھے، کام نہیں چل سکتا تھا۔ نوجوان لیکن شولوخوف کی تصانیف کے ترجموں کے باعث مشہور و معروف یہ لوگ سیاحوں کے معمولی گائڈ نہیں تھے۔ ان میں سے توکویا ہارا اور تاکو ایگاوا اپنے والد کے نقش قدم پر چل رہے ہیں جنہوں نے جاپان میں ''اور ڈان بہتا رہا...'' کا پہلا ترجمہ کیا تھا۔ بر سبیل تذکرہ یہ بھی بتاتا چلوں کہ ایگاوا کے والد تیتسویا بابا نے ''اور ڈان بہتا رہا...'' کا غیرملکی زبان میں سب سے پہلا ترجمہ کیا تھا۔ کتابی شکل میں ناول شائع ہونے سے پہلے رسالے میں اس کے جو باب شائع ہوئے ان کا وہ ترجمہ کرتے گئے۔

* * *

۱۹۶۵ء کا موسم سرما۔ سردی سخت نہیں ہے۔ اس خلیج سے جس کے ساحل پر شاہی محل بنا ہوا ہے راج ہنس جنوب کی طرف ہجرت نہیں کرتے، ان کی غذا کا انتظام یہیں ہو جاتا ہے اور یہ ہر جہاز کا خیرمقدم کرنے اور خیر باد کہنے موجود ہوتے ہیں۔

اس بار انہوں نے جس جہاز کا خیرمقدم کیا وہ ''سویا یارل'' تھا جو فنستانی شہر تورکو سے ادب کا نوبل انعام پانےوالے میخائل شولوخوف کو اسٹاک ہام لیکر آیا تھا۔

دسمبر کا وہ ہفتہ اب تاثر اور یادوں کی ایک سیریز ہے۔ کنسرٹ ہال اور ٹاؤن ہال میں منعقد ہونےوالی روائتی تقریبوں کی، رسمی استقبالیوں اور اس سے بےتکلف اجتماعات کی، پرشور پریس کانفرنسوں اور دوستانہ پرتپاک بات چیت کی۔

ایک پریس کانفرنس شولوخوف کی آمدوالے روز منعقد ہوئی تھی اور اس کے بارے میں اخبار ''اسٹاک ہام ٹیڈنینگین،، نے لکھا تھا:
''اسٹاک ہام میں اپنے قیام کے پہلے ہی دن شولوخوف نے سابقہ تمام ریکارڈ توڑ دئیے — گرانڈ ہوٹل کے ہال میں پہلے اتنے صحافی کبھی جمع نہیں ہوئے تھے۔،،

لیڈین اشاعت گھر کے استقبالئے میں، جس نے شولوخوف کی تحریریں سویڈن کے قارئین تک پہنچانے میں بہت کام کیا ہے، اشاعت گھر کے عمومی ڈائریکٹر بینگت کریسٹیل نے مصنف کا مندرجۂ ذیل الفاظ میں خیرمقدم کیا:

''آپ کے ناشرین کی حیثیت سے ہم آپ کی خوشیوں میں شریک ہیں، مگر محض اس لئے نہیں کہ ہم آپ کی کتابیں فروخت کرتے ہیں... ہم اس لئے خوش ہیں کہ آج ایک عظیم، حق گو حقیقت پسند فن کی قدرشناسی ہوئی ہے۔،،

شولوخوف کو نوبل انعام ''اس فنکارانہ زوربیان اور حق گوئی کے صلے میں دیا گیا ہے، جس سے انہوں نے اپنے ڈان کے رزمیئے میں روسی عوام کی زندگی کے ایک تواریخی دور کو بیان کیا ہے۔،،

انعام پیش کرنے کی تقریب میں سویڈن کی اکادمی کی نوبل کمیٹی کے صدر ڈاکٹر اینڈرس ایسٹرلنگ نے اپنی تقریر میں ''اور ڈان بہتا رہا...،، میں کاسکوں کی زندگی کے متعلق پراثر حقیقت‌نگاری کا ذکر کیا۔ ہر اعتبار سے یہ ایک پرزور تخلیق ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ انعام ملنے میں ''تاخیر ہوئی، مگر خوش‌قسمتی سے ادب کےلئے نوبل انعام یافتگان کی فہرست عصرجدید کے ممتازترین ادیبوں میں سے ایک کے نام سے مالامال کرنے میں حد سے زیادہ تاخیر نہیں ہوئی۔،، شولوخوف کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:
''یہ انعام منصفانہ اور ممنون احسان خراج‌عقیدت ہے اس حصہ کا جو آپ نے سوویت ادب کو ادا کیا ہے، وہ حصہ جسکا ہمارے ملک میں اور اس طرح ساری دنیا میں سب کو بخوبی علم ہے۔،،

ٹاؤن ہال کی ایک ضیافت کی زیادہ بے تکلف فضا میں سویڈن کی اکادمی میں مستقل سیکریٹری برائے ادب ڈاکٹر ک۔ ر۔ گیروف نے فصیح و بلیغ تقریر کی۔ ان کی تقریر کا وہ حصہ جس میں انہوں نے شولوخوف کو مخاطب کیا تھا اتفاقاً ایک ایسے استعارے پر مبنی تھا جس کا خیال ایک اخبار کی اطلاع کے غلط ترجمے پر مبنی تھا۔ لیکن ڈاکٹر

گیروف نے اپنے زور بیان میں اس غلطی سے بڑی چابکدستی سے استفادہ کیا تھا۔

ڈاکٹر گیرف نے اس طرح آغاز کیا: ''جناب شولوخوف، جس روز آپ کو نوبل انعام ملا تو اس روز آپ یورال میں شکار کھیل رہے تھے اور، ماسکو کے ایک اخبار کی اطلاع کے مطابق، اسی روز آپ نے ایک (۱) گولی سے دو مرغابیاں شکار کی تھیں... لیکن اگر آج ہم سال گذشتہ کے نوبل انعام‌یافتگان میں اچھے نشانہ باز کی حیثیت سے آپ کے سامنے سرتسلیم خم کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نشانےبازی کے ایسے کارناموں کا پرتو آپ کی تخلیق میں نظر آتا ہے۔

''جیسی رزمیہ تخلیق آپ کی ہے وہ ہمہ‌گیری اور وسعت نظری، واقعات اور لچھے دار اندازبیان کے طوفان‌خیز مگر پرشکوہ سیل رواں، موضوع کے مسائل حل کرلینے پر پراعتماد قابو کے ساتھ ہی ضبط تحریر میں آ سکتی تھی — اور یہ تمام خوبیاں ہی اس کو ایک ناقابل فراموش شہ پارہ بنا دینے کو کافی تھیں۔ ڈرامائی کیفیت کے زندہ و تابندہ احساس، فنی اہمیت کی ہر تفصیل کے گہرے مشاہدے اور انسان کے مقدر سے پرجوش ہمدردی کی روح اس میں پھونک دینا ممکن ہوتا — اور اس طرح یہ تخلیق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محبوب بن گئی ہوتی۔ ان دونوں امکانات کو یکجا کرنا فہم و ذکا کی، آپ کے علم و دانش کی علامت ہے۔ یہ اتفاق اسی قدر شاز و نادر ہوتا ہے جس قدر ایک تیر کےلئے دو پرندوں کو ایک قطار میں لانا۔ آپ نے دونوں چڑیاں ایک ہی تیر سے شکار کر لیں۔

''اپنے مسمار ہوتے ہوئے محل کی جان توڑ حفاظت کرتے ہوئے پرانے نظام حکومت اور خون میں ڈوبی ہوئی زمین کے ایک ایک چپے کے لئے اسی طرح جان‌بازی سے جدوجہد کرتے ہوئے نئے نظام کے متعلق آپ کی داستان کے تصور میں انتہائی وسعت و گہرائی ہے۔ ذہن میں بار بار سوال اٹھتا ہے: دنیا پر کس کی حکمرانی ہے؟ اور جواب دیتا ہے: دل کی۔ اپنی محبت اور بےرحمی، افسردگی، امیدوں، ذلت اور فخر کے ساتھ انسان کے دل کی۔ انسان کا دل، وہ حقیقی میدان کارزار جہاں وہ تمام فتوحات، ساری شکستیں ہوتی ہیں جو ہماری دنیا کو مقسوم ہوتی ہیں۔ اس طرح آپ کا فن تمام سرحدوں کو پار کر لیتا ہے اور ہم ممنونیت کے ساتھ تہ‌دل سے اس کو قبول کرتے ہیں...،،

...ان تمام ہنگاموں میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود مصنف نے نوجوانوں سے ۔ اسٹاک ہام کے اور قدیم شہر اپسالا کے دارالعلوم کے نوجوانوں سے ملاقات کرنے کا وقت نکال لیا۔ سلافی علمی ادارے اور اپسالا یونیورسٹی میں ۸۰۰ سے زیادہ طلباء شولوخوف سے ملنے آئے۔ ممتاز سوویت ادیب کی تخلیقات سے طلباء اور اساتذہ دونوں نے یکساں، بےپناہ دلچسپی کا اظہار کیا اور ان سے بہت سارے سوالات پوچھے اور انہیں زندہ‌دل، بے تکلف جوابات ملے۔ دوستی، اعتماد اور باہمی احترام کی فضا فوراً ہی قائم ہو گئی جس میں شولوخوف کی اپنی مخصوص شگفتگی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا، وہ شگفتگی جو گفتگو میں ایک حرارت پیدا کر دیتی ہے اور جن سے وہ ہم کلام ہوتے ہیں ان کی ہمدردیاں فوراً ہی حاصل کر لیتے ہیں۔

اس وقت مجھے یورپ کی ایک اور قدیم یونیورسٹی کی جلسہ گاہ یاد آ رہی ہے۔ وہاں طلباء شولوخوف کی تصانیف میں فلسفے کے مسائل کا حل تلاش کرنے جمع ہوئے تھے۔ یہ مشورہ حاصل کرنے کہ انسان کو اپنی زندگی کیسے بسر کرنی چاہئے۔ مصنف وہاں صرف روحانی اعتبار سے ہی موجود تھے، لیکن نوجوان گویا ان سے ہمکلام تھے، ان پرجوش بحثوں میں ان سے تائید حاصل کر رہے تھے جو زندگی کے مختلف اور اہم مسئلوں پر تبادلۂ خیالات کے دوران چھڑ جاتی تھیں۔

...جینا کے سلافی علمی ادارے میں نوجوانوں کا اجتماع تھا۔ جرمن جمہوری ری‌پبلک کی سب سے بڑی یونیورسٹیوں سے یہ لوگ ایک کانفرنس میں شرکت کرنے آئے تھے جس میں اس تحقیق کی تعمیم کرنی تھی جو پوری ری‌پبلک کے اعلی تعلیمی اداروں میں انجام دی گئی تھی۔ اس کانفرنس کا موضوع تھا: میخائل شولوخوف کی تخلیقات میں سوشلسٹ انسان دوستی۔

جلسہ گاہ کھچاکھچ بھری ہوئی تھی۔ صدارت کے فرائض ایک طالبہ انجام دے رہی تھی۔ تین طلباء نے بحث کے لئے دعوے اجتماعی طور پر مرتب کئے تھے، جو کانفرنس کے تمام شرکاء میں تقسیم کر دئے گئے تھے۔ ان پر اور تینوں مصنفوں کے سوالات پر بحث ہو رہی تھی۔ مراتب کے اعتبار سے تمام درجوں کے اور جرمن جمہوری ری‌پبلک کے تمام علاقوں سے آئے ہوئے طلباء نے تقریریں کیں، بعض نے کئی کئی بار۔ جیسے جیسے بحث بڑھی، ویسے ہی ویسے موضوعاتی مسئلے مباحثے میں داخل ہوتے گئے۔

ایک بار تو ایسا ہوا کہ دو مقررین بیک‌وقت اسٹیج پر آئے۔ یہ دونوں لڑکیاں جس گروپ میں شامل تھیں اس میں اختلاف رائے تھا۔ اس لئے دو مختلف رایوں کی مدافعت کرنے کےلئے دو مختلف نمائندے چنے گئے تھے۔

بعض طلباء کو ابھی فنی اور جمالیاتی مسائل پر پورا عبور نہیں تھا، نہ ہی ان کو شولوخوف کی حقیقت نگاری کی اصلیت سے پوری واقفیت حاصل تھی۔ اس لئے ان کے فنکارانہ کمال کا تجزیہ ابھی ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لئے بعض مسئلے، مثلاً وہ ٹھوس تاریخی حالات جن میں شولوخوف کے کردار سرگرم عمل ہوئے، ثانوی حیثیت اختیار کر گئے اور عصرحاضرہ کے اخلاقی اور جمالیاتی مطالبات کے نقطۂ نظر سے ان کے اعمال و افکار کے انداز پر تبادلۂ خیالات نے اولیت حاصل کرلی۔

لیکن بحث کی خاص قدروقیمت عین اس حقیقت ہی میں مضمر تھی۔ شولوخوف کے تخلیق کردہ پیکروں اور جرمنی کے جدید مقبول‌ترین ادیبوں کے تخلیق کردہ کرداروں کے درمیان مماثلت تلاش کی گئی۔ بحث اس بات پر چھڑ گئی کہ اپنے پڑوسی کی جانب ایک کمیونسٹ کی کیا ذمہ‌داری ہوتی ہے (اس کا آغاز ناول ”اور ڈان بہتا رہا...“ میں گریگوری میلیخوف اور میخائل کوشیووئی کے باہمی تعلقات سے ہوا تھا)۔ اس پر کہ اگر مقصد انسان دوستی ہو تو کیا تمام ذرائع انسان دوستانہ تصور کئے جا سکتے ہیں، اس پر کہ کیا سوشلزم کے تحت المئے کا مسئلہ موجود رہتا ہے، اس پر کہ کسی کردار کو مثبت کیا چیز بناتی ہے — اس کے ارادے اور اعمال یا صرف اس کے اعمال (یہاں بحث ناگولنوف کی شخصیت پر ہو رہی تھی)۔ اور متعدد دوسرے مسئلوں پر بھی بحث ہوئی۔

ظاہر ہے کہ یہ نوجوان وہ دوبارہ دریافت کر رہے تھے جو پہلے ہی دریافت کیا جا چکا ہے، وہ تلاش کر رہے تھے جو تلاش کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس میں کیا مضائقہ ہے۔ اہم بات یہ تھی کہ ان میں سے ہر ایک اپنے طور پر حقیقت دریافت کرنا چاہتا تھا، زندگی کے مسئلے حل کرنا چاہتا تھا، اپنے لئے اور اپنے ہمعصروں کے لئے انہیں حل کرنا چاہتا تھا۔

شولوخوف کی تخلیقات کے مطالعے سے ان میں آفاقی نقطۂ نظر مرتب کرنے سے متعلق جاندار مسئلوں پر بحث کرنے کی خواہش پیدا

ہوئی۔ ان کی تخلیقات نے انہیں اس بات پر غور کرنے کے لئے اکسایا کہ زندگی میں وہ کونسا مقام حاصل کریں اور ایک شہری کی حیثیت سے ان کے کیا فرائض ہیں اور یہ کہ کمیونسٹ مستقبل اور نئی دنیا کے لئے جد و جہد کرنے والے عوام کے اخلاقی اور اخلاقیاتی معیاروں کا اعادہ کرنے کی ضرورت ہے۔

لائپزیگ کی کارل مارکس یونیورسٹی نے شولوخوف کو فلسفے کی اعزازی ڈاکٹریٹ عطا کی تھی۔ انہیں اسکی سند پیش کرنے جرمن عالموں کا ایک وفد ویشنسکایا آیا تھا۔ اس نے اس موقع پر جو سپاسنامہ پیش کیا تھا اس کا اختتام مندرجۂ ذیل اہم الفاظ پر کیا گیا تھا:

''شولوخوف کی تخلیقات ہمارے عوام اور ہمارے نوجوانوں کے لئے، جن میں طلبا بھی شامل ہیں، ایک لازوال سرچشمہ بن گئی ہیں جس سے وہ ایک معتبر انقلابی جذبے، پارٹی کی پرعزم تائید، بے داغ دیانت، دلی ہمدردی اور اپنی زندگی کے نصب العین کے لئے اپنے آپ کو کامل طریقے سے وقف کر دینے کا سبق حاصل کرتے ہیں۔''

دل کے کہنے پر

''آج شام میں آپ کے پاس نوجوان ادیبوں کے کام کے نگراں کی حیثیت سے فرض کی پکار پر ہی نہیں بلکہ دل کے کہنے پر بھی آیا ہوں۔''

ان الفاظ کے ساتھ ۲ جولائی ۱۹۶۹ء کو روستوف برساحل ڈان میں پارٹی تعلیم کے ایوان میں شولوخوف نے اپنی تقریر شروع کی تھی۔ وہ نوجوان فنکاروں کے بلغاریائی سوویت کلب کے میمبروں کو ان کے ایک باقائدہ جلسے کو خطاب کر رہے تھے۔ اس اجتماع کا عام موضوع تھا: ''تاریخ اور عوام کے روبرو فنکاروں کی ذمہ داری''۔ ان کے سامعین میں نوجوان بلغاریائی اور سوویت ادیب، صحافی، اداکار، ہدایت کار، مصور، بت تراش، مورخ، ماہرین فن عمارت، موسیقار اور کلب کے وہ مہمان بھی شامل تھے جو ہنگری، پولینڈ، رومانیہ اور چیکوسلوواکیہ سے آئے تھے۔

شولوخوف نے کہا تھا کہ اپنے نوجوان ساتھیوں سے ملکر انہیں اس لئے مسرت ہوتی ہے کہ اس سے ان کو نوجوانوں سے تعلق میں آنے کا موقع ملتا ہے، یہ معلوم کرنے کی کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں اور سماج

کے روبرو ادیب کی ذمہ داری پر غور کرنے میں ان کے ساتھ شامل ہونے کی سبیل ہاتھ آتی ہے۔ نظریاتی تصادموں کی دنیا میں سماجی زندگی میں فنکار جو حصہ ادا کرتا ہے اور فنکار کا جو نصب العین اور فرض ہوتا ہے، انہوں نے ان کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ دنیائے ادب میں رونما ہونے والے بعض واقعات کی وجہ سے مجھے تشویش ہے جبکہ کچھ اور ایسے ہیں جو ایک ایسے ادب کے مستقبل پر اعتماد پیدا کرتے ہیں جو عوام کی خدمت انجام دے گا، محبان وطن اور بین الاقوامیت پسندوں کی پرورش کریگا اور کمیونزم کی تعمیر میں مدد دیگا۔ ہر ایسی چیز کی جانب ادب میں اعتدال پسندانہ رویے کی انہوں نے مذمت کی جس سے نوجوانوں پر مخرب الاخلاق اثر پڑنے کا احتمال ہو اور انہوں نے ان تازہ، صحت مند اور جوان سال آوازوں کا ذکر کیا جو نثرنگاری اور شعرگوئی میں سنائی دینے لگی ہیں۔ انہوں نے حاضرین کو گورکی کا وہ سوال یاد دلایا جس کا اب بھی فوری اطلاق ہوتا ہے: ''تہذیب کے معمارو، تم کس کی طرف ہو؟'' نوعیت کے اعتبار سے غیرمصالحانہ ہونے کے باوجود ہمدردانہ مشورہ اور اجتماعی تبادلۂ خیالات فن کار کے لئے کارآمد ہوتے ہیں۔ ادیب کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے اور اپنے فن کے معاملے میں انتہائی سخت گیر ہو۔ شولوخوف نے یہ کہا اور اس کی وضاحت اپنی کئی مثالوں سے کی جو ''اور ڈان بہتا رہا...''، ''جب زمین جاگی''، اور ''وطن کے مجاہد'' کی تصنیف کے دوران ان کے خود اپنے تجربے میں آئی تھیں۔ انہوں نے زور دیکر باربار کہا کہ نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے ان کا مقصد وعظ دینا نہیں بلکہ وہ مسائل دریافت کرنا ہے جو ان کے دماغ پر بوجھ بنے ہوئے ہیں، اور وہ خود جو نتائج اخذ کر چکے ہیں ان میں ان کو شریک کرنا ہے۔

اسی جلسے میں مشہور و معروف بلغاریائی شاعر لیوبومیر لیوچیف کی تقریر بھی یادگار ہے:

''اس اجتماع کا اہم ترین پہلو بہ نفس نفیس آپ سے ملاقات ہے۔ یہ گویا اس کا تاج ہے۔ آپ کی تصانیف نے کمیونسٹوں کی پیڑھیوں کو، کومسومولیوں کی پیڑھیوں کو، مجاہدوں کی پیڑھیوں کو تربیت دی۔ مشہور بلغاریائی ادیبوں نے اپنا فن آپ سے سیکھا۔ ان میں سے کچھ ہماری آزادی کی جدو جہد میں شہید ہوئے، اوروں نے اپنی ساری زندگی ملک میں سوشلزم کی تعمیر پر وقف کر دی، اور بھی ہیں جو اپنے

کام میں مصروف ہیں اور آپ سے سیکھ رہے ہیں۔ "ہزار کرشماتی چشمے" کی ایک بلغاریائی لوک کہانی ہے جو نابیناؤں کو بینائی، اور نوجوانوں کو توانائی بخشتا ہے تاکہ جیت جائے۔ آپ سے ملاقات، گویا انہیں میں سے ایک چشمے پر پہنچنا تھا جن سے اپنے آئندہ کے کام کے لئے توانائی حاصل کر سکیں۔ ظاہر ہے بڑے بڑے کام ہیں جو ہمیں ابھی کرنے باقی ہیں جن کے لئے شولوخوف کی وجدانی سچائی، شولوخوف کا جوہر درکار ہوگا، خواہ وہ نہایت خفیف مقدار ہی میں ہم میں ہو۔"

جون ۱۹۶۷ء میں سوویت یونین اور دوسرے سوشلسٹ ملکوں سے آئے ہوئے نوجوان ادیبوں سے ویشنسکایا میں شولوخوف کی بات چیت ایسے ہی ماحول میں ہوئی۔ اپنے نوجوان ساتھیوں کے ساتھ جدید ادب اور سماج کی زندگی سے اس کے اٹوٹ رشتوں کے متعلق، عہد حاضرہ میں ادبی نشوونما سے متعلق خاص مسائل اور فنکار کی اخلاقیاتی تشکیل و ترکیب اور عوام کی جانب اس کے فرض کے بارے میں غور و فکر کرتے ہوئے شولوخوف نے کہا کہ نوجوان ادیب ہمارے ادب کا مستقبل ہیں، نوجوان اور بزرگ ادیبوں کے درمیان تخلیقی رشتوں کو تقویت دینا بہت ہی اہم ہے۔ انہوں نے سوویت ادیبوں کی ابھرتی ہوئی نسل کو دعوت دی کہ وہ سوویت ادب کی بہترین روایات کی بلا انحراف تقلید کریں اور بورژوا نظریے کے مظاہر کی جانب غیرمصالحانہ رویہ اختیار کریں۔ انہوں نے سماج کے روبرو فنکار کی دن بدن بڑھتی ہوئی ذمہ داری کا اور پارٹی اور عوام کے مفادات سے سوویت ادیب کی پرجوش عقیدت کا ذکر کیا۔

مختلف تخلیقی مسائل پر غیررسمی تبادلۂ خیالات کے دوران گفتگو کا رخ غلطیاں کرنے کے ادیب کے حق کی جانب ہو گیا۔ اس مسئلے پر شولوخوف نے خاص توجہ دی:

"میرا خیال ہے کہ کسی بھی ادیب کو بلالحاظ اس بات کے کہ وہ کتنا ممتاز اور بزرگ ہے، خصوصی رتبے کا دعویدار نہیں ہونا چاہئے۔ رہی بات "غلطیاں کرنے کی آزادی" تو اگر اجتماعی فارم کے جتھے کا کوئی لیڈر غلطی کرتا ہے تو فارم کا صدر اس غلطی کو ہمیشہ درست کر دیگا۔ یہ غلطی معاشی نوعیت کی ہوتی ہے اور دوسروں کو اس سے نقصان نہیں پہنچیگا۔ ادیب مطبوعہ تصنیف میں غلطی کر کے ہزاروں قارئین کو غلطی کی جانب لے جاتا

ہے۔ ہمارے پیشے میں اس بات کا خطرہ ہوتا ہے۔ روحانی آزادی اور تخلیقی آزادی سب خوب ہیں، بجا ہیں مگر خدا کے لئے غلطیوں کے بارے میں زیادہ محتاط رہیئے۔ ہم میں سے ہر ایک کو پڑھا جاتا ہے، ہم میں سے ہر ایک کے اگر، جیسا کہ یہاں کسی نے کہا تھا، 'عالمی قارئین' سب کے نہیں تو ہزاروں نہایت محتاط اور سخت تقاضے کرنے والے قارئین ضرور ہیں۔ بےچین، بےقرار روحیں صرف ادیبوں تک ہی محدود نہیں ہوتیں اور غلطی — اس صورت میں اور بھی جبکہ وہ اہم ہو، کربناک غور و فکر سے سرزد ہونے والی غلطی اور اس طرح کسی خاص فرد کے لئے ایک حد تک حق بجانب غلطی بھی — ہزاروں مقدروں میں ہزاروں غلطیوں کا، دوسرے ہزارہا لوگوں کے زاویۂ نگاہ میں غلطیوں کا باعث ہوتی ہے۔ اگر ہم غلطیاں کرنے کے اخلاقی حق کی ہی بات کر رہے ہیں تو شاید سرجن کو بھی، کوئی آپریشن کرتے وقت غلطی کا حق حاصل ہو سکتا ہے: صرف ایک شخص کو تکلیف اٹھانی پڑےگی۔ لیکن جب ہم کسی خاص چیز سے آپریشن کرتے ہیں اور غلطی کر جاتے ہیں، اور اس کا چلن عام ہو جاتا ہے تو ایسی غلطی، میں پھر کہتا ہوں، ہزار گنی زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے۔ ہمیں دوچند احتیاط برتنی چاہیئے اور بعض اوقات ہمیں اپنی بےقرار روح کو کچل دینا چاہیئے تاکہ اوروں کو ضرر نہ پہنچے۔"

مارچ ۱۹۶۹ء کے آخر میں نوجوان ادیبوں کی پانچویں کل یونینی کانفرنس نے جو ماسکو میں منعقد ہوئی تھی، اپنا کام ختم کر لیا۔ شولوخوف نے جو غیرممالک کے ایک دورے سے واپسی پر راجدھانی سے گذر رہے تھے، کانفرنس کے کچھ شرکا کو ملاقات کے لئے بلایا۔ انہوں نے کانفرنس کے کام کے بارے میں، اس کے مختلف اجلاسوں اور سیمیناروں کے بارے میں تبادلۂ خیالات کیا اور اس کے بارے میں اپنے تاثرات انہیں بتائے۔ شولوخوف نے اس کانفرنس کی یادگار کتاب میں لکھا: "اس کانفرنس کی کامیابی پر مجھے مسرت ہے! ہمیشہ کی طرح میں نوجوانوں کی کامرانی، پامردی اور کامیابی کا متمنی ہوں۔"

اس ملاقات کے دوران گفتگو کا رخ زندگی کے بہت سے مسئلوں کی جانب اور ان تخلیقی راہوں کی جانب ہو گیا جن کی طرف نوجوان ادیب اور شاعر بڑھ رہے ہیں۔ شولوخوف نے انہیں خبردار کیا کہ

زندگی میں بہت پہلے وہ مکمل طور پر ادبی کام کے لئے اپنے آپ کو وقف نہ کریں اور انہیں ایک بار پھر یاد دلایا کہ کوئی بھی سچا فنکار زندگی سے اپنے آپ کو الگ تھلگ نہیں کر سکتا۔ ادیب کے فن کے ہر جزو پر عبور حاصل کرنے اور نظم و نثر کے ہر لفظ کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لئے مستقل مزاجی سے جدوجہد کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔

شولوخوف اور نوجوان ادیبوں کے درمیان باتیں ادب کے فوری مسئلے حل کرنے کے بارے میں ہوا کرتی ہیں۔ عوام کی زندگی میں فنکار کے مقام اور حال اور مستقبل کے روبرو اس کے فرض پر ہمیشہ ہی تبادلۂ خیالات ہوا کرتا ہے۔ لیکن جب، مثلاً، ملاقات کارخانوں کے نوجوان مزدوروں یا نوجوان کاشتکاروں سے، خلابازوں، فوجیوں، ملاحوں، طالب علموں سے ہوتی ہے یا جب اسکول کے بچوں سے خط و کتابت ہوتی ہے تو جو سوالات اٹھائے جاتے ہیں اور انسانی سرگرمیوں کے جو حلقے زیر بحث آتے ہیں وہ قطعی مختلف ہوتے ہیں۔

مگر یہ ساری ملاقاتیں جو چاہے بالمشافہ ہوں یا تحریروں کے ذریعے، اس عظیم ادیب اور شہری کے ''دل کے کہنے پر'' ہوتی ہیں جس کے خیالوں میں نئی پود کا مقدر، مستقبل اور حال جس میں اس کی قوم کا مستقبل ڈھالا جا رہا ہے، ہمیشہ بسا رہتا ہے۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''اور ڈان بہتا رہا...'' اور ''جب زمین جاگی'' کے مصنف کی تخلیقی زندگی کے نمایاں خدوخال پیش کر دئے جائیں۔ شولوخوف نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مختصر خاکوں سے کیا۔ پھر افسانوں کا سلسلہ شروع ہوا جنہیں ان کے عظیم ناولوں کا حرف اول تصور کیا جا سکتا ہے اور جو سب سے پہلے سوویت نوجوانوں کے جریدوں میں شائع ہوئے۔ درحقیقت شولوخوف نے اپنی تحریر و تصنیف کی زندگی ماسکو کے اخبار ''یونوشسکایا پراودا'' (جس کا نام بعد میں ''مولودئی لینینیتس'' ہو گیا)، ''ژورنال کرستیانسکوئی مولوڈیوژی'' اور رسالہ ''کومسومولیا'' کے لئے کام کرنے سے شروع کی تھی۔ وہ ایک ادبی اور فنی مجموعے کے لئے بھی اپنی تخلیقات بھیجا کرتے تھے جو کچھ ادیب جو ''مولودایا گواردیا'' (نوجوان سنتری) کہلاتے تھے، وقتاً فوقتاً شائع کرتے تھے۔ ان کی تخلیقات ''کومسومولسکایا پراودا'' اور رسالہ ''سمینا'' میں بھی شائع ہوتی تھیں۔

نوجوانوں کی مطبوعات اور ناشروں سے شولوخوف کے جو قریبی تعلقات تھے ان کو انھوں نے ہمیشہ وفاداری کے ساتھ نبھایا۔ ۱۹۶۲ء میں ''مولودایا گواردیا'' اشاعت گھر نے اپنی چالیسویں سالگرہ منائی اور مبارکباد کے پیغامات میں شولوخوف کا بھی تار آیا تھا: ''مجھے نہایت افسوس ہے کہ کام کی زیادتی کے باعث اس شاندار جشن میں شرکت نہیں کر سکتا۔ نوجوانوں کی پرداخت کا بے انتہا اہم فرض آپ پر عائد ہوتا ہے اور اس کام کے لئے ہم، پرانی پیڑھی کے قارئین اور ادیب آپ کو دل سے عزیز رکھتے ہیں، آپ کی بڑی قدر کرتے ہیں اور تہ‌دل سے آپ کا احترام کرتے ہیں۔ برائے مہربانی، میری جانب سے بھی ذاتی طور پر فرداً فرداً ہر ایک کی زندگی میں مسرت اور کامیابی کی بہترین خواہشات قبول فرمائیں۔ آپ کا بادل نا خواستہ مائل بہ پیری نوجوان سنتری، میخائل شولوخوف۔'' اشاعت گھر کے مہمانوں کی رایوں کی کتاب میں اگلے سال کے اندراج میں ''مولودایا گواردیا'' کی روایات کے تسلسل اور پرانی اور نئی پودوں کے درمیان اٹوٹ رشتوں پر شفقت کے ساتھ زور دیا گیا ہے: ''مولودایا گواردیا'' کے نوجوان مصنفین کی صحبت میں مجھے ہمیشہ مسرت حاصل ہوتی ہے! میں خود کو جوان محسوس کرنے لگتا ہوں...''

ان متنوع اور متعدد ملاقاتوں کی اصل خصوصیت قارئین کو نہ صرف اپنی کتابوں اور ان کرداروں کے ذریعے جن میں وہ زندگی کی روح پھونک دیتے ہیں، مخاطب کرنا بلکہ براہ‌راست بھی، تبادلۂ خیالات اور بالمشافہ ملاقات کے لئے شولوخوف کی مستعدی ہے۔

شولوخوف سے ملاقات کے ان جلسوں میں ہر وضع کے لوگ: نوجوان ادیب، مزدور، کاشتکار، فوجی اور ہمارے شہرۂ آفاق سوویت خلاباز بھی شامل ہوتے ہیں۔ آنجہانی یوری گگارین اور بورس وولی‌نوف ویشنسکایا میں شولوخوف کے ہاں مہمان آچکے ہیں۔

''لئے دئے رہنے'' سے، عالمانہ یا ناصحانہ لہجہ اختیار کرنے سے شولوخوف کو سخت چڑ ہے اور ذاتی طور پر ان سے جو سوالات کئے جائیں ان کے جواب دینا عموماً پسند کرتے ہیں۔ اپنے اور حاضرین کے درمیان گرما گرم بحث چھیڑ دینا انہیں پسند ہے۔ رسمی طور پر مسلسل اظہار خیال کا طریقہ وہ انشائیوں، اخبارات کے مضامین یا بڑے بڑے جلسوں میں تقریروں کے لئے محفوظ رکھتے ہیں۔

شولوخوف کی تمام تخلیقات انسان کی بھلائی کی جدوجہد کے تصور اور کمیونزم کے خیالات میں رچی ہوئی ہیں: یہ ان افسانوی ادب کی تخلیقات اور انشائیہ تحریروں کے متن دونوں پر صادق آتا ہے۔ زیرنظر کتاب موخرالذکر صنف کی انکی بنیادی تحریروں کو جن میں تقریریں اور نشری تقریریں بھی شامل ہیں، یکجا کرتی ہے۔

''اور ڈان بہتا رہا...'' کے انگریزی ایڈیشن کا پیش لفظ نوعیت کے اعتبار سے مناظراتی ہے۔ اس میں مصنف نے اپنی تصنیف کے جو پہلے ہی عالمگیر شہرت حاصل کر چکی تھی، اور اپنی نئی تصنیف ''جب زمین جاگی'' کے بنیادی خیال کی وضاحت کی ہے، اور ان غلط تاویلات کی جو اہل غرض غیرملکی قارئین اور نقادوں میں ان دنوں عام تھیں، تصحیح کی ہے۔ ''اور ڈان بہتا رہا...'' کے سلسلے میں انہوں نے ''ان زبردست تبدیلیوں'' کا ذکر کیا تھا ''جو پہلی عالمگیر جنگ اور انقلاب کے نتیجے میں زندگی میں، روزمرہ کی سرگرمیوں میں اور انسانی نفسیات میں رونما ہو گئی ہیں''۔ انہوں نے لکھا تھا کہ میرا فرض یہ ہے کہ ''دونوں جنگوں (پہلی عالمگیر جنگ اور خانہ جنگی) اور انقلاب کے دوران میں وادی ڈان کے مختلف سماجی پرتوں کو دکھاؤں'' اور ''۱۹۱۴ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان واقعات کا جو زبردست بھنور پیدا ہوا اس کے اندر کھنچ کر چلے آنے والے افراد کا المناک مقدر ایک تسلسل میں پیش کروں...''

۱۹۳۴ء میں، ادیبوں کی کل یونینی کانگرس کے ایک ماہ بعد شولوخوف نے روستوف برساحل ڈان کے فیکٹری مزدوروں اور ریلوے مزدوروں کے ایک جلسے میں ایک اہم تقریر کی جس میں واضح کیا کہ پرولتاری نصب العین میں ادب ایک جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔

اعلیٰ سوویت کے ممبر کی حیثیت سے اپنی تقریروں میں شولوخوف نے وضاحت کی ہے کہ وطن کی سچی محبت کیا ہے اور جھوٹی محبت کیسی ہوتی ہے، بتایا ہے کہ تاریخ لوگوں کے قول کے مطابق نہیں بلکہ اعمال کے مطابق پرکھتی ہے، ڈان کے کاسکوں کو مقدر نے کیا دیا اور یہ کہ سوویت حب الوطنی کیا ہوتی ہے۔

ا۔ س۔ سیرافیموویچ کی پیدائش کے پچہترویں سال کی تقریب کے موقع پر اپنے مضمون میں شولوخوف نے جس پیار اور احترام کے ساتھ

اظہار خیال کیا تھا اس سے ان کے رویے کی خاص طور سے وضاحت ہو جاتی ہے: ''سیرافیموویچ ادیبوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس سے ہم نوجوانوں نے سیکھا تھا۔ میں ذاتی طور پر ان کا احسانمند ہوں کیونکہ سب سے پہلے انہوں نے ہی مجھے سہارا دیا تھا، میری ہمت افزائی کی تھی اور میری ادبی زندگی کے آغاز میں ادیب کی حیثیت سے مجھے تسلیم کیا تھا۔''

نوجوان کمیونسٹ لیگ کی بیسویں سالگرہ کے موقع پر شولوخوف نے لکھا تھا کہ کوسسومول کے ممبر پارٹی کی رہنمائی کے تحت خانہ جنگی میں دشمن کا صفایا کر رہے تھے، اجتماعی فارم قائم کرنے میں مدد کر رہے تھے اور ان لوگوں کی صف اول میں تھے جو سوویت صنعت کی تعمیر کر رہے تھے، سوشلسٹ مقابلے بازی کا پرچم بلند کئے ہوئے تھے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ بالشویزم کے بیج زرخیز زمین میں بوئے گئے تھے۔

حال ہی کا جو جشن منایا گیا وہ ویشنسکایا میں نوجوان کاسک اجتماعی کاشتکاروں کے تھیٹر کی دوسری سالگرہ کا تھا۔ اس موقع پر شولوخوف نے اس تھیٹر کو ''فن کی چھوٹی سی روشن مشعل'' سے تشبیہہ دی تھی جو ڈان کے ایک گاؤں میں روشن کی گئی تھی اور جسکی جگمگاہٹ پورے علاقے میں پھیل جانی چاہئے تاکہ آرٹ عوام الناس کی رگ و پے میں پیوست ہو جائے۔

انشاپرداز کی حیثیت سے شولوخوف کی سرگرمیوں کے پہلے دور کے منطقی نتیجے کی تشکیل سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی اٹھارویں کانگرس میں ان کی مشہور تقریر سے ہوتی ہے۔ انہوں نے سوویت یونین کی برادرانہ قومی جمہوریاؤں کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کے بارے میں ڈیلی گیٹوں کو بتایا۔ قومی مصنفوں کی تازہ دم آوازیں روسی ادب کے سیل رواں میں آن ملی تھیں، اس کو مالامال کر دیا تھا اور اس کو حقیقی معنوں میں تمام سوویت قوموں کی تخلیق بنا دیا تھا۔ شولوخوف نے ان میں قزاخ شاعر جمبول کے ''سادگی میں پرکار'' گیتوں، ''جارجیائی نظموں کی مسحورکن شیرینی''، اور داغستانی شاعر سلیمان استالسکی کی ''انوکھی، نغمہ ریز بیتوں'' کی مثالیں پیش کی تھیں۔ پھر انہوں نے سوویت ادیبوں اور پڑھنے والوں کے درمیان تعلقات کا ذکر کیا:

''اپنے فن سے جن لوگوں کی ہم خدمت کرتے ہیں وہ ہمارے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنے سے کبھی نہیں ہچکچاتے۔ ہماری تنقید کی

جاتی ہے، جب ضرورت ہو تو سرزنش کی جاتی ہے، جب ہمیں ناکامی ہوتی ہے تو سہارا دیا جاتا ہے، جب کام قابل تعریف ہو تو تعریف کی جاتی ہے، اور ہم میں سے ہر ایک کو عوام کے رہبرانہ دست شفقت کا ہر وقت احساس رہتا ہے۔"

شولوخوف نے اپنے اور بہت سے دوسرے ڈیلی گیٹوں کے بارے میں جو پارٹی کانگرس میں پہلی بار حصہ لے رہے تھے، فخر کے ساتھ ذکر کیا کہ وہ پارٹی کے پروردہ دانشوروں کی پہلی کونپلیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے بعد لاکھوں کروڑوں آئیں گے جن کے لئے کلچر فطرت ثانیہ بن چکا ہوگا۔

تیزرفتار پیش‌قدمی کے پرمسرت احساس اور کمیونسٹ تعمیر میں روزافزوں کامیابیوں پر جو ان دنوں سوویت سماج کی کرداری خصوصیت تھی، آنےوالی جنگ کے سائے پڑنے لگے تھے۔ ۱۹۳۹ء کا زمانہ تھا اور اس کانگرس میں شولوخوف کی تقریر لوگوں کی یادوں میں ایک پیمان بن کر گونجی: "یہ بات صاف صاف بتا دینی چاہیئے کہ سوویت ادیب مغربی یورپی صلح پسندوں کی رقت‌انگیز نسل سے تعلق نہیں رکھتے... اگر دشمن ہمارے ملک پر حملہ‌آور ہوتا ہے تو ہم سوویت ادیب اپنے قلم رکھدیں گے اور پارٹی اور حکومت کی دعوت پر دوسرا ہتھیار اٹھا لیں گے... لال فوج کی صفوں میں، شاندار سرخ پرچم کے زیر سایہ ہم دشمن کو یوں مار گرائیں گے کہ پہلے کبھی کسی نے نہ کیا ہوگا... دشمن کا قلع قمع کرنے کے بعد ہم کتابیں لکھیں گے کہ کیسے کیا۔ یہ کتابیں ہمارے عوام کے کام آئینگی اور اگر کوئی حملہ آور بچے تو ان کے لئے باعث تنبیہہ ہوں گی۔"

یہ سب کچھ صحیح ثابت ہوا۔

شولوخوف کا قلم دوسرے ہتھیار سے بدل گیا لیکن وہ بیکار نہیں پڑا رہا۔ جنگ کے زمانے میں شولوخوف نے اخباروں کے لئے جو خاکے اور انشائیے لکھے اور کتابیں لکھیں انہوں نے عوام کی بحسن و خوبی خدمت انجام دی۔ اور جو دوسری عالمی جنگ شروع کرنےوالوں کے ذلت‌آمیز انجام کو فراموش کرکے نئی جنگ شروع کرے اس کے لئے تنبیہہ کی حیثیت بھی رکھتی ہیں اور یاد دہانی کی بھی۔

۲۶ جون ۱۹۴۱ء کو اخبار "بالشیوستسکی ڈان" نے شولوخوف کی اس تقریر کا اقتباس شائع کیا جو انہوں نے محاذ جنگ پر جانےوالے کاسکوں کے دستوں کے سامنے کی تھی۔ ۲۴ جون کو اپنے ہموطنوں کو جنہوں

نے مادر وطن کی پکار پر ہتھیار اٹھائے تھے مخاطب کرتے ہوئے ادیب اور محب وطن نے بہادری اور ظفرمندی کی وہ روایات یاد دلائیں جو تاریخ نے ان کو ورثے میں دی تھیں۔ انہوں نے انہیں اپنے اس تار کے متعلق بھی بتایا جو دفاع کی عوامی کمیساریت کے نام بھیجا گیا جس میں انہوں نے مطلع کیا تھا کہ اپنا ریاستی انعام دفاعی فنڈ میں دے دیا ہے اور یہ کہ وہ مزدوروں اور کسانوں کی لال فوج کی صفوں میں شامل ہونے کے لئے اور اپنے خون کے آخری قطرے تک سوشلسٹ مادروطن کی حفاظت کرنے کے لئے ہر دم تیار ہیں۔

۴ جولائی ۱۹۴۱ء کے "پراودا" میں ان کا مضمون "ساحل ڈان پر" شائع ہوا۔ اس کی آخری سطریں اس خیال کا لب لباب تھیں جو عرصہ دراز تک شولوخوف کی انشائیہ تحریروں پر حاوی رہا: "ڈان کے کاسکوں کے دل پر دو احساسات غالب ہیں: اپنی مادروطن سے محبت اور نازی حملہ‌آوروں سے نفرت۔ محبت رہتی دنیا تک جاگزیں رہیگی لیکن نفرت دشمن کا مکمل صفایا ہونے تک ہی قائم رہے۔"

جنگ ابھی شروع ہی ہوئی تھی لیکن اس ابتدائی دور میں بھی شولوخوف کے الفاظ میں کامل یقین اور اپنی قوم پر مکمل اعتماد کی گونج تھی: "اس نفرت اور عوام کے جوش‌انتقام کو ابھارنےوالوں پر لعنت!"

جنگ شروع ہونے کی پہلی سالگرہ پر "پراودا" نے "نفرت کی سائنس" کے عنوان سے ایک افسانہ شائع کیا۔ اس کا رنگ اگرچہ افسانوی ہے مگر لہجہ نمایاں طور پر انشائیہ ہے اور شولوخوف کے لئے ایک نیا موڑ ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار، لفٹنٹ گیراسیموف اپنے انداز میں ان خیالات کی عکاسی کرتا ہے جن کا اظہار شولوخوف نے زمانہ‌جنگ کے اپنے پہلے خاکے میں کیا تھا۔ لفٹنٹ کہتا ہے بظاہر ایسا لگے گا کہ جیسے محبت اور نفرت کبھی ساتھ ساتھ نہ ہو سکتی ہوں اور وہ ایک روسی قصے کی مثال دیتا ہے جو مضبوط گھوڑے اور نازک اندام ہرنی کے متعلق ہے جنہیں کبھی ایک ساتھ گاڑی میں نہ جوتا جا سکتا تھا۔ پھر وہ کہتا ہے "مگر ہم نے جوت لیا ہے۔ اور دونوں ساتھ ساتھ مزے میں چل رہے ہیں!.. وطن کی محبت ہمارے دلوں میں جاگزیں ہے اور جب تک ہمارے دلوں میں دھڑکن باقی ہے وہیں رہیگی۔ اپنی نفرت کو ہم سنگینوں کی نوک پر لئے پھرتے ہیں۔" (شروع میں ہمیں تامل تھا کہ انشائیہ تحریروں کے مجموعے میں اس افسانے کو شامل کرنا آیا مناسب بھی ہوگا یا نہیں لیکن پھر فیصلہ کیا کہ مندرجۂ ذیل اسباب کی بنا پر ہم حق

بجانب ہوں گے: افسانہ ''نفرت کی سائنس'' جب پہلی بار شائع ہوا تو مصنف نے اس کو کسی خاص صنف تحریر سے مخصوص نہیں کیا تھا۔ بجائے خود اس بات نے اجازت دیدی تھی کہ اسے ہمعصر انشائیہ تحریروں میں شامل کر لیا جائے۔ بہرحال افسانہ خود خاصیتی اعتبار سے اس قدر پرزور انشائیہ انداز کا ہے کہ اس کے بغیر شولوخوف کی دوران جنگ کی انشائیہ تحریروں کا مجموعہ نامکمل معلوم ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ''نفرت کی سائنس'' کے بغیر ایسے مجموعے کا تصور بڑا ہی دشوار ہے۔)

جنگی نامہ نگار کی حیثیت سے شولوخوف نے اپنا ایک خاکہ یوں شروع کیا تھا: ''پینسلوں، نوٹ بکوں اور ہلکی مشین گنوں سے مسلح ہو کر ہم ایک کار میں بیٹھ کر اگلی صف کے مورچے پر پہنچے...'' اپنے ''امریکی دوستوں کے نام ایک خط'' میں جو انہوں نے جنگ کے دوسرے سال کے آخری دنوں میں لکھا تھا، وہ کہتے ہیں: ''جنگی نامہ نگار کی حیثیت سے میں جنوبی، جنوب مغربی اور مغربی محاذوں پر گیا تھا۔'' شولوخوف کی انشائیہ تحریروں میں اس ''خط'' کو بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے امریکی قارئین کو بتایا ہے کہ وہ حب الوطنی کی جنگ عظیم کے بارے میں ایک ناول لکھ رہے ہیں جسکا نام ''وطن کے مجاہد'' ہوگا جس میں وہ اس بوجھ کی تفصیل بیان کرنا چاہتے ہیں جو جرمن نازی حملے کے خلاف لڑائی میں سوویت عوام کے کندھوں پر آن پڑا ہے۔ اس دوران میں، جبکہ ناول ابھی ناتمام تھا وہ چاہتے تھے کہ اپنے امریکی دوستوں سے ایک ادیب کی طرح نہیں بلکہ اتحادی ملکوں میں سے ایک ملک کے محض ایک شہری کی طرح خطاب کریں۔

آج سے ہزار دو ہزار برس بعد مورخ جنگ کی — جو اس وقت تک ایک معدوم مظہر بن چکی ہوگی — نوعیت کا مطالعہ کرتے ہوئے، یہ الفاظ پڑھتے ہوئے غالباً وفور جذبات سے دم گھٹتا ہوا محسوس کریں جو معنوی اور مجازی دونوں اعتبار سے سمندر پار کے ایک ملک کے ادیب نے دوسرے ملک کے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے لکھے تھے۔ شولوخوف نے لکھا تھا: ''ہم میں سے ہر ایک کی زندگی میں جنگ ان تمام شدتوں کے ساتھ داخل ہو گئی ہے جو ایک قوم کی دوسری قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے، نگل جانے کی کسی کوشش سے مخصوص ہوتی ہیں۔ محاذ جنگ پر جو کچھ ہو رہا ہے، جنگ کامل میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہم سب کی زندگی پر ایک انمٹ نقش چھوڑ چکا ہے۔ میں اپنی ماں کو کھوچکا ہوں جو ہمارے گاؤں پر جسکی جنگی اعتبار سے قطعی کوئی اہمیت نہیں

ہے، ہوائی حملے کے دوران جرمن ہوائی جہاز سے گرائے ہوئے ایک بم سے ہلاک ہوئیں۔ اس کارروائی کے پیش نظر مقصد وہ تھا جو ڈاکوؤں کا ہوتا ہے — آبادی کو تتربتر کردیا جائے تاکہ بڑھتی ہوئی جرمن فوج کے روبرو لوگ اپنے مویشیوں کو مشرق کی طرف ہانک کر نہ لیجا سکیں۔ جرمن توپوں کے گولوں نے میرے گھر، میری لائبریری کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ میرے بہت سے دوست — ادیب اور میرے گاؤں کے ساتھی — مجھ سے بچھڑ چکے ہیں، وہ محاذ جنگ پر کام آئے۔ ایک عرصۂ دراز تک مجھے اپنے بال بچوں کی کوئی خبر نہ مل سکی۔ اس دوران میں میرا بیٹا بیمار رہا اور میں کسی طرح کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ لیکن، بہرحال یہ نجی مصائب ہیں، وہ ذاتی رنج و غم جن سے ہم میں سے بیشتر کو سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ جب جنگ لوگوں کی زندگی کا جزو بن جاتی ہے تو یہ غم جمع ہو کر ایک عام، قومی المیہ بن جاتے ہیں۔ ہمارے اپنے ذاتی المئے عوام کی مصیبتوں پر جن کے بارے میں کوئی ادیب، کوئی فنکار ابھی دنیا کو باخبر نہیں کر سکا ہے، غالب نہیں آ سکتے۔''

شولوخوف نے لکھا تھا کہ اپنے ہاتھ خون آلود کئے بغیر اس جنگ سے نکل کر آنا غیر ممکن تھا۔ جنگ کا مطالبہ پسینہ تھا، خون تھا۔ اگر انکار کیا جاتا تو وہ دگنی قیمت وصول کر لیتی۔ پس و پیش کا انجام ناقابل تلافی نقصان ہوتا۔ اور ان الفاظ میں جو صفحۂ قرطاس پر رہتی دنیا تک کے لئے ثبت ہو چکے ہیں: ''آپ نے اپنے جگر گوشوں کا خون اپنے گھر کی دہلیز پر بہتے نہیں دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے اور اس لئے مجھے آپ سے اس طرح دو ٹوک بات کرنے کا حق پہنچتا ہے۔''

قلمکار اولگا برگہولتس نے تاریخ کے لئے — ہماری قوم کی تاریخ، ادب کی تاریخ اور انجام کار نوع انسانی کی تاریخ کے لئے — اس مختصر تقریر کو محفوظ کر لیا ہے جو شولوخوف نے محاصرے کے دوران میں سورما شہر لینن گراد کے بیٹیوں اور بیٹوں کے لئے نشر کی تھی: ''ہمارے لینن گراد کے ساتھیو! ہمیں معلوم ہے کہ دشمن کے محاصرے میں رہتے ہوئے آپ کے لئے زندگی بسر کرنا، کام کرنا اور لڑنا کتنا دشوار ہے۔ لوگ آپ کو ہر جگہ — ہر محاذ پر اور عقب میں یاد کرتے ہیں۔ دورافتادہ یورال میں فولادساز مزدور کو پگھلی ہوئی دھات بہتی دیکھ کر آپ کی یاد آتی ہے اور وہ بلامہلت کام کئے چلا جاتا ہے تاکہ آپ کی نجات کی گھڑی قریب آ جائے۔ لڑائی کے مورچے پر، ڈانباس میں جرمن حملہ آوروں پر فائر کرنے والا فوجی ان کو صرف اپنے تباہ و برباد یوکرین کی خاطر ہی نہیں

مار گراتا بلکہ ان بے پناہ مصیبتوں کے لئے بھی جو دشمن نے، لینن گرادوالو، آپ کو پہنچائی ہیں... ہم اس گھڑی کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں جب محاصرہ ٹوٹ جائیگا اور عظیم الشان سوویت دیس، لینن گراد کے ــ سراپا اور ابدی شان کے شہر کے ــ بہادر بیٹوں اور بیٹیوں کو اپنے گلے لگا لےگا۔ ''

۱۳ مئی ۱۹۴۵ء کو ''پراودا'' نے ایک مضمون بعنوان ''وہ فتح جسکی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی'' شائع کیا۔ شولوخوف نے لکھا تھا کہ اگر تاریخ عالم میں اس سے زیادہ خون آشام اور تباہ کن جنگ جو ۱۹۴۱ء ــ ۱۹۴۵ء میں ہوئی تھی، پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی تو یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی بھی فوج نے اتنی شاندار فتوحات حاصل نہیں کیں جتنی سوویت فوج نے، اور نہ ہی شان و شوکت، قوت و عظمت کی اس تابناکی کے ساتھ حیران و ششدر نوع انسانی کے سامنے نمودار ہوئی۔ ''

شولوخوف کی بحیثیت مجموعی انشائیہ تصانیف یا بحرحال اس کی زیادہ نمایاں مثالوں کے تخلیقی انداز کی بعض لازمی خصوصیات جو ان کی شان امتیازی ہے، جنگ کے زمانے کے مضمونوں اور خاکوں میں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ وہ سب فوری، اہم ترین مسئلوں پر لکھے گئے۔ ان سب میں ان خوبیوں کا نامیاتی امتزاج ہے جو عموماً رزمیہ ادب سے وابستہ کی جاتی ہیں ــ عوام کی زندگی مرتب کرنےوالے واقعات پر وسیع پیمانے کی گرفت اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے ہیروؤں کی، عوام کی داخلی زندگی کے عناصر کی مفکرانہ، مرتکز بصیرت جو تاریخی واقعات میں حصہ لیتے اور ان کی تخلیق کرتے ہیں۔ ایک خفیف سے، پھر بھی صاف نظر آنےوالے، لمس سے شولوخوف کسی بیان یا قصے میں، کسی خاکے، یہاں تک کہ اخباری مراسلے میں جان ڈال دیتے ہیں۔ ممکن ہے یہ خود مصنف کا چشمدید واقعہ ہو یا کسی فرد کے مقدر یا طرزعمل میں کوئی مثالی چیز جس سے درحقیقت سوویت کردار کے عام خدوخال ابھر آتے ہوں۔

اپنے وطن کی زندگی کے اہم ترین واقعات وحوادث کے متعلق ــ عصری حقیقت کے ان پہلوؤں کے متعلق جو لوگوں کے دل ودماغ کو سب سے زیادہ متاثر کرتے ہیں ــ شولوخوف کے مضامین اس رویے کا جو کسی سوشلسٹ ملک کا باشندہ ان مسئلوں اور واقعوں کے بارے میں اختیار کرتا ہے اور اس تشخیص کا بھی جو وہ ان کے بارے میں کرتا ہے، ہمیشہ نہایت وضاحت کے ساتھ اظہار کرتے ہیں۔

ان تحریروں کا شستہ انداز فکر اور تشخیصی بصیرت، ان کا فروغ

جذبات، پارٹی اور عوام کے مفادات سے ان کی گہری عقیدت اور اس طرز کی سادگی جس میں عام فکروں کا اظہار کیا گیا ہے، ان مضامین کو قارئین کے وسیع ترین حلقوں کے لئے قابل فہم بناتی ہے۔ اپنے کروڑوں قارئین کو مخاطب کرتے ہوئے ادیب وہ باتیں کرتا ہے جو ذاتی طور پر اس سے متعلق ہوتی ہیں، قارئین کو اپنے خلوص سے اپنا ہمخیال بنا لیتا ہے اور پراثر تشبیہوں اور استعاروں سے جو شولوخوف کی طرزنگارش کا خاصہ ہیں اپنے بیان کے تاثر کو گہرا کر دیتا ہے۔

شولوخوف کی مابعد جنگ کی انشائیہ تحریروں میں امن کےلئے جدوجہد کے، سوشلسٹ، مجاہدانہ انسان‌دوستی کے موضوعات روزافزوں اصرار کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں غضب کا تنوع ہے۔ یہی کیفیت ان کو پیش کرنے کے انداز اور اسباب کی ہے۔ لیکن ان کی فلسفیانہ استقامت، ان کے رویے اور ان کے راہنما اصولوں کی وضعداری میں سرمو فرق نہیں آتا۔

''اک بات مادروطن کی'' وہ مضمون ہے جو عنوان کے قدرے حزینہ لہجے سے پوری پوری مطابقت رکھتا ہے اور حق تو یہ ہے کہ شولوخوف کی انتہائی پرزور انشائیہ تحریروں میں سے ہے۔ یہ مضمون ۱۹۴۸ء میں لکھا گیا تھا جبکہ اس خون آشام جنگ کی جسکو ختم ہوئے تین برس سے بھی کم عرصہ ہوا تھا، یادیں ابھی تازہ تھیں۔

اس قدر تحکمانہ انداز میں، اس قدر بےدردی کے ساتھ ادیب ہمیں کیوں مجبور کرتا ہے کہ جو گزر چکا ہے اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے پھر سے زندہ ہوتے دیکھیں، اس کو پھر سے بھگتیں جسے پہلے بھگت چکے ہیں، وہ ان زخموں کو پھر سے کیوں ہرا کرنا چاہتا ہے جو اب مندمل ہو چکے ہیں؟ جواب سادہ ہے: اس لئے کہ جسے فراموش نہ کرنا چاہیئے، اسے لوگ اس وقت تک فراموش نہ کریں جب تک دنیا دو ڈیروں میں تقسیم ہے۔ تاکہ لوگ امن کی جدوجہد کی پوری اہمیت کو محسوس کریں اور وہ سبق نہ بھولیں جو جنگ کے دوران میں انہیں نفرت کی سائنس نے سکھایا ہے۔ تاکہ امن کے دشمنوں سے نفرت ان کے دل میں زندہ رہے، ان لوگوں سے نفرت جو ''اپنی شیطانی، اندھی حماقت میں نوع انسانی کو جو ایک ہیبتناک تجربے سے اپنے ہوش بجا نہیں کر پائی ہے، ایک نئی جنگ کے جہنم میں جھونکنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ '' کیونکہ وہ وقت ابھی تک نہیں آیا ہے جبکہ ہم نئی جنگوں کے اندیشے کو فراموش کر سکیں: اس لئے جنگوں کے شعلے بھڑکانےوالوں کے خلاف نفرت

''اک سیلاب ہمارے دلوں میں کئی گنی شدت کے ساتھ ان کے خلاف ٹھاٹھیں مارے گا جن کا انسانوں کی زبان میں کوئی نام نہیں ہے، ان کے خلاف جن کی ہوس کو ان منافعوں سے تسکین نہیں ہوتی ہے جو کروڑوں کے خون سے حاصل ہوئے ہیں... وقت پر وہ کام آئے گی!''

اس مضمون میں، جیسا کہ شولوخوف کا معمول ہے، محبت اور نفرت کے موضوع نہ صرف پہلوبہ‌پہلو موجود ہیں بلکہ خلط‌ملط ہیں۔ مادر وطن کی محبت اس کے دشمنوں سے نفرت پیدا کرتی ہے جبکہ فرد واحد اور عمومی طور پر نوع انسانی سے محبت اس کو مغلوب کرنے‌والوں کے خلاف جو انسان سے کمتر ہوتے ہیں، نفرت کے جذبے کو ابھارتی ہے۔

مصنف نے ''اک بات مادر وطن کی'' کو ایک ذریعہ بنایا ہے جس میں نمایاں امتیازات کے ذریعے دکھایا ہے کہ سوویت عہدحکومت کے دوران میں ہمارے ملک کے محنت کش عوام کی زندگی کس طرح بدل گئی ہے، معیشت میں، لوگوں کی زندگی اور کردار میں تغیرو تبدل کتنا عظیم‌الشان ہوا ہے۔ شولوخوف نے کمیونسٹ پارٹی کے بارے میں لکھا ہے جس نے بہادرانہ جدوجہد کی خوبیوں کو لوگوں میں پروان چڑھایا، اور جن کو وہ اپنی رہنمائی میں بےنظیر ترقی کی جانب لے گئی۔ وہ ''واحد منصفانہ نظام‌حکومت''، سوویت حکومت کا ذکر کرتے ہیں جس کو لوگوں نے ''برسوں صعوبتیں برداشت کر کے اور عظیم انقلابی جدوجہد کے بعد حاصل کیا ہے... اور اپنے خون پسینے سے جسکو مستحکم کیا ہے'' اور اس حکومت پر ہمارے عوام کی غیرمتزلزل اعتماد کی بات کرتے ہیں۔

اسپین، کوریا، ویت‌نام میں رونما ہونے‌والے واقعات سے شولوخوف ایک انسان‌دوست ادیب کی حیثیت سے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں... سامراجیوں اور ان کے جرائم کے خلاف اپنے حملوں کی شدت میں ان کی انشائیہ تحریریں مناظرے کا لب و لہجہ اختیار کر لیتی ہیں۔

جدید دنیا میں فنکار کا مقام اور اس کا کردار، ادیب کا فرض‌منصبی، اپنے عوام کے سامنے ادیب کی ذمہ‌داری اور نوع انسانی کا مستقبل وہ موضوعات ہیں جو شولوخوف کی بہت سی تحریروں اور تقریروں میں فطری طور پر آجاتے ہیں۔ پارٹی کانگرسوں، ادیبوں اور ادب کے عالموں کے جلسوں میں ان کی تقریروں کا بڑا حصہ انہیں موضوعات پر وقف ہوتا ہے اور انہیں کو وہ اپنے ان مضمونوں اور انشائیوں میں اٹھاتے ہیں جو وہ آج کے ترقی‌پسند کلچر کی سرکردہ شخصیتوں اور ممتاز سماجی ہستیوں کے بارے میں سپرد قلم کرتے ہیں۔

ادیبوں کی دوسری کل‌یونینی کانگرس میں تقریر کرتے ہوئے شولوخوف نے پارٹی جذبے کی جو سوویت فنکاروں کی کرداری خصوصیت میں شامل ہوتا ہے کلاسکی تعریف پیش کی۔ ''غیرممالک میں ہمارے کینہ پرور دشمن الزام لگاتے ہیں کہ ہم، سوویت ادیب پارٹی کے حکم پر لکھتے ہیں۔ صورت حال واقعی مختلف ہے کیونکہ ہم میں سے ہر ایک اپنے دل کے کہنے پر لکھتا ہے — اور ہمارے دل پارٹی اور عوام کے ہوتے ہیں جنکی ہم اپنے فن سے خدمت کرتے ہیں۔'' سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگرس میں شولوخوف کی تقریر نہ صرف گہرے جذبات سے لبریز ہے بلکہ ایک شہری کی حیثیت سے سوویت ادیب کے نقطۂ نظر کا لب‌لباب بھی: ''ہم سب اپنی عظیم کمیونسٹ پارٹی کی اولاد ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک، پارٹی کے بارے میں سوچتے ہوئے نہایت ہی جذباتی انداز میں اپنے آپ سے دل ہی دل میں کہتا ہے: 'تم ہماری ماں کی طرح ہو، تم نے ہمیں پروان چڑھایا، تم نے ہمیں آہنی‌پیکر فولاد بدن بنایا، تم ہمیں زندگی کی واحد سچی شاہراہ پر لئے جا رہی ہو۔'''

پارٹی کی بائیسویں کانگرس میں شولوخوف کی تقریر فنکار کے تخلیقی جذبے اور اپنے کرداروں سے مصنف کے تعلق کے بارے میں ہے:

''فنکار بوقت تخلیق سرد کیسے رہ سکتا ہے! اگر آپ کا خون مچھلی کے خون کی طرح ٹھنڈا ہو اور دل پر چربی کی اتنی تہیں جم چکی ہوں کہ اس میں تڑپ باقی نہ رہی ہو تو آپ کوئی ادبی تخلیق نہ کر سکیں گے، اور قارئین کے دلوں تک پہنچنے کا راستہ آپ کبھی بھی تلاش نہ کر پائیں گے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ جب کوئی ادیب لکھ رہا ہو تو خون اس کی رگوں میں جوش کھا رہا ہو، میں چاہتا ہوں جب وہ دشمن کے بارے میں لکھ رہا ہو تو فرط نفرت سے اس کا چہرہ زرد پڑ جائے، میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے کرداروں کے ساتھ جنہیں وہ تخلیق کرتا ہے، جن سے وہ محبت کرتا ہے جو اس کو عزیز ہوتے ہیں، ہنسے اور روئے۔ صرف اس طرح ہی حقیقی فن پارہ تخلیق ہوگا جعلی نہیں۔''

رسالہ ''انوسترانایا لتیراتورا'' میں شولوخوف نے جو خط لکھا تھا اس کا غیرممالک کے ادیبوں میں بڑا خیرمقدم ہوا۔ اس میں انہوں نے تجویز رکھی تھی کہ ساری دنیا کے ادیبوں کی ''گول میز'' قائم کی جائے۔ اس کا قیام ممکن ہوگا کیونکہ اگرچہ ان کے خیالات مختلف ہیں لیکن کار آمد ہونے کی دلی خواہش مشترک ہے جو ان کو متحد کرتی ہے۔

بعض حلقوں میں یہ خیال زور پکڑتا جا رہا ہے کہ ادب کی ایک

صنف اور ادبی ہیئت کی حیثیت سے ناول بس اب مٹنے ہی والا ہے۔ ادیبوں کی یونین کمیٹی کی کارروائیوں میں شرکت کرتے ہوئے شولوخوف نے اس کا ذکر چھیڑا اور اپنی تقریر میں شدید مناظراتی لہجہ پیدا کیا، اگرچہ ویسے وہ اپنا ذاتی نقطۂ نظر پیش کر رہے تھے۔ انہوں نے دانشمندانہ پیرائے اور نہایت پروقار انداز میں تقریر کرتے ہوئے واضح کیا کہ یہ سوال الیانے کا خود تصور ہی کس قدر بے معنی اور مصنوعی ہے۔ انہوں نے اپنے سامعین کو آگاہ کیا ''اگر کوئی تختوں پر رندہ کرنا اور ناول کو دفن کرنے کے لئے تابوت بنانا شروع کرے گا'' تو وہ اس صورت میں پھر تقریر کرنے کا اپنا حق محفوظ رکھنے کا اعلان کرتے ہیں۔ ''میرے لئے تو یہ سوال کہ ''ناول ہوگا یا نہیں ہوگا'' سرے سے اٹھتا ہی نہیں'' عین اسی طرح جس طرح کسان کے لئے یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنا کھیت بوئے یا نہ بوئے۔ معاملہ اگر کسان کا ہو تو سوال اس طرح کیا جا سکتا ہے: ''بہتر فصل کاٹنے کے لئے کھیت بہترین طریقے سے کیسے بویا جائے؟'' میرے لئے بھی معاملہ عین یہی ہے اور سوال یہ ہے کہ: اپنے ناول کو اتنا اچھا کیسے بناؤں کہ واقعی وہ میری قوم کی اور میرے قارئین کی خدمت اعزاز کے ساتھ انجام دے؟''

بعد میں شولوخوف نے ایک ادیب کی حیثیت سے اپنے لئے اور عصر حاضرہ کے ادب کی ایک صنف کی حیثیت سے ناول کی اہمیت پر اپنے نظریات کی مزید توضیح کی۔ یہ معلوم ہونے پر کہ ۱۹۶۵ء کا ادب کا نوبل انعام ان کو ملا ہے، ''پراودا'' کے نامہ نگار سے ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا تھا اگرچہ اس انعام سے قدرتی طور پر انہیں بڑی مسرت ہوئی ہے لیکن یہ بات وہ قطعی طور پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ ایک فرد کا، ایک پیشہ ور ادیب کا وہ اطمینان نہیں ہے جو اس کی تخلیقات کی بین الاقوامی تعریف و توصیف اور قبولیت سے حاصل ہوتا ہے۔ ان پر جن جذبات کا غلبہ تھا وہ بلکہ اس خوشی کے تھے کہ وہ، خواہ محدود پیمانے پر ہی سہی، اپنے ملک کی پارٹی کی جس میں رہ کر انہوں نے اپنی آدھی سے زیادہ زندگی گزاری اور سوویت ادب کی شان دوبالا کرنے میں ممد و معاون ہو رہے ہیں۔ آگے چل کر انہوں نے کہا کہ مجھے شعوری طور پر اس اطمینان کا احساس ہے کہ ''اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناول کی صنف نے جس کے دور جدید میں خود وجود ہی کو بعض ادبی شخصیتیں جائز تصور کرنے پر شبہات کا اظہار کر رہی تھیں، اپنی ہستی کا جائز ہونا ثابت کر دیا ہے۔''

بعد میں، اسٹاک ہام میں ''نوبل ہفتے'' کے دوران ناول کے سوال پر انہوں نے پھر اظہار خیال کرتے ہوئے اس صنف اور تذکرے کے حقیقت پسندانہ طریقے کے درمیان رشتوں پر زور دیا۔ شولوخوف نے کہا کہ ناول ہی ادیب کو اس بات کا امکان فراہم کرتا ہے کہ وہ ممکن حد تک وسیع ترین گیرائی اور گہرائی کے ساتھ دنیا کی حقیقت کا احاطہ کرے اور اس کے متعلق اپنے بیان میں زندگی اور اس کے اشد ضروری مسئلوں کے بارے میں خود اپنے اور اس کے نظریات سے اتفاق کرنے والے لوگوں کے رویے کا عکس پیش کرے۔ شولوخوف نے کہا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول ہمیں حقیر سے ''واحد متکلم'' کو مرکز کائنات کی حیثیت سے پیش کرنے کی جانب راغب کرنے کے بجائے اس زندگی کے بارے میں جو ہمارے اطراف و جوانب میں پھیلی پڑی ہے، زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس صنف کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ حقیقت پسند ادیب کو وسیع ترین امکانات فراہم کر دیتی ہے۔

''جدیدی'' ادب پر — یعنی حد سے زیادہ فیشن ایبل تجربات خصوصاً جو ہیئت کے سلسلے میں کئے گئے ہیں — شولوخوف کے اظہار خیال غیر ممالک میں بہت سے لوگوں کی توجہ کا خاص طور سے مرکز بنا۔ انہوں نے اس اصطلاح کو یہ معنے پہنانے کی مخالفت کی اور کہا کہ ان کی اپنی رائے میں سچے جدیدی وہ ادیب ہوتے ہیں جو اپنی تخلیقات میں وہ نئے معنے اجاگر کرتے ہیں جن سے ہمارے دور کی زندگی لبریز ہے اور جو آج کی کرداری خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ اپنی تقریر کے دوران میں شولوخوف نے ان اہم ترین مسئلوں پر بھی اپنے رویے کا اظہار کیا جو آج کے ادب کے ارتقا کے دوران پیدا ہو گئے ہیں جن میں سوشلسٹ حقیقت پسندی کے اصول، عوام کے روبرو ادیب کی ذمہ داری، جدید دنیا میں ادیب کا مقام اور ادب اور فن کے فرائض عظیم بھی شامل ہیں۔

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی تیئیسویں کانگرس میں انہوں نے جو تقریر کی تھی اس میں انہوں نے ان مسئلوں پر پھر روشنی ڈالی تھی:

''بڑے بڑے، نمائندہ اجتماعات میں مصنفوں، صحافیوں اور اخبار نویسوں سے مجھے بارہا تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع ملا ہے کہ سماج کی زندگی میں مصنف کا کیا کردار ہوتا ہے۔ پچھلے سال نوبل انعام کی تقسیم کی رسم کے دوران میں اسٹاک ہام کے ٹاؤن ہال میں جو تقریر میں نے کی تھی اسکا بڑا حصہ اسی موضوع پر مشتمل تھا۔ سامعین موجودہ اجتماع سے بنیادی طور پر مختلف تھے۔ اور اسی لئے اپنے خیالات کو جن الفاظ میں

نے روپ دیا تھا وہ بنی اسی مطابقت سے مختلف تھے۔ خیال رہے، ہیئت ہیں، ماہیت میں نہیں۔

''کمیونسٹ کہیں بھی، خواہ کسی زبان میں کیوں نہ بولے وہ ہمیشہ کمیونسٹ ہی کی حیثیت سے بولتا ہے۔ بعضے ایسے بھی ہیں جنہیں ممکن ہے یہ پسند نہ ہو مگر حلق سے انہیں اتارنا ہی پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں بھی وہ خوبی ہے جس کا ہر جگہ احترام کیا جاتا ہے۔ جہاں کہیں بھی جلسۂعام میں کوئی سوویت فرد تقریر کرے اس کو سوویت محب وطن کی حیثیت سے بولنا چاہیئے۔ سماج کی زندگی میں مصنف کے کردار کی تعریف بیان کرتے ہوئے ہم کمیونسٹوں کی حیثیت سے، اپنی عظیم مادر وطن کے بیٹوں کی حیثیت سے، ایک ایسے ملک کے باشندوں کی حیثیت سے جو کمیونسٹ سماج کی تعمیر کر رہا ہے، اپنی پارٹی کے اوز اپنے عوام کے انقلابی انسان‌دوست نظریات کے ترجمانوں کی حیثیت سے بات کرتے ہیں۔''

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی چوبیسویں کانگرس میں تقریر کرتے ہوئے شولوخوف نے کہا تھا: ''تہذیبی ارتقاء کے عالمی عمل میں سوویت ادب اور فن جو مجاہدانہ کردار ادا کرتے ہیں اس کا سب سے پہلے تعین اس کمیونسٹ نظریے اور جانب‌داری سے ہوتا ہے جو ہمارے فنکاروں کی بہترین تخلیقات میں رچے ہوئے ہوتے ہیں۔''

سوشلسٹ اور انقلابی انسان‌دوستی کے جوہر سے متعلق مسئلے شولوخوف کی حالیہ انشائیہ تحریروں میں بارہا پیش پیش نظر آئے ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں ادیبوں کا ایک جلسہ باکو میں منعقد ہوا تھا۔ اس کے نام اپنے ایک خط میں انہوں نے لکھا تھا: ''انسان دوست وہ شخص ہوتا ہے جو جہاد کرتا ہے، جو قاتل کا ہاتھ پکڑ لینے اور اس کے بد ارادوں کو ناکارہ کر دینے میں مدد دیتا ہے۔'' سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا کہ انسان‌دوستی اور انسان اور نوعِ انسانی سے محبت کے تصورات کی مختلف لوگ نہایت مختلف تعبیریں پیش کرتے ہیں جن کا انحصار ان سماجی قوتوں پر ہوتا ہے جن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں۔ اپنے کمیونسٹ اعتقادات کے مطابق سوویت ادیبوں کا کہنا ہے کہ وہ شخص جو قتل یا غارتگری کے بدقسمت شکار پر ترس کھانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتا، جو صرف ماتم کرتا ہے کہ دنیا میں قتل‌وخون کا اب بھی وجود ہے، انسان‌دوست نہیں ہوتا۔ اس خط میں زور دیکر واضح کیا گیا ہے کہ ''ہماری قوت، ادیبوں کی قوت ہے۔ وہ ہمارے پرجوش الفاظ میں مضمر ہوتی ہے جو لوگوں کے دل‌ودماغ پر چھا جاتے ہیں، انسانی قوتوں کو

بیدار کرتے ہیں، انسان کے لئے، نوعِ انسانی کے لئے اور اخوت کے نور کے لئے، سامراجی بربریت کی ظلمت کے خلاف جہاد کے اور قوموں کی آزادی عزم‌واستقلال کو تقویت پہنچاتے ہیں۔''

اگست ۱۹۶۸ء میں تاشقند میں منعقدہ ایک بین‌الاقوامی ادبی مباحثے میں شرکت کرنے‌والوں کو شولوخوف کا ایک تار ملا جس میں انہوں نے اہل قلم کو دعوت دی تھی کہ وہ ساری دنیا میں امن اور ترقی کے نیک مقاصد کی خاطر باہم اشتراک عمل کریں۔

اس سے دو سال قبل فرانسیسی سیاحوں کی ایک ٹولی نے ماسکو میں ''نووستی پریس ایجنسی'' کے دفتر میں شولوخوف سے ملاقات کی تھی۔

انہوں نے ان لوگوں سے کہا تھا: ''ہمارے دونوں ملکوں کے درمیان جو وسیع پیمانے پر تعاون ہو رہا ہے اس سے مجھ کو قلبی اطمینان ہے۔''

''میں ڈان کا کاسک ہوں۔ ڈیڑھ صدی قبل ڈان کے کاسک پیرس پہنچے تھے۔ چونکہ وہ انگور کی کاشت کرتے تھے اس لئے وہ انگور کی بیلیں وہاں سے لیکر آئے تھے اور ان بیلوں نے ڈان کی سرزمین میں جڑ پکڑلی ہے۔ آپ کی جانب میرے ہموطنوں کا رویہ نہایت گرم‌جوشی کا ہے۔''

سیاحوں نے شولوخوف سے پوچھا کہ ان کا پسندیدہ فرانسیسی ادیب کون ہے تو انہوں نے جواب دیا تھا:

''اس طرح کے سوالوں کا جواب دینا ہمیشہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ جو وفات پا چکے ہیں ان کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا جانا چاہیئے۔ جو زندہ ہیں ان کے بارے میں جھجک ہوتی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ روسی ادب، روسی ادب‌عالیہ نے آپ سے تعلقات کے باعث بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مالامال کیا ہے۔ تالستائی اور استیندھال کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ماضی میں ہمیں بہت کچھ دیکھنا پڑا ہے... پچھلی جنگ، نازی جرمنی سے جنگ ایک مشترک جنگ تھی اور فرانسیسی اور سوویت عوام کا ایک ساتھ جو خون بہا تھا وہ ہماری قوموں کو واقعی ایک دوسرے کے قریب لے آیا تھا۔''

اور سوویت ادب کی سب سے بڑی خوبی شولوخوف کسے گردانتے ہیں؟

''سچائی۔ اپنی سوویت تاریخ کے پورے عرصے میں ہم نے اعتماد‌وحقیقت سے کام لیا ہے۔ میں بلاخوف خودستائی یہ سمجھتا ہوں کہ ہم نے بہت کچھ حاصل کر لیا ہے۔''

نوجوانوں کے مسائل سے شولوخوف کا مسلسل اور گہرا تعلق

شولوخوف کی شروع کی انشائیہ تحریروں میں ان کی دلچسپی کے دو بنیادی شعبے پوری طور پر واضح ہو گئے۔ ایک تو بہت سے اہم عصری مسائل سے دلچسپی جن میں ہماری معیشت اور اجتماعی کاشتکاروں کی پوری ضرورتیں بھی شامل ہیں اور دوسرے تہذیب کے عام مسائل جن میں ادب اور فن بھی شامل ہیں۔ ان دونوں شعبوں کو ''زندگی'' اور ''ادب'' کے ایسے دو عنوانوں کے تحت لایا جا سکتا ہے جن کا ایک دوسرے پر بنیادی انحصار ہوتا ہے۔ لیکن جیسے کہ ہم دیکھ چکے ہیں جنگ نے ان دو بنیادی دلچسپیوں سے شولوخوف کی توجہ بانٹ دی اور انہوں نے مضمونوں کا وہ سلسلہ شروع کر دیا جن میں محبت یا نفرت کا جذبہ غالب تھا: سوشلسٹ مادر وطن سے محبت اور اس کے دشمنوں سے نفرت۔ یہ وہ انشائیہ تحریریں تھیں جو براہ راست جنگ کے واقعات اور بعد میں، جنگ ختم ہو جانے کے بعد، ساری دنیا میں امن کے لئے جد و جہد کا اثر قبول کرکے معرض وجود میں آئیں۔

جنگ کے بعد شولوخوف نے جو انشائیہ مضامین سپرد قلم کئے ان میں وہ پہلے کے بنیادی موضوعات پر واضح طور سے واپس آتے ہیں۔ نوجوانوں سے متعلق، ایک نسل سے دوسری نسل کو دست بدست ملنے والی روایات سے متعلق، باصلاحیت نوجوانوں کی کمیونسٹ اور حب الوطنی کی تربیت سے متعلق موضوعات کا زیادہ واضح اور معین مقام دکھائی دیتا ہے۔ پچھلے کچھ برسوں میں نوجوانوں سے ان کے ذاتی تعلقات زیادہ گہرے ہو گئے ہیں اور ان مضامین کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے جن میں انہوں نے سوویت نوجوانوں کے مختلف حلقوں کو مخاطب کیا ہے۔

۱۹۳۸ء تک شولوخوف نے، جبکہ ان کی عمر ابھی ۳۳ برس تھی، افسانوں کے دو مجموعوں، ''اور ڈان بہتا رہا...'' کی تین جلدوں اور ''جب زمین جاگی'' کی پہلی جلد کی اشاعت کے بعد، عالمگیر شہرت حاصل کر لی تھی۔ ان کا حق اور کسی حد تک فرض تھا کہ وہ بڑے بھائی کی طرح کومسومول کی عمر کے نوجوانوں کو مخاطب کریں:

''پیارے سوویت لڑکو اور لڑکیو!

''کومسومول اپنی بیسویں سالگرہ منا رہی ہے اور یہ ایک ایسا موقع ہے جسے میں نہیں چھوڑ سکتا۔ خوشیاں مناتے ہوئے نوجوانوں کی ایک

بھیڑ کے پاس سے گزرتے ہوئے کوئی بھی بوڑھا آدمی ایک لمحے کے لئے ضرور ٹھیر جائیگا اور اکارڈین کی دھن سنتے ہوئے اور خوش وخرم نوجوان چہروں کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے اپنی عمر کئی برس چھوٹی محسوس کرنے لگ جائیگا۔ میں بھی، پیارے قارئین، تمہارے بارے میں صرف سوچ کر ہی خود کو نوجوان محسوس کرنے لگتا ہوں اور کچھ افسردہ بھی کیونکہ میں تینتیس کا ہو چکا ہوں اور تمہارے شاندار جشن میں تو خاصا بوڑھا نظر آؤں گا۔''

قزاخستان کے ادیبوں کی تیسری کانگرس میں اپنی تقریر کے خاصے بڑے حصے میں شولوخوف نے نوجوان ادیبوں کی تربیت اور اس بات کی ضمانت کرنے کے مسئلوں پر وقف کیا کہ انہیں تخلیقی طور پر کام کرنے کا موقع میسر آئے۔ مصنف کی باتوں میں ان لوگوں کے بارے میں پدرانہ فکرمندی رچی ہوئی تھی جنہوں نے ابھی پہلے ہی قدم بڑھائے تھے۔ پھر بھی جن نظریات کا انہوں نے اظہار کیا تھا ان میں مروت سے کسی طرح کام نہیں لیا گیا تھا اور بہت سے سامعین ان کی تقریر کے حاوی پیکر سے حیران وششدر رہ گئے تھے جو ایک ایسے ادیب کی خصوصیت کو ظاہر کر رہی تھی جسکی تصنیف کی بلندپرواز اشاریت طرہ امتیازی ہے:

''ایک دفعہ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ سنہری شاہین اپنے بچوں کو اڑنا کیسے سکھاتا ہے۔ وہ ان کو پہلے تو اپنے پر مار کر اڑاتا ہے اور پھر نیچے اترنے نہیں دیتا بلکہ اوپر اور اوپر پرواز کرنے پر مجبور کرتا ہے اور اس وقت تک اڑاتا رہتا ہے جب تک کہ وہ تھک کر بےدم نہ ہو جائیں۔ صرف اس طرح سے ہی سنہری شاہین کے بچے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرنا سیکھ پاتے ہیں... اپنے نوجوان مصنفوں کو سکھانے کا ہمیں یہی طریقہ اپنانا چاہیئے، انہیں بلند سے بلندتر پرواز کرنے پر مجبور کرنا چاہیئے تاکہ انجام کار وہ ادب کے حقیقی شاہین بن جائیں اور بھیگے کوے یا پالتو مرغیاں نہ بنیں۔ لیکن سنہری شاہین پہلی کوشش میں مطلوبہ بلندیوں تک پرواز نہ کر سکنے یا اس سے خوفزدہ ہونے پر اپنے بچوں کے پر توڑ نہیں ڈالتا۔ نقادوں کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ ابھرتے ہوئے مصنفوں کے پر توڑ ڈالیں۔''

نوجوان کمیونسٹ لیگ کی تیرھویں کانگرس کو شولوخوف نے جو پیغام بھیجا تھا اس میں جو ترنم ہے اس کو نثری نظم کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ ''کومسومولسکایا پراودا'' میں شائع ہوا تھا۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"تم میری ہی گزری ہوئی جوانی ہو، تم ہمارے ملک، ہماری پارٹی کی حق بجانب امید ہو! تمہاری کانگرس کے آغاز کے موقع پر میں تمہیں مبارکباد دیتا، تمہیں گلے لگاتا، اور میرے وطن کے مایۂ ناز سپوتو تمہیں اپنے کام، تعلیم اور ذاتی زندگی میں ہر طرح کامیابیوں اور خوشیوں سے ہمکنار ہونے کی دعائیں دیتا ہوں۔"

اجتماعی کاشتکاروں کی تیسری کل یونینی کانگرس میں شولوخوف نے اپنی تقریر کے آخری حصے میں ایک بار پھر سوویت نوجوانوں کو اپنے وطن کی امید اور مایۂ ناز کہا۔ انہوں نے کہا تھا کہ نوجوان ادیبوں میں بہت سے حقیقی جواہر پارے مل سکتے ہیں جن سے قدرتی طور پر اہم تخلیقات کی توقع کی جا سکتی ہے۔

شولوخوف کی انشائیہ تحریروں کے خصوصی پہلوؤں کے پیش نظر اس مجموعے کو تین حصوں میں "زندگی"، "ادیب" اور "نوجوان" کے عنوانوں کے تحت تقسیم کر دیا گیا ہے۔

قدرتی طور پر پہلا حصہ سب سے زیادہ طویل ہے صرف موضوعاتی تنوع کی افراط کے سبب سے ہی نہیں بلکہ جو مسئلے اٹھائے گئے ہیں ان کی زبردست اہمیت کے باعث بھی۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اس حصے کی مزید ذیلی تقسیم مثلاً بعنوان "تخلیقی کام" اور "جنگ" زیادہ سودمند نہ ہوگی۔ دوسرا حصہ وسعت کے اعتبار سے بھی دوسرے درجے پر ہے۔ تیسرے حصے میں مضامین، تقریریں، پیغامات تہنیت شامل کئے گئے ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ نوجوانوں کے نام یا ان سے متعلق ہیں۔

مواد کو مختلف زمروں کے تحت جمع کرنے سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس کتاب سے قاری بہ آسانی استفادہ کر سکے۔ لیکن ایک ہی تقریر میں شولوخوف اکثر سلسلے وار ان مسائل کا احاطہ کر لیتے ہیں جن کا انسان کی سرگرمی کے مختلف شعبوں سے تعلق ہوتا ہے۔ کوئی مضمون ممکن ہے متعدد عام مسئلوں سے شروع ہو اور ختم جا کر ایک پیغام پر ہو جو براہ راست نوجوانوں کو مخاطب کر کے دیا گیا ہو۔ تیسرے حصے میں شولوخوف کی وہ تقریریں بھی شامل ہیں جو انہوں نے لینن انعام پیش کئے جانے کی تقریب میں؛ بائیسویں پارٹی کانگرس میں؛ سوویت ادیبوں کی چوتھی کانگرس میں؛ اور اجتماعی کاشتکاروں کی تیسری کل یونینی کانگرس میں کی تھیں کیوں کہ ان میں سے ہر تقریر کا ایک بڑا حصہ نوجوانوں، ان کی تربیت، عوام اور تاریخ کے روبرو ان کے فرائض کے متعلق ہے کیونکہ وہی ہماری سوویت ریاست کا مستقبل ہیں۔

یو - لوکین

پہلا حصہ

زندگی

ساحل ڈان پر

فوج میں نئے نئے بھرتی ہونےوالے لوگ اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ جو انہیں جنگ کے لئے رخصت کرنے آئے تھے، گاؤں کے چوک کی طرف لپکے جا رہے تھے۔ کوئی سات اور دس سال کے دو لڑکے بھاگتے ہوئے مجھ سے آگے نکل گئے۔ ان کے ماں باپ نے بھی مجھے آن لیا اور پھر پیچھے چھوڑ گئے۔ باپ قوی ھیکل، تگڑا جوان تھا، دیکھنے میں ٹریکٹر ڈرائیور معلوم ہوتا تھا، صفائی کا پیوند لگا نیلا چوغہ ڈالے اور صاف دھلی ہوئی قمیص پہنے تھا۔ ماں سنولائی ہوئی رنگت کی نوجوان عورت تھی، بھنچے ہوئے ہونٹ اور سوجی ہوئی آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ ابھی ابھی خوب رو دھوکر آئی ہے۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے جو کچھ کہا وہ بہت دھیرے سے صرف اپنے شوہر کے سننے کے لئے کہا تھا:

''لو اب پھر ہمارے سر پر آن سوار ہوئے۔ آخر ہمیں چین سے رہنے کیوں نہیں دیتے؟ ذرا تم بھی خوب مزہ چکھانا فیدیا، سمجھے؟''

ریچھ نما فیدیا نے پسینے میں شرابور اپنے ھاتھ ایک رومال سے پونچھے جو مشین کے تیل سے کالا اور چکنا تھا، شفقت کے انداز سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بھاری گرجدار آواز میں کہا:

''ساری رات تم مجھے لیکچر پلاتی رہیں اور اب پھر شروع کر دیا۔ بس اب رہنے دو۔ میں اپنا کام جانتا ہوں، تمہیں پٹی پڑھانے کی ضرورت نہیں۔ تم تو یہ کرنا کہ جب گھر واپس جاؤ تو اپنے جتھے کے لیڈر سے کہنا کہ گنی‌لوٹی لوگ کے پاس سے گذرتے ہوئے ہم نے جو دیکھا تھا ویسے اگر وہ بھوسے کا ڈھیر لگائے تو ہم اس کی کھال کھینچ کر بھس بھروا دیں گے۔ بس یہی کہنا۔ اچھا؟''

عورت نے کچھ حجت کرنی چاہی مگر اس کے شوہر نے اس کو اشارے سے منع کرکے چپ کرا دیا اور پہلے سے بھی زیادہ گرجدار آواز میں بولا:

"چپ بھی ہو جاؤ، خدا کے لئے، بس بہت بول چکیں۔ جب ہم قطار سے کھڑے ہو جائیں تو پھر سب کچھ بتا دیا جائے گا، اتنی اچھی طرح کہ تم سمجھانے کا کبھی خواب بھی نہیں دیکھ سکتیں۔"

* * *

چوک میں منبر کے سامنے فوج بھرتی ہونے والے لوگ سیدھی قطاریں لگائے کھڑے تھے۔ انہیں خیرباد کہنے ایک بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے ایک لمبے تڑنگے اور چوڑی چھاتی والے کاسک یاکوف زملیاکوف تقریر کرنے کھڑے ہوئے:

"میں خود توپچی تھا، لال چھاپہ مار رہا اور پوری خانہ جنگی کے دوران میں رہا۔ میرا بیٹا میری ہی طرح توپچیوں میں ہی لال فوج کی صفوں میں خدمت انجام دے رہا ہے۔ وہ فنستانی لڑائی میں لڑا تھا، زخمی ہو گیا تھا اور اب جرمن نازیوں سے لڑ رہا ہے۔ جرمنوں کی دغابازی مجھ سے چپ چاپ برداشت نہ ہو سکی، اس لئے میں نے درخواست دیدی کہ مجھے لال فوج میں رضاکار کی حیثیت سے بھرتی کر لیا جائے اور مجھے اسی دستے میں رکھ دیا جائے جس میں میرا بیٹا ہے تاکہ ہم دونوں مل کر نازی حرامزادوں کو جہنم رسید کریں جیسے بیس برس ہوئے سفید گارڈوں کے حرامزادوں کو جہنم رسید کیا تھا۔ لڑائی میں میں کمیونسٹ بن کر جانا چاہتا ہوں، میں پارٹی تنظیم سے درخواست کر رہا ہوں کہ مجھے امیدوار میمبر بنا لیا جائے۔"

اپنی باری میں ایک پرانے صنعتی مزدور پراودینکو نے کہا:

"لال فوج میں میرے دو بیٹے ہیں۔ ایک ہوائی فوج میں ہے، دوسرا پیدل فوج میں۔ میں نے ان کو پدرانہ نصیحت یہ کی ہے کہ دشمن پر بلاترس کہانے وار کریں، یہاں تک کہ آسمان اور زمین پر ان میں سے کوئی بچکر نہ جائے۔ اور اگر مدد کی ضرورت ہوئی تو میں خود اپنی بندوق سنبھال لونگا، اور پرانے زمانے کی طرح خود انہیں بھون کر رکھ دونگا۔"

* * *

سرمائی گیہوں کے گھنے اور شوخ سبز رنگ کے بودے سرکنڈوں کی اونچی باڑ کی مانند کھڑے تھے۔ رئی کے بودے قد آدم سے بھی اونچے تھے۔ ان کی بھرتی بھری نیلگوں بالیاں اپنے ہی وزن میں جھکی پڑ رہی تھیں اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ جھولتی جا رہی تھیں۔

سڑک پر ایک سوار نمودار ہوا۔ کار کو راستہ دینے کے لئے وہ رئی کے کھیت میں مڑ گیا اور فوراً ہی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ نہ گھوڑا نظر آ رہا تھا نہ سوار کی سفید قمیص۔ صرف اس کی کاسکی ٹوپی کا سرخ فیتہ دکھائی دے رہا تھا جو ہرے پس منظر میں ایسے لگ رہا تھا جیسے رئی کی ہری بھری لہروں میں گوکھرو کا لال پھول کھلا ہو۔

ہم نے کار روک لی اور رئی کے کھیت سے نکل کر سوار ہم سے بات کرنے آیا:

"دیکھئے نا، کتنی حسین فصل ہوئی ہے اب کے برس!" اس نے رئی کے کھیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور اب اسکو اس ہٹلر حرامزادے سے خطرہ ہے، لعنت اس کے جنم پر! پچھتائیگا کہ ہائے، میں نے یہ لڑائی کیوں شروع کی۔ ضرور پچھتائیگا۔ ساتھیو، میں دو دن سے گھر نہیں گیا، میرا تمباکو ختم ہو گیا، ذرا ایک سگریٹ تو دیجئے، ہے آپ کے پاس؟ اور لڑائی کی کوئی نئی تازہ خبر سنائیے۔"

ہم نے اسے تازہ ترین اعلامیئے کی تفصیل بتائی جسے سنتے ہوئے، وہ اپنی سفید موچھوں پر انگلیاں پھیرتا رہا اور پوچھا:

"ہمارے نوجوان جم کر لڑ رہے ہیں، ہے نا؟ اور اس وقت کیا ہوگا جب ہمیں، تین جنگوں کے آزمودہ کاروں کو طلب کیا جائیگا؟ ان نازیوں کو ناف تک چیر کر پھینک دینگے، جہاں تک ان حرامزادوں کی دائیوں نے رگ میں گرہ لگائی تھی۔ میں سچ کہتا ہوں وہ پچھتائیں گے!"

کاسک گھوڑے سے اتر آیا، پالتی مار کر زمین پر بیٹھ گیا اور ہم نے جو سگریٹ دی تھی اس کو ہوا کی طرف سے پیٹھ موڑ کر جلانے لگا، مگر لگام ہاتھ سے نہیں چھوڑی۔

"تمہارے فارم میں کام کیسا چل رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس جنگ کے بارے میں بوڑھے کاسکوں کا کیا کہنا ہے؟"

"ہم نے تو حساب یہ لگایا ہے کہ پہلے بھوسا بنائیں گے اور پھر رئی اور گیہوں کاٹ کر ٹھیک ٹھاک کرلیں گے۔ لیکن اگر لال فوج کو ہماری ضرورت اس سے پہلے ہوگی تو ہم ہر وقت تیار ہیں۔ عورتیں ہمارے بغیر ہی سارا انتظام کر لیں گی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں ہم نے وقت ضرورت کے لئے انہیں ٹریکٹر چلانا، فصل کاٹنے کی کمبائنیں چلانا سب سکھا دیا ہے۔ سوویت حکومت بھی جاگ رہی

ہے، سونے کا موقع نہیں ہے،، اس نے شرارت سے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ''یہاں میدانوں میں زندگی بظاہر پرسکون ضرور معلوم ہوتی ہے، مگر کاسکوں نے پرسکون زندگی کی کبھی جستجو نہیں کی اور کبھی کسی کی آڑ لینے کی کوشش نہیں کی۔ ہم بخوشی یہ لڑائی لڑیں گے۔ اس حرامزادے ہٹلر پر لوگ تاؤ کھائے بیٹھے ہیں۔ لیکن اس کو ہو کیا گیا ہے، کیا وہ جنگ کا دیوانہ ہے یا کیا؟،،

وہ چپ چاپ بیٹھا سگریٹ پیتا رہا اور چین سے گھاس چرتے ہوئے اپنے گھوڑے کو کن انکھیوں سے دیکھتا بھی جاتا۔

''پچھلے اتوار کو جب میں نے جنگ کے بارے میں سنا تو جیسے اندر ہی اندر اتھل پتھل سی مچ گئی۔،، اس نے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''اس رات میں بالکل بھی نہ سو سکا۔ پڑے پڑے سوچتا رہا پچھلے سال فصلوں کے کیڑوں مکوڑوں نے ہم پر حملہ کیا تھا اور امسال ہٹلر نے۔ کوئی نہ کوئی جھنجھٹ لگی ہی رہتی ہے۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ ہٹلر کس قسم کا موذی کیڑا ہے جو اچھل اچھل کر ہر ایک کو کاٹ رہا ہے اور کسی کو چین نہیں لینے دے رہا؟ اور پھر مجھے پہلی جرمن جنگ یاد آگئی جس میں میں آخر تک لڑا اور مجھے یاد آیا کہ کس طرح میں نے دشمن کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے... میں نے اس ہاتھ سے آٹھ کا کام تمام کیا تھا اور سب کا حملوں کے دوران۔،، کاسک جھینپتے ہوئے مسکرایا اور آواز دھیمی کر لی۔ ''آجکل میں اسکا بہ آواز بلند ذکر کر سکتا ہوں، لیکن پہلے کچھ عجیب سا لگتا تھا... اس جنگ میں میں نے سینٹ جارج کی دو صلیبیں جیتی تھیں اور تین تمغے۔ کوئی مفت میں تو انہیں میں نے اپنے سینے پر نہیں لگوا لیا تھا، کیوں؟ جی نہیں۔ اور میں بستر میں پڑے پڑے پچھلی جنگ کی باتیں سوچ رہا تھا اور اچانک یاد آیا کہ میں نے کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ خود ہٹلر اس جرمن جنگ میں موجود تھا۔ اور میرے دل میں غم و اندوہ کی ایک ایسی چبھن ہوئی کہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بہ آواز بلند کہنے لگا: 'وہ ملعون ان آٹھ میں کیوں نہ ہوا جو میرے ہاتھ سے مارے گئے؟ تلوار کا بس ایک وار ہی میں نے کیا ہوتا اور وہ دو نیم ہو جاتا۔' بیوی جاگ اٹھی اور مجھ سے پوچھنے لگی: 'بڑبڑا کس پر رہے ہو؟' میں نے جواب دیا: 'ملعون، مردود ہٹلر پر! تم سو جاؤ، ناستاسیا، یہ ساری باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئینگی۔'،،

کاسک نے مسل کر اپنی سگریٹ بجھائی اور ایک ہی جھکولے میں گھوڑے پر سوار ہوگیا۔

''خیر، کوئی حرج نہیں، اس ملعون کا جو حشر ہونا ہے وہ تو ہو کر رہیگا۔،، اس نے لگام سمیٹ کر ہاتھ میں لی اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولا: ''اگر تمہارا اتفاق ماسکو جانے کا ہو، تو وہاں کہدینا کہ ہر عمر کے ڈان کاسک اپنا فرض بجا لانے کو تیار ہیں۔ اچھا، خدا حافظ، جلدی چلوں، نسوانی شہربود کو بھوسا بنانے میں مدد دوں۔،،

اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ایک ہی لمحے میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے گھوڑے کے سموں کی اڑائی ہوئی دھول کے مرغولوں نے زرخیز وادی کے اتار پر ہمیں دکھایا کہ وہ کس راہ گیا ہے۔

* * *

اس شام موخوفسکی گاؤں سوویت کے سامنےوالی برساتی میں اجتماعی فارم کے کچھ کسان جمع تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کا، پچکے ہوئے گالوں والا آدمی جسکا نام کزنیتسوف تھا، بول رہا تھا اور میری نگاہ اس کے گھٹنوں پر رکھے ہوئے بڑے بڑے، کام کرنے کی وجہ سے کھردرے ہاتھوں پر پڑی۔

''...جب میں ان کے ہتھے چڑھا تو زخمی ہو چکا تھا۔ جیسے ہی میری حالت کچھ سدھری ویسے ہی انہوں نے مجھے کام پر لگا دیا۔ انہوں نے ہم میں سے آٹھ کو ایک ہل میں جوت دیا اور اپنی جرمن زمین کو ہم سے جتوایا۔ اس کے بعد مجھے انہوں نے کوئلے کی کانوں میں کام کرنے بھیجدیا۔ روزانہ لدائی کا کوٹا آٹھ ٹن کوئلہ تھا اور ہم بمشکل دو ٹن لاد پاتے تھے۔ جب ہم کوٹا پورا نہ کرتے تو مار پڑتی۔ وہ ہمکو دیوار کی طرف منہ کراکے کھڑا کر دیتے اور گدی پر دوہتڑ مارتے جس سے ناک دیوار پر لگ کر زخمی ہو جاتی۔ اس پٹائی کے بعد ہمیں خاردار تاروں کے پنجروں میں بند کر دیا جاتا۔ پنجرے اتنے نیچے تھے کہ اکڑوں بیٹھنا پڑتا تھا۔ اس طرح دو کبھی رہنے کے بعد حالت یہ ہو جاتی کہ ہمیں کریدنی سے گھسیٹ گھسیٹ کر باہر نکالنا پڑتا۔ رینگ رینگ کر چلنے کی بھی سکت نہ ہوتی۔،،

کزنیتسوف نے ایک نگاہ سامعین پر ڈالی اور اسی پرسکون انداز میں

سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”ذرا میری طرف دیکھئے: ہڈی سے چمڑا لگا ہوا ہے اور بیمار ہوں مگر وزن ۷۰ کلوگرام ہے۔ لیکن اس قید خانے میں میں نے جو ڈھائی سال گزارے اس کے دوران میں میرا وزن ۸۰ کلوگرام سے کبھی زیادہ نہیں ہوا۔ یہ حشر کیا انہوں نے میرا۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا:

”اس وقت میرے دو بیٹے نازیوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ میں ان سے اپنا حساب بھی صاف کر لوں۔ لیکن لوگو، میں معافی چاہتا ہوں کہ میرا ارادہ انہیں قیدی بنانے کا نہیں ہے۔ یہ میں کر ہی نہیں سکتا۔“

سامعین پر ایک گہری، چوکنی خاموشی چھا گئی۔ بادامی رنگ کے رہ رہ کر پھڑکتے ہوئے اپنے ہاتھوں پر سے آنکھیں اٹھائے بغیر کزنیتسوف نے اور بھی دھیمے لہجے میں کہا:

”لوگو، میں معافی ضرور چاہتا ہوں... مگر انہوں نے میرے جسم کی ساری توانائی، آخری رمق تک، نچوڑ لی۔ اگر میں لڑائی پر گیا تو چاہے ان کے جوانوں کو تو قیدی بنالوں، مگر ان کے افسروں کو، ہرگز نہیں۔ ایسا میں کر ہی نہیں سکتا، اور بس۔ سب سے زیادہ وحشتناک تکلیفیں مجھے ان افسر حضرات کے ہاتھوں برداشت کرنی پڑیں، اس لئے آپ مجھے معاف کر دیں...“

وہ اٹھ کھڑا ہوا — لمبا تڑنگا، سوکھا سا آدمی، جسکی آنکھیں اچانک زیادہ روشن، زیادہ جوان معلوم ہونے لگی تھیں، نفرت کی آگ سے۔

* * *

جنگ کے دوسرے دن واشچائیفسکی اجتماعی فارم کا ہر مرد، اور بچہ کام کرنے کے لئے آ گیا۔ بہت بوڑھے لوگ بھی جنہیں عرصہ ہوا کام کرنے سے مہلت مل چکی تھی ہاتھ بٹانے نکل آئے تھے۔ غلہ پچھوڑنے کے فرش صاف کرنے کا سارا کام بوڑھے آدمیوں اور بوڑھی عورتوں کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ ایک بڈھا بھونس اسٹول پر بیٹھا، لرزتی ہوئی ٹانگیں خوب چوڑی کر کے پھیلائے، ایک بیلچے سے فرش کھرچ کھرچ کر صاف کر رہا تھا۔

”بیٹھے بیٹھے کیوں کام کر رہے ہو، دادا؟“ میں نے پوچھا۔

”میری کمر سے جھکا نہیں جاتا، بیٹا، بیٹھے بیٹھے بڑے مزے میں ہوں۔“

وہیں ایک بوڑھی عورت نے اس سے کہا: ”تم کیوں واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟ ہم اپنے آپ سب کچھ کر لیں گے۔“

اس پر بڑے میاں نے اپنی بےرنگ، بچوں جیسی آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور جھلا کر جواب دیا:

”میرے تین پوتے اس جنگ میں لڑ رہے ہیں، مجھے جیسے بڑے ان کی مدد کرنی ہی چاہئے۔ اور مجھے نصیحت کرنے کے لئے تم مجھ سے بہت چھوٹی ہو۔ میری عمروں کی ہو جاؤ تو کر لینا مجھے نصیحت جتنا جی چاہے۔“

* * *

ڈان کاسکوں کے دل پر دو جذبے غالب ہیں: اپنی مادروطن سے محبت اور نازی حملہ آوروں سے نفرت۔ محبت رہتی دنیا تک جاگزیں رہیگی لیکن نفرت دشمن کا مکمل صفایا ہونے تک ہی قائم رہے۔

یہ نفرت اور عوام کے جوشِ انتقام کو ابھارنے والوں پر لعنت!

۱۹۴۱ء

کاسک اجتماعی فارم

ڈان کے بےکنار کھیتوں میں فصل کی کٹائی پورے زورشور سے جاری تھی۔ ٹریکٹر گرج رہے تھے، گڑگڑا رہے تھے اور فصل کاٹنے کی مشینوں پر دھواں رئی کے سفیدی مائل غبار کے ساتھ ملکر چھایا ہوا تھا۔ اونچی گھنی رئی کو کاٹتے ہوئے مشین گھومتے ہوئے پھرا رہی تھی۔ بظاہر یہ منظر پرامن تھا لیکن ہر چیز پر جنگ کی سنجیدگی کا ٹھپہ تھا۔ لوگ اور مشینیں جس رفتار سے کام میں مصروف تھے وہ مختلف تھی، اس کی دھن تیز تھی اور پہلے سے زیادہ ایک تشنجی کیفیت طاری تھی۔ ساحل ڈان کے سرخی مائل سنہری گیہوں جو گلوں میں سے لائے گئے تھے گاؤں کے چوک میں لمبی لمبی رسیوں سے بندھے ہنہنا رہے تھے۔ دھوپ میں سنولائے ہوئے نوجوان سوار، دوہلی جرانی نوبتن بھرتی کے مرکزوں کی طرف چلے جا رہے تھے اور عورتیں جو کھیتوں میں پولیاں باندھ رہی تھیں اٹھ کر سیدھی کھڑی ہو جاتیں اور دیر تک ہاتھ ہلا ہلا کر چیخ چیخ کر کہتیں: ”صحیح سلامت آؤ، کاسکو! تقدیر تمہارا ساتھ دے! نازی زہریلے سانپ کا سر کچل دینا۔ اور بودیونی کو ڈان والوں کا سلام کہنا!“

اناج کے ذخیروں کی طرف جانے والی سڑکوں پر نئی فصل کے اناج کے بوروں سے لدے ہوئے اور بہترین قسم کی، بہار کی نئی پیاز جیسی ہری بھری، بارش کے ایک قطرے سے بھی محفوظ گھاس کے جھومتے ہوئے پہاڑ کے پہاڑ بار کئے چھکڑوں کے کاروان چلے آ رہے تھے۔ لال فوج کو ہر چیز کی ضرورت تھی۔ اور سب کچھ لال فوج کے لئے کیا جا رہا تھا۔ تمام لوگوں کا دھیان وہیں، محاذ پر لگا تھا۔ اور تمام دلوں میں ایک خواہش دھڑک رہی تھی: نازی زہریلے سانپ کی کمر جلدی سے جلدی ٹوٹ جائے۔

ایک بوڑھا کاشتکار جو گیہوں کی بالی انگلیوں سے مسلتے ہوئے مسکرا رہا تھا بولا:

"خود قدرت ہمارے حق میں اور ہٹلر کے خلاف ہے، صرف انگلستان اور دوسری ہوشیار قومیں ہی نہیں جو ہماری اتحادی بن گئی ہیں۔ اب کی فصل ہی کو دیکھ لیجئے، معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پریوں کی کہانی کی بات ہو۔ گندم کی بالیاں بانس کی طرح موٹی ہو جاتی ہیں، اور آلو چھکڑوں کے پہیوں کے برابر۔ گندم، سورج مکھی اور باجرے کو کٹائی سے ذرا پہلے بارش کی ضرورت ہوتی ہے اور بارش ہوئی۔ یہ ساری فصلیں آنکھوں کو تراوٹ پہنچا رہی ہیں! ہر چیز ہمارے حق میں ہے۔"

"بالشیویتسکی پوت" پنچائتی فارم میں میں نے فصل کاٹنے کی کمبائن کے آپریٹر پیوتر زیلینکوف سے بات چیت کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ رئی کے کھیت کے پہلے ہی ہیکٹر سے ۲۰۸ ٹن اناج کمبائن کے ذخیرے لے پہنچا اور بڑی بات یہ کہ سیلن نسبتاً کم تھی اور کوڑا بھی برائے نام۔ کہیں کہیں تو پیداوار تین ساڑھے تین ٹن فی ہیکٹر تک پہنچ گئی تھی۔

آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ زیلینکوف کو فصل کاٹنے کی اپنی مشین خالی کرنی پڑتی تھی۔ اور اس کے رکنے سے پہلے مجھے انتظار کرتے رہنا پڑتا تھا۔ آرام کے اس مختصر وقفے کے دوران میں وہ اپنی مشین سے اتر پڑتا، ایک نظر مشین کے ذخیرے پر ڈالنے کے بعد کٹے ہوئے پودوں کے نوکیلے ٹھنٹھ پار کرکے کچھ فاصلے پر جا کر سگریٹ پینے لگتا۔

"تمہیں اگر محاذ پر جانا پڑ جائے تو تمہاری جگہ لینے کو کوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ضرور ہے۔"

"کون؟"

"میری بیوی۔"

"تمہیں یقین ہے وہ یہ کام کر سکیگی؟"

زیلینکوف کے چہرے پر جو دھول کی ایک باریک تہ جم جانے کی وجہ سے قدرے کالا پڑ گیا تھا مسکراہٹ پھیل گئی۔ جو نوجوان عورت پہیہ گھما رہی تھی کٹہرے پر جھک کر بولی:

"میں زیلینکوف کی بیوی ہوں۔ یہ کام میں عارضی طور پر کر رہی ہوں، اور پچھلے سال میں نے کمبائن آپریٹری کی تھی اور اپنے شوہر سے زیادہ کمایا تھا۔"

ظاہر ہے زیلینکوف کو یہ یاددہانی بری لگی اور اس نے قدرے بےدلی سے کہا:

"اگر وقت ہی آن پڑے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ میری جگہ کام کرلے۔ لیکن ہمارے منصوبے کچھ اور ہی ہیں۔ ہم دونوں محاذجنگ پر ساتھ ساتھ جانا چاہتے ہیں..."

مارینا زیلینکووا فطرتاً ایسی عورت نہیں تھی جو شوہر ہی کو ساری باتیں کر لینے دیتی۔ چنانچہ میاں نے جو بات کہنی شروع کی تھی وہ بیوی نے ختم کی:

"چونکہ ہمارے ہاں بچے نہیں ہوئے اس لئے ہم دونوں ساتھ ساتھ محاذ جنگ پر جا سکتے ہیں۔ اور میں ٹینک چلانے میں اپنے شوہر سے کچھ ہیٹی نہیں رہونگی، اس کی آپ ہرگز فکر نہ کریں!"

زیلینکوف لپک کر اپنی کمبائن میں چلا گیا کیونکہ گپ شپ میں ضائع کرنے کو اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ فارم کے ۵۳۰ ہیکٹر کے اس رقبے سے جس میں رئی کی کاشت کی گئی تھی ۴۱۷ میں فصل کی کٹائی مشینی ہنسیوں سے ہو چکی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ جو وقت ضائع ہو گیا ہے اس کو کسی نہ کسی طرح پورا کر لیں۔

اس مرتبہ روستوف علاقے کے بیشتر اجتماعی فارموں نے معمولی مشینی ہنسیوں کو وسیع پیمانے پر استعمال کیا تھا۔ فصل کاٹنے کی کمبائنوں کے لئے اناج اچھی طرح پک جانے کا انتظار کئے بغیر انہوں نے سادہ مشینی ہنسیوں سے کام شروع کر دیا، فصل کی کٹائی کی رفتار بہت بڑھ گئی اور ایندھن کی بھی بڑی بچت ہوئی۔ اس کے متعلق "استالینیتس" اجتماعی فارم کے ایک آدمی نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا:

''اجتماعی فارم قائم ہو گئے تو ہم نے پسینہ بہانا چھوڑ دیا۔ سوویت حکومت نے ہمیں کمرتوڑ محنت سے نجات دیدی۔ اور اب یہ نوجوان جو مشینیں ہنستے چلاتے ہیں دن بھر کا کام کمر کے درد کی شکایت کئے بغیر نہیں کر سکتے! لاڈ کے بگاڑے ہوئے ہیں، اور نہیں تو کیا! امن کے زمانے میں سب ٹھیک تھا کہ ٹریکٹر ہمارے لئے کھیتوں میں جتائی کریں، اور فصل کاٹنے کی کمبائنیں اناج کاٹیں اور غلہ پچھوڑیں، لیکن اب جبکہ نازیوں نے ہم سے لڑائی شروع کر دی ہے تو یہ کمر میں درد کی شکایتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ اب کام کرنے کا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ جسم کا ایک ایک جوڑ اپنا کام کرے اور ایندھن جتنا ہو سکے لال فوج کے لئے بچایا جائے جسے اسکی ہم سے زیادہ ضرورت ہے۔ اسے وہ اتنی اچھی طرح استعمال کریگی کہ نازیوں کا جوڑ جوڑ نہ صرف چٹخ جائیگا بلکہ چرمرا کر رہ جائیگا۔''

قریب قریب یہی بات مجھ سے واسیلی سولداتوف نے کہی جو ''چھبیس باکو کمیسار'' اجتماعی فارم میں کام کرتے ہیں اور جنہوں نے بوریوں کی تھپی جمانے کا روز کا کام کوٹے سے دگنا پورا کیا تھا۔

''ہمارا دشمن سخت جان اور اڑیل ہے اس لئے ہم کو بھی سخت جان اور اڑیل بن کر کام کرنا چاہئے۔ اور کوٹا... کوٹا تو ہم کو یہاں حد سے زیادہ پورا کرنا چاہئے لیکن جب ہمیں محاذ جنگ پر بھیجدیا جاتا ہے تو دشمن پر دھاوا بولنے ہم کوئی کوٹا مقرر کئے بغیر ہی جائیں گے۔''

جن اجتماعی فارموں کا میں نے دورہ کیا ان سب میں محنت کے نظم و ضبط سے، اور اپنے شہری فرائض کا لوگوں میں جو احساس ہے اس سے میں بڑا ہی متاثر ہوا۔ ایک ایک فرد کام کرنے آتا — جوان، بوڑھے اور یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو پچھلے سال ہی اس قدر بڑھا محسوس کرنے لگے تھے کہ کام نہیں کر پاتے تھے۔ بلااستثنا ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ کام کرتا اور بے پناہ جوش و خروش کے ساتھ۔ ''بالشیوستسکی پوت'' اجتماعی فارم میں جتھے کے ایک لیڈر واسیلی تسپلی کوف نے ضلع کمیٹی کے ایک عہدیدار سے تعریف سننے کے بعد یہ کہا:

''اپنی سی بہترین کوشش سے کم تو ہم کام کر ہی نہیں سکتے۔ میرا نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ فی الحال ہم اپنی محنت سے ملک کا دفاع کر رہے ہیں اور جب وقت آئیگا تو ہتھیار لیکر اس

کی مدافعت کو تیار ہو جائیں گے۔ پھر بہرحال اس صورت میں بے دلی سے بھلا کون کام کریگا جبکہ قریب قریب ہر کنبے کا کوئی نہ کوئی فرد محاذ جنگ پر لڑ رہا ہے۔ اب میری ہی مثال لیجئے۔ میرے دو بیٹے ہیں اور دونوں لڑائی پر گئے ہوئے ہیں۔ الیکسئی توپچی ہے اور نکولائی ٹینک چلاتا ہے۔ محاذ پر جانے کے لئے میں زیادہ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ لیکن پھر بھی ہوم گارڈوں میں میں نے اپنا نام لکھوا لیا ہے۔ پچھلی جرمن جنگ میں میرے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ اس جرمن زخم نے مجھے بڑی تکلیف پہنچائی تھی۔ لیکن کام میں اب بھی کر سکتا ہوں... اگر ضرورت پڑی تو لڑائی میں میں اپنے بیٹوں سے جا ملوں گا۔''

جب انہیں پتہ چلا کہ میں ''کراسنایا زویزدا'' (ایک فوجی اخبار) کے لئے مضمون لکھنے والا ہوں تو بڑے اشتیاق کے ساتھ کہا:

''میرے لڑکوں اور محاذ جنگ پر لڑنے والے تمام لوگوں کو اپنے اخبار کے ذریعے مطلع کر دیں کہ یہاں، عقب میں ہم کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ ان سے کہئے کہ نازیوں پر ذرا ترس نہ کھائیں، ان کا جینا اس طرح محال کر دیں کہ ہماری سرزمین پر انہیں اپنی قبروں کے علاوہ کچھ نہ ملے۔''

جب ہم ''پوت کے سوتسیالزمو'' اجتماعی فارم کے دفتر پہنچے تو ایک بوڑھے کھاتہ نویس کے علاوہ وہاں کسی کو نہ پایا۔ اس نے بتایا کہ فارم کے صدر کھیتوں میں کام کرنے گئے ہوئے ہیں۔ گاؤں کے اندر آدم تھا نہ آدم‌زاد: پوری آبادی فصل کاٹنے، غلہ پچھوڑنے کے فرش صاف کرنے یا اناج لادنے میں لگی ہوئی تھی۔

کھاتہ نویس نے ایک لمحے کے لئے اپنا قلم میز پر رکھتے ہوئے کہا: ''میرا بیٹا مغربی محاذ پر ہے۔ تین سال تک وہ فوج میں عملی خدمات پر مامور رہا، توپچیوں کے ایک دستے کا کمانڈر تھا۔ میں اسے خط لکھتا تو پوچھتا کہ اس کی توپ کس قسم کی ہے اور جواب میں وہ لکھا کرتا: 'میں اچھی طرح سے ہوں، گھر میں سب کو سلام کہئے اور توپوں کے بارے میں مجھ سے مت پوچھا کیجئے۔ ابا، اس سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔'' کھاتہ نویس کی باچھیں مارے خوشی کے کھلی جا رہی تھیں۔ ''مطلب یہ کہ اسے قاعدے قانون اچھی طرح معلوم ہیں۔ خانہ جنگی کے دنوں کی لڑائی میں میں نے بھی حصہ لیا تھا۔ پہلے شمال میں لڑنے گیا، پھر ''باسماچی'' ٹولیوں کے

خلاف اور ہر وضع قطع کے دشمنوں کے خلاف لڑنے گیا۔ اب میں ہوم گارڈ میں ہوں۔ گاؤں میں ہم کوئی ایک سو ہیں۔ آج کل بڑا عجیب معاملہ ہے۔ یہاں عقب میں بہت سارے نوجوان بھی ہیں۔ جب ہم ہوم گارڈ قطاریں لگا کر کھڑے ہوتے ہیں تو بوڑھوں میں بہت سے نوجوان بھی ہوتے ہیں؛ اتنے طاقتور کہ توپ گھسیٹ لے جائیں۔ گھوڑوں کی طاقت ہے ان میں، سچ مچ ہے۔ انہوں نے رضا کاروں میں نام لکھوا رکھے ہیں لیکن کسی وجہ سے ان کا بلاوا ابھی تک نہیں آیا ہے۔ اس کے معنے ہیں ہماری فوج بہت بڑی ہے۔ یہ سوچ کر دل کو بڑا ہی اطمینان اور سکون ملتا ہے۔"

جتھہ نمبر ۲ فصل کاٹ رہا تھا۔ فصل کاٹنے کے ایک ایک آلے میں دو دو بیل جتے ہوئے تھے اور پودے کاٹنے کے پھلوں کو پوری اونچائی تک اٹھا دیا گیا تھا مگر آگے بڑھنا مشکل ہو رہا تھا کیونکہ رئی بہت اونچی اور گھنی تھی۔ بیل ہانکنے والی عورتیں بہت خوب للکارتیں، کوڑے سے چلاتیں اور کڑیل نوجوان کاسکوں کو جو کٹے ہوئے پودے جیلی سے جمع کر رہے تھے اس قدر تیزی سے کام کرتے ہوئے بڑھنا پڑ رہا تھا کہ ان کو اتنی مہلت نہیں مل رہی تھی کہ اپنے منہ پر بہتا ہوا پسینہ پونچھ ڈالیں۔ آخرکار جب وہ لوگ ذرا دم لینے رکے تو میں ان کے پاس گیا اور پوچھا کہ بیلوں کو اس تیز رفتاری سے کیوں دوڑا رہے ہیں۔

"یہ بیل اس کے عادی ہیں، ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچیگا"، ان میں سے ایک کاسک نے جواب دیا۔ "کام جب تیزی سے ہو تو ہمیں آسان معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر ہمیں عجلت تو کرنی ہی چاہیئے، کیا پتہ محاذ پر جانے کا کب بلاوا آجائے اور عورتوں کے لئے اس طرح فصل کا کام سنبھالنا پھر مشکل ہو جائیگا۔ اچھا، بتائیے تو، مجھے کیوں بھرتی نہیں کرتے یہ لوگ؟ میری عمروں کے اوروں کو تو بھرتی کر لے گئے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے چھوڑ گئے۔ کیا میں دوسروں سے کسی بات میں ہیٹا ہوں، یا کیا بات ہے؟"

اس شخص کا نام پوکوسائیف تھا اور وہ مقامی لوہار کا بیٹا تھا۔ فوجی خدمت کے زمانے میں یہ تگڑا جوان جس کا چوڑا چکلا سینہ پیپے کی مانند تھا، توپخانے میں کام کر چکا تھا۔ دوسروں سے بات چیت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ سب کوئی نہ کوئی فوجی خدمت انجام دینے کی تربیت حاصل کر چکے تھے اور ان طاقتور اور صحتمند نوجوانوں

کی بےقراری میری سمجھ میں اچھی طرح آ رہی تھی کہ جائیں اور جا کر جرمنوں کو جو خون بہانے اور سستی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد بدمست ہو گئے تھے، اچھی طرح مرمت کریں۔ یہ وہ بےقراری تھی جو ڈان کے تمام نوجوان کاسکوں میں مشترک تھی، ان لوگوں کی بےقراری جن کے پرکھے صدیوں سے ہمارے ملک کی سرحدوں کو بیشمار دشمنوں سے حفاظت کرتے ہوئے اپنے خون سے سینچتے آئے تھے۔

مجھے تراسی‌ساله ایسائی مارکووچ پولانتیف کی باتیں یاد آئیں جو فارم پر اناج پچھوڑنے کے صحن میں پہریداری کرتے ہیں۔ جولائی کی پرسکون رات تھی، تاریک آسمان پر ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ وہ بوڑھے آدمی کی نحیف آواز میں بول رہے تھے:

"میرے دادا نپولین کے خلاف لڑے تھے اور جب میں چھوٹا سا تھا تو انہوں نے یہ قصہ مجھکو سنایا تھا۔ ہمارے خلاف جنگ شروع کرنے سے پہلے نپولین نے ایک خوشگوار دن اپنے جرنیلوں کو ایک وسیع میدان میں جمع کیا اور ان سے کہا: 'میرا خیال ہے کہ روس کو فتح کر لوں۔ جرنیل صاحبان، اس کے بارے میں آپ حضرات کی کیا رائے ہے؟' اور ان سب جرنیلوں نے بیک‌آواز کہا: 'ایسا نہیں ہو سکتا اعلحضرت، یہ بڑا ہی زبردست، طاقتور ملک ہے، اس کو ہم کبھی بھی فتح نہیں کر سکتے۔' پھر نپولین نے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا: 'دیکھو وہ ستارہ نظر آ رہا ہے؟' 'نہیں' جرنیلوں نے جواب دیا 'ہمیں تو نظر نہیں آرہا۔ دن میں ستارہ دکھائی نہیں دیتا'۔ نپولین نے ان سے کہا: 'مگر مجھے دکھائی دے رہا ہے۔ یہ ستارہ نیک شگون کا ہے۔' اور پھر اس نے اپنی فوجیں لیکر ہمارے ملک پر چڑھائی کر دی۔ وہ ایک عالیشان دروازے سے داخل ہوا اور ایک چھوٹے سے، نہایت تنگ دروازے سے جس میں سے وہ بمشکل نکل پایا تھا، واپس گیا۔ ہمارے لوگ اس کو یہاں سے لیکر پیرس تک پہنچانے گئے۔ لگتا ہے اس جرمن کمانڈر کو وہی بےتکا ستارہ دکھائی دے گیا ہے اور جب اس کے ہوش ٹھکانے لگا دئے جائیں گے اور اس کو جب اتنے تنگ دروازے سے نکل کر بھاگنا پڑیگا تو معلوم نہیں اس میں سے نکل بھی پائیگا یا نہیں۔ خدا سے امید ہے کہ وہ نکل نہ پائیگا۔ تاکہ دوسرے پھر کبھی بھی ایسی حرکت نہ کریں۔"

۱۹۴۱ء

میدان جنگ سے فوجی اطلاع ملی ہے: ''یلنیا گاؤں کے نزدیک گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ جرمنوں نے گھروں کے سامنے قلعہ بندیاں بنا لی تھیں اور ان کو ڈھانک کر چھپا دیا تھا اور دیر تک وہیں سے آتش باری کا جواب دیتے رہے۔ جب ہمارے دستے نے حملہ شروع کیا تو نازیوں نے تمام عورتوں اور بچوں کو گھروں سے باہر نکال لیا اور ان کو اپنی خندقوں کے سامنے لے آئے...''

یہ ہٹلر کی فوج کے سپاہیوں کی حرکت تھی جنہیں نازی ریڈیو بہادر اور شریف کہہ کہہ کر تعریفوں کے پل باندھتا تھا۔ انکی جیسی ''شرافت'' سے سڑاند پھوٹتی ہے۔ اور یہ سوچے بغیر نہیں رہا جاتا: اگر یہ سپاہی زندہ بچ رہے تو اپنی ماؤں، بیویوں اور بہنوں کے روبرو کیا انہیں شرم نہیں آئیگی؟

نازیوں نے جب اپنی تبلیغ سے عقیدہ بدلا تو ان کو شاید سخت کام کرنا پڑا ہوگا تاکہ اپنے فوجیوں کا قلب اس قدر پلٹ دیں کہ انسانیت کے سارے جذبات سلب ہو جائیں۔ اور پوری ذی حیات مخلوق کو انسانیت سوز وحشیانہ کام انجام دینےوالے خودکار آلوں میں تبدیل کردیں۔

مجھے نہیں معلوم یلنیا میں نازیوں کی اس حرکت کو گوئبلز کی زبان میں کیا کہا جائیگا — فوجی فراست یا جرمن خوش تدبیری — لیکن دنیا کی تمام مہذب قوموں کی زبان میں ایسی حرکت کو جو ہر فوجی کے لئے باعث رسوائی ہوتی ہے، ہمیشہ باجی پن کہا جائیگا۔ اس نئی نازی ظالمانہ حرکت کے متعلق جو بھی سنیگا اس کا ردعمل جرمن قوم کے لئے شرم کے احساس کا ہوگا، ان لوگوں سے کراہیت اور نفرت جو نہتی شہری آبادی کے پیچھے نہایت بےشرمی سے پناہ لیتے ہیں۔

سوویت یونین کے لوگ اور لال فوج نازیوں کے جرائم کا حساب رکھ رہے ہیں۔ ہمارے لوگوں کا انہوں نے جو خون بہایا ہے اس کی قیمت اور اپنی ہی بےعزتی کی قیمت بہت خون کی شکل میں ادا کریں گے۔

۱۹۴۱ء

ہمارے لینن گراد کے ساتھیو!

ہمیں معلوم ہے کہ دشمن کے محاصرے میں رہتے ہوئے آپ کے لئے زندگی بسر کرنا، کام کرنا اور لڑنا کتنا دشوار ہے۔ لوگ آپ کو ہر جگہ — ہر محاذ پر اور عقب میں یاد کرتے ہیں۔ دور افتادہ یورال میں فولادساز مزدور کو پگھلی ہوئی دھات بہتی دیکھ کر آپ کی یاد آتی ہے اور وہ بلامہلت کام کئے چلا جاتا ہے تاکہ آپ کی نجات کی گھڑی قریب آ جائے۔ لڑائی کے مورچے پر، ڈانباس میں جرمن حملہ آوروں پر وار کرنےوالا فوجی ان کو صرف اپنے تباہ و برباد یوکرین کی خاطر ہی نہیں مار گراتا بلکہ ان بےپناہ مصیبتوں کے لئے بھی جو دشمن نے، لینن گرادوالو، آپ کو پہنچائی ہیں... ہم اس گھڑی کا بےچینی سے انتظار کر رہے ہیں جب محاصرہ ٹوٹ جائیگا اور عظیم الشان سوویت دیس، لینن گراد کے — سراپا اور ابدی شان کے شہر کے — بہادر بیٹوں اور بیٹیوں کو اپنے گلے لگا لیگا۔

۱۹۴۲ء

نفرت کی سائنس

جنگ میں درختوں کا — لوگوں ہی کی طرح — اپنا اپنا نصیبہ ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ہماری توپوں کی زد میں آنے کے بعد جنگل کے ایک بڑے قطعے کے درختوں کا صفایا ہو گیا۔ جرمن جنہیں س۔ نام کے گاؤں سے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا گیا تھا، اس جنگل میں جم کر مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن درختوں کے ساتھ ان کو بھی کاٹ کاٹ کر ڈھیر کر دیا گیا۔ مردہ جرمن فوجی صنوبر کے پرخچے اڑے درختوں کے تلے دبے پڑے تھے۔ ان کی چیتھڑے اڑی لاشیں فرن کی سرسبز جھاڑیوں کے درمیان پڑی سڑ رہی تھیں اور توپ کے گولوں سے چرے ہوئے درخت کے تنوں سے آتی ہوئی رال کی مہک سڑتے گوشت کے تعفن، میٹھی میٹھی بدبو میں دب کر رہ گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود زمین سے جس میں جگہ جگہ توپ کے گولوں نے غار ڈالدئے تھے، جن کی کگریں جھلسی ہوئی، خاکستری اور سخت

معلوم ہورہی تھیں، موت و ہلاکت کی مضر بدبو پھوٹ رہی ہو۔

ہماری توپوں کے بنائے اور کھودے ہوئے اس قطعہ اراضی پر جلاد اجل کی خاموش حکمرانی تھی۔ بیچوں بیچ برچ کا ایک درخت گویا کسی معجزے سے باقی بچ رہا تھا اور اس کی مجروح شاخیں ہوا میں جھوم رہی تھیں اور نئی، چمکدار، چپچپی پتیوں میں سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔

اس قطعہ اراضی کو پار کرنے کے لئے ہم روانہ ہوئے۔ میرے آگے آگے چلتے ہوئے فوجی نے برچ کے اس درخت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پرخلوص و پرشفقت انداز میں کہا: ”بیچارہ، تو کیسے بچ رہا ہوگا؟“

صنوبر کے درخت فوراً مر جاتے ہیں، جب کوئی گولا ان کے آن کر لگتا ہے تو وہ بس بےجان ہوکر گر پڑتے ہیں، پھننگ الگ ہو کر جاپڑتی ہے، زمین پر بچھی ہوئی سوئی جیسی پتیوں پر رال بہہ بہہ کر جم جاتی ہے۔ اس کے برعکس شاہ بلوط کے درخت اتنی آسانی سے موت کا شکار نہیں ہوتے۔

ایک بےنام چھوٹی سی ندی کے کنارے شاہ بلوط کے پرانے درخت کے تنے پر ایک جرمن گولا آکر لگا۔ آدھا درخت چر مرا گیا اور گہرے زخم سے ادھڑ کر مرگیا لیکن دوسرا حصہ جو دھماکے کے زور سے ندی کی طرف جھک گیا تھا بہار میں پھر سے جی اٹھا اور اس میں نئی پتیاں نکل آئیں۔ مجھے امید ہے آج بھی اس کٹے چھنٹے معذور درخت کی نچلی ٹہنیاں دریا میں ڈبکیاں لگاتی ہوں گی اور اوپر والی اپنی تنی ہوئی تراشیدہ پتیاں بلند ہوکر سورج کی حرارت سے فیض حاصل کررہی ہوں گی...

* * *

لفٹنٹ گیراسیموف لمبے قد کا آدمی تھا۔ اس کے چوڑے چکلے شانے چیل کے بازوؤں کی طرح قدرے خمیدہ تھے۔ وہ اپنی خندق میں داخل ہونے کے راستے کے پاس بیٹھا اس روز کی لڑائی کا اور بٹالین نے جرمن ٹینکوں کے حملے کو جس طرح پسپا کیا تھا اس کا تفصیلی حال سنا رہا تھا۔

لفٹنٹ کا ستا ہوا، جذبات سے قریب قریب عاری چہرہ پرسکون تھا اور اس کی لال لال آنکھوں کے گرد تکان سے حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ بھاری اور بیٹھی بیٹھی آواز میں بول رہا تھا۔ بڑی بڑی کٹھیلی

انگلیوں کو آپس میں باربار پھنسا کر دونوں ہاتھوں کی ایک مٹھی بناتا جاتا اور یہ انداز جس سے خاموش غم یا کھری، دلسوز یادوں کا واضح اظہار ہوتا تھا اس کے قوی جثے اور اس کے چہرے سے عیاں توانائی اور مردانگی سے میل کھاتا نہیں معلوم ہوتا تھا۔

اچانک وہ خاموش ہوگیا اور فوراً ہی اس کا چہرہ بدل گیا۔ اس کے سیاہ گالوں پر زردی کھنڈ گئی۔ اس نے اپنے دانت اس قدر زور سے بھینچے کہ جبڑے کے عضلات تنی ہوئی جلد کے اندر پھڑکنے لگے۔ اس کی آنکھوں سے، جو سامنے ایک ہی جگہ گھورے جارہی تھیں، اس قدر ناقابل تسکین، خوفناک نفرت کے شعلے بھڑکنے لگے کہ بلاارادہ میری نگاہیں بھی اسی طرف اٹھ گئیں جدھر وہ دیکھے جارہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے اگلے دفاعی مورچے سے اڑے اڑے رنگ کی، قریب قریب بےرنگ وردی پہنے دوہلی ٹوپی گدی تک پیچھے سرکا کر اوڑھے ایک فوجی کی حراست میں تین جرمن قیدی چلے آرہے ہیں۔

ہمارا فوجی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس کے جچے تلے قدم کے ساتھ ساتھ کندھے پر پڑی رائفل جھول رہی تھی اور دھوپ میں سنگین چمچما رہی تھی۔ اسی سست رفتاری سے قیدی گھسٹ گھسٹ کر اپنے پیروں کو آپس میں رگڑتے ہوئے چل رہے تھے جن میں وہ زرد کیچڑ میں لت پت چھوٹے بوٹ پہنے ہوئے تھے۔

خندق کے پاس پہنچکر اس قیدی نے جو قطار میں آگے آگے چل رہا تھا — ادھیڑ عمر کا جرمن جس کے پچکے ہوئے گالوں پر داڑھی کے بھورے بال بڑھ آئے تھے — بھیڑیئے جیسے انداز میں کنانکھیوں سے ہمیں دیکھا اور اپنی پیٹی میں لٹکے ہوئے خود کو ٹھیک کرنے کے بہانے ہماری طرف سے منہ پھیرلیا۔ اس پر لفٹنٹ گیراسیموف اچھل کر کھڑا ہوگیا اور تیز تحکمانہ آواز میں نگراں فوجی پر چیخا:

”ان کو لیکر ٹہلنے نکلے ہو کیا؟ کوئیک مارچ! سنا، جلدی جلدی لیکر جاؤ، سنا تم نے؟“

لگتا تھا کہ جیسے ابھی وہ کچھ اور کہنا چاہتا ہو مگر بےپناہ غصے نے اس کا گلا دبوچ لیا اور ایڑی کے بل گھوم کر وہ دوڑتا ہوا خندق کی سیڑھیاں اتر گیا۔ سیاسی معلم جو اس موقع پر موجود تھا میری حیرت دور کرنے کے لئے دھیمی آواز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا:

”اس کے اعصاب خراب ہوچکے ہیں، اس کے بس کی بات نہیں

ہے۔ آپ کو معلوم نہیں، وہ جرمنوں کا قیدی رہ چکا ہے؟ کبھی اس سے پوچھیئے گا۔ وہاں جو جو مصیبتیں اس نے اٹھائی ہیں اس کے بعد وہ کسی جرمن کو دیکھنا برداشت ہی نہیں کرسکتا، میرا مطلب ہے زندہ جرمنوں کو۔ مردہ ہوں تو کوئی بات نہیں۔ لیکن جب جرمن قیدیوں کو دیکھ لیتا ہے تو اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہے اور وہیں بیٹھے بیٹھے اس کا زرد چہرہ پسینے پسینے ہو جاتا ہے یا پھر وہ اٹھ کر چلا جاتا ہے۔" اس نے سرگوشی کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے میرے پاس آکر کہا: "دو بار میں اس کے ساتھ حملے پر گیا۔ اس میں گھوڑے کی طاقت ہے۔ وہ کیا کچھ کر سکتا ہے یہ چیز دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے... میں نے ہر طرح کی چیزیں دیکھی ہیں مگر اسے سنگین چلاتے یا بندوق کے کندے سے ضربیں لگاتے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

* * *

اس رات جرمنوں کی بھاری توپوں نے پریشان کرنے کے لئے گولہ باری کی۔ مقررہ وقفے سے باقاعدہ گولہ باری ہوتی رہی۔ پہلے پہل دور کہیں گولے چلنے کی آواز آتی، چند لمحوں بعد ہمارے اوپر تاروں بھرے آسمان میں گولوں کی آہنی چیخ سنائی دیتی، اس کی گونج بڑھتی اور پھر رفتہ رفتہ غائب ہو جاتی اور پھر ہمارے پیچھے کہیں اس سڑک کی سمت سے جہاں دن بھر گولہ بارود محاذ پر پہنچانے والی لاریوں کا تانتا بندھا رہا تھا، زرد شعلہ چمکتا اور دھماکے کی زوردار گرج سنائی دیتی۔

بیچ بیچ میں جب کبھی جنگل پر خاموشی چھا جاتی تو ہمیں باریک آوازوں میں مچھروں کی گنگناہٹ سنائی دیتی اور خوفزدہ مینڈک قریب ہی ایک چھوٹے سے پوکھر میں سہمی سہمی آواز میں ایک دوسرے کو پکارنے لگتے۔

ہم ایک جھاڑی کے نیچے لیٹے ہوئے تھے اور لفٹنٹ گیراسیموف ٹوٹی شوٹی ٹہنی سے ان مچھروں کو بھگاتے ہوئے جو بہت ستا رہے تھے، اپنے انداز سے مجھے اپنے متعلق بتا رہا تھا۔ اپنے حافظے کے مطابق اس کا سنایا ہوا قصہ میں آپ کو بھی سناتا ہوں۔

"جنگ سے پہلے میں مغربی سائبیریا کی ایک فیکٹری میں مستری کا کام کرتا تھا۔ پچھلے سال نویں جولائی کو مجھے بھرتی کیا گیا۔

میرے کنبے میں بیوی، دو چھوٹے چھوٹے بچے اور معذور باپ ہیں۔ خیر تو جب وہ مجھے خیرباد کہنے آئے تو بیوی ظاہر ہے رو رہی تھی اور چلتے وقت ان الفاظ کے ساتھ مجھے رخصت کیا: 'ملک کی اور ہماری حفاظت اپنی پوری قوت سے کرنا۔ ضرورت پڑے تو جان بھی لڑا دینا، مگر دیکھنا جیت ہماری ہو۔' مجھے یاد ہے کہ اس کی بات پر میں ہنس دیا تھا اور کہا تھا: 'تم میری کون ہو، بیوی یا خاندان کی سیاسی معلم؟ میں خود سمجھدار ہوں، اور رہی جیت کی بات، تو تم فکر مت کرو، جرمنوں کے گلے کاٹ کر، پیٹ چیر کر بھی حاصل کرنی ہوئی تو کریں گے۔'

"میرے والد، ظاہر ہے کہ پکی مٹی کے ہیں، وہ روئے نہیں، مگر نصیحت کرنا انہوں نے بھی ضروری سمجھا: 'یاد رکھنا، وکتور، گیراسیموف نام محض ایک نام سے کچھ زیادہ ہے۔ تم موروثی صنعتی مزدور ہو۔ تمہارے پردادا استروگانوف* کے ہاں ایک مزدور تھے، اتنا پرانا خاندانی پیشہ ہے ہمارا۔ صدہا برس سے ہمارا خاندان روس کے لئے لوہا بنا رہا ہے اور اس جنگ میں تم کو بھی لوہا بن جانا چاہئے۔ ریاست نے، یاد رکھو، تمہاری ریاست نے تم کو جنگ شروع ہونے تک محفوظ فوجی افسر بنا کر رکھا ہے اور اب، دشمن کی تمہیں خوب ہی مرمت کرنی ہے، سمجھے؟' اور میں نے جواب دیا تھا: 'ایسا ہی کروں گا۔'

"ریلوے اسٹیشن جاتے ہوئے راستے میں میں ضلع پارٹی کمیٹی کے دفتر گیا۔ ہمارے سیکریٹری خاصے خشک مزاج تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر میری بیوی اور میرے والد نے الوداعی باتوں میں اتنا کچھ کہا ہے تو یہ حضرت تو لمبی چوڑی تقریر کرکے ہی دم لیں گے۔ یہ سب غلط نکلا! 'بیٹھو گیراسیموف، وہ بولے 'پرانے رواج کے مطابق روانہ ہونے سے پہلے ذرا کی ذرا بیٹھ جاؤ۔' دو ایک منٹ تک ہم چپ چاپ بیٹھے رہے اور پھر وہ اٹھے۔ میں نے دیکھ لیا کہ ان کے چشمے کے تال کچھ دھندلائے ہوئے تھے۔ خیر تو ہے، میں نے دل ہی دل میں سوچا، لوگوں کو کیا ہوگیا ہے! اور اب ہمارے سیکریٹری بولے: 'سب کچھ اتنا صاف ہے کہ زیادہ کچھ کہنے کی

*یورال کے سوداگروں اور کارخانہ‌داروں کا ایک کنبہ جس کی تاریخ سترھویں صدی تک جاتی ہے۔ (ایڈیٹر)

ضرورت نہیں، کامریڈ گیراسیموف۔ مجھے تمہارے ان دنوں کے مڑے ہوئے کان یاد ہیں جب تم نوعمر پائنیروں کی لال ٹائی باندھا کرتے تھے، کومسومول کے ممبر کی حیثیت سے تم مجھے یاد ہو اور پورے دس برس سے میں تم کو کمیونسٹ کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ جاؤ اور ان حرامزادوں کو بغیر ترس کھائے مارو۔ پارٹی تنظیم کو تم پر پورا اعتماد ہے۔'، سیکریٹری نے مجھے گلے سے لگایا، ہم نے رواج کے مطابق الوداعی بوسہ لیا اور واللہ وہ مجھے روکھے پھیکے ذرا بھی نہیں لگے... ان کا خلوص دل کو اس قدر گرما دینے والا تھا کہ دفتر سے جب باہر نکلا تو واقعی خوشی سے دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

''اور پھر میری بیوی نے مجھے خوب ہنسایا۔ آپ تو جانتے ہیں شوہر کو لڑائی پر جاتے وقت رخصت کرنا بیوی کے لئے کوئی کھیل نہیں ہوتا اور قدرتی بات ہے میری بیوی کے ہوش بجا نہیں تھے، وہ اسی کوشش میں رہی کہ مجھ سے کوئی اہم بات کہے مگر اس کے خیالات سب گڈمڈ ہو رہے تھے اور اس کو یاد ہی نہ رہتا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ ریل روانہ ہو چکی تھی۔ پلیٹ فارم پر وہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی، کھڑکی کے بالکل قریب، میرا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے اور جلدی جلدی باربار کہے جارہی تھی: 'دیکھو احتیاط رکھنا، وکتور، محاذ پر ٹھنڈ نہ لگ جائے، اچھی طرح اپنی احتیاط کرنا!' اور میں نے اسے جواب دیا تھا: 'اچھا اچھا نادیا، میں ٹھنڈ ہرگز نہ لگنے دوں گا۔ محاذ پر آب و ہوا بہت ہی اچھی اور واقعی بڑی معتدل ہے۔'، میری بیوی کی پیاری پیاری، احمقانہ باتوں نے الوداعی لمحات کے میرے تکلیف دہ درد کو رفع کردیا تھا اور جرمنوں پر تو مارے غصے کے دیوانہ ہوگیا تھا! اچھا تو دغاباز پڑوسیو، میں نے دل ہی دل میں کہا، تم نے شروع کیا ہے تو پھر اس کا خمیازہ بھگتنے کو بھی تیار ہو جاؤ! تمہارے کئے کی سزا تم کو ضرور ملیگی اور اس سے بھی زیادہ ملیگی!،،

اچانک دور کہیں دونوں طرف سے مشین گنیں چلنے کی آواز آنے لگی اور اس کو سننے کے لئے گیراسیموف چپ ہوگیا اور آتش باری کے رکتے ہی اس نے اپنا قصہ پھر شروع کردیا:

''جنگ سے پہلے ہمارے ہاں مشینیں جرمنی سے آیا کرتی تھیں۔ ہم ان مشینوں کے پرزے جب یکجا کرتے تو میں ہر پرزے کو کم از کم پانچ بار ٹٹولتا، اور کیسا پھرا کر چاروں طرف سے دیکھا

کرتا۔ واقعی ان مشینوں کے بنانے والے ہاتھ کاریگروں کے تھے اور جرمن مصنفوں کی کتابوں کو بھی میں پسند کرتا تھا اور جرمن عوام کی میرے دل میں بڑی عزت تھی۔ مانا کہ بعض اوقات یہ سوچ کر کراہیت آتی کہ ایسی جفاکش اور چابکدست قوم ہٹلر کی حکومت کو کیسے برداشت کئے ہوئے ہے، لیکن بہرحال، یہ ان کا اپنا معاملہ تھا۔ اور پھر مغربی یورپ میں جنگ شروع ہوگئی...

''چنانچہ میں محاذ جنگ کی طرف جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جرمنوں کے پاس طاقتور مشینیں ہیں، اور ان کی فوج بھی کچھ معمولی نہیں ہے۔ میں نے سوچا: ایسے دشمن سے دو دو ہاتھ ہو جائیں اور اس کو دھول چٹا دی جائے تو بڑا مزہ رہے۔ ہم بھی آپ جانیں، بدھو تو ہیں نہیں۔ ظاہر ہے مجھے یہ امید ہرگز نہیں تھی کہ لڑائی میں وہ کوئی خاص ایمانداری برتیں گے — جب واسطہ فاشزم سے ہو تو ایمانداری کی بھلا کون امید کرسکتا ہے؟ — لیکن ہٹلر کی فوج جیسی پاجی ذلیل نکلی ایسی فوج سے لڑنے کی ہمیں کبھی توقع نہیں تھی۔ چلئے چھوڑئیے، ابھی میں اس کا ذکر نہیں کرونگا...

''جولائی کے آخر میں ہمارا دستہ محاذ پر پہنچا۔ ستائیسویں تاریخ کو ہم لڑائی میں شامل ہوئے۔ پہلے پہل تو ذرا خوف آیا۔ ان کی توپوں کی گولہ باری نے بڑا ہی پریشان کیا لیکن دن ڈوبنے سے پہلے ہمارے قدم جم گئے اور جس گاؤں پر انہوں نے قبضہ کرلیا تھا وہاں سے مار بھگایا۔ اس معرکے میں ہم نے کوئی پندرہ قیدی پکڑے۔ مجھے یوں یاد ہے جیسے کہ یہ کل ہی کا واقعہ ہو۔ ان کو جب لایا گیا تو وہ خوفزدہ تھے، منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میرے جوان معرکے کے بعد اب ٹھنڈے پڑچکے تھے اور اب ان میں سے ہر ایک جرمنوں کی جس طرح بن پڑ رہا تھا خاطر کرنا چاہتا تھا — کوئی شوربے کا پیالہ بڑھاتا تو کوئی تمباکو، سگریٹ، چائے، یا جو تھا پیش کر رہا تھا۔ جرمنوں کی پیٹھ پر کوئی ہاتھ رکھتا، کوئی جرمن لہجے میں کامریڈ کہتا اور ان سے پوچھتا کہ وہ کس مقصد کے لئے لڑ رہے ہیں۔

''ایک بوڑھا فوجی پیار محبت کے اس منظر کو تھوڑی دیر تک تو دیکھتا رہا اور پھر جوانوں سے بولا: 'اپنے ''کامریڈوں'' کی خاطر مدارات تم بڑے جذباتی بن کر کر رہے ہو۔ یہاں سب کامریڈ ہیں، یہ تو درست مگر انہیں کامریڈوں کو ذرا مورچوں کے اس پار

دیکھنا کہ ہمارے زخمیوں سے، شہری آبادی سے کیسا سلوک کرتے ہیں!، یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا مگر ہمیں ایسا لگا جیسے کسی نے بالٹی بھر ٹھنڈا برف پانی ہمارے منہ پر پھینک دیا ہو۔

"جلد ہی ہم نے بڑھ کر حملہ کیا اور جو منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے وہ واقعی وحشتناک تھے۔ گاؤں کے گاؤں جلا کر خاکستر کر ڈالے گئے تھے، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو سیکڑوں کی تعداد میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا، جنگی قیدیوں — خود ہمارے سوویت جوانوں کی مسخ شدہ لاشیں، عورتوں، جوان لڑکیوں اور محض بچیوں کی لاشیں جن کی عصمت دری کرکے بے رحمی سے قتل کردیا گیا تھا...

"ان میں سے ایک کو میں کبھی بھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ کوئی گیارہ برس کی بچی تھی، ایسا لگتا تھا کہ وہ اسکول جارہی تھی۔ جرمنوں نے اسے پکڑ لیا، گھسیٹ کر اس کو کسی کے پائیں باغ میں لے گئے، عصمت دری کی اور اس کو مار ڈالا۔ وہ آلو کے روندے ہوئے چھوٹے سے کھیت میں پڑی تھی۔ چھوٹی سی لڑکی، بچی سے کچھ ہی زیادہ، اور اس کے چاروں طرف اس کی کتابیں تتربتر پڑی تھیں، خون میں تربتر۔ اس کے چہرے پر کرچ سے بھرپور وار کیا گیا تھا اور وہ بری طرح مسخ ہو گیا تھا... ہاتھ میں وہ اپنا بستہ دبوچے ہوئے تھی، جبر کا منہ کھلا تھا۔ ہم نے اس کی لاش کو ایک برساتی سے ڈھانک دیا اور خاموش کھڑے ہوگئے۔ پھر میری ٹکڑی کے جوان چپ چاپ اپنی اپنی راہ چلے گئے لیکن میں وہیں کھڑا خبطیوں کی طرح بڑبڑاتا رہا: 'بارکوف اور پولووینکن۔ طبعیاتی جغرافیہ۔ سات یا دس سالہ اسکولوں کے لئے نصابی کتاب۔'، لڑکی کے بستے سے گری ہوئی ایک کتاب کے سرورق پر میں نے یہ عبارت پڑھی تھی۔ اس نصابی کتاب سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ میری بیٹی بھی پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی۔

"یہ روزبن سے کچھ ہی دور کا واقعہ ہے اور اسکوبرا سے کچھ دور ایک کھائی میں ہمیں وہ جگہ ملی جہاں جرمنوں نے ان سوویت فوجیوں کو ایذائیں پہنچا پہنچا کر قتل کیا تھا جن کو انہوں نے قیدی بنا لیا تھا۔ کیا آپ کبھی قصاب خانے میں گئے ہیں؟ بس، وہ جگہ بالکل ایسی ہی لگ رہی تھی۔ بے بازو، بے ٹانگوں کے جسم کھائی کے پاس درختوں کی شاخوں میں لٹکے ہوئے، کھال آدھی ادھڑی

ہوئی... آٹھ مقتول فوجیوں کو زمین پر تلے اوپر ڈھیر کیا ہوا تھا۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ کونسا عضو کس جسم کا ہے۔ گوشت کے محض بڑے بڑے لوتھڑے تھے اور اس ڈھیر کے اوپر سوویت فوجیوں کی آٹھ ٹوپیاں نہایت صفائی کے ساتھ ایک میں ایک پھنسا کر رکھ دی گئی تھیں...

"وہاں جو جو کچھ دیکھا کیا آپ کی رائے میں کوئی شخص پوری تفصیل سے بیان کر سکتا ہے؟ نہیں کر سکتا۔ ایسے الفاظ موجود ہی نہیں ہیں۔ یہ منظر تو صرف آنکھوں سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اور بہرحال، اس موضوع کو یہیں چھوڑئیے،" گیراسیموف نے جھنجھلا کر کہا اور بڑی دیر تک چپ چاپ رہا۔

"سگریٹ پی سکتے ہیں یہاں؟" میں نے پوچھا۔

"ضرور، لیکن مٹھی میں چھپا کر،" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

خود اس نے بھی سگریٹ سلگالی اور سلسلۂ کلام جاری کردیا:

"نازیوں کے یہ سارے مظالم دیکھ کر آپ جانیں ہم وحشی ہو گئے اور ہونا ہی تھا۔ ہم سب اچھی طرح جان گئے کہ ہمارا آمنا سامنا انسانوں سے نہیں بلکہ خون کے پیاسے درندوں سے ہے۔ ہمارے لوگوں کو وہ اسی کمال سے ایذائیں پہنچاتے، عصمت دری کرتے اور موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے جس طرح کہ کبھی وہ اپنے مشینی اوزار بنایا کرتے تھے۔

"بعد میں ہمیں پھر پسپا ہونا پڑا تھا، لیکن لڑے ہم دیوانوں کی طرح۔

"میری کمپنی میں قریب قریب تمام لوگ سائبیریائی تھے لیکن یوکرینی سرزمین کی ہم نے واقعی بے جگری سے مدافعت کی۔ میرے بہت سے ہموطن یوکرین میں شہید ہوئے مگر ان سے کہیں زیادہ جرمن ہمارے ہاتھوں مارے گئے۔ ہم پسپا ہو رہے تھے مگر پھر بھی ان کو خوب ہی مزہ چکھایا۔"

سگریٹ کا زوردار کش لیتے ہوئے لفٹنٹ گیراسیموف نے اب مختلف، نرم لہجے میں کہنا شروع کیا:

"یوکرین کی زمین بڑی نفیس ہے اور مناظر نہایت حسین! ہر گاؤں، چھوٹا ہو یا بڑا، ہمیں اپنے وطن جیسا پیارا تھا، شاید اس لئے کہ ہم نے وہاں کی زمین اپنے خون سے سینچی تھی اور کہتے ہیں کہ

خون لوگوں میں بھائیوں کا رشتہ پیدا کردیتا ہے... اور جب ہمیں کوئی ڈگ چھوڑ کر پیچھے ہٹنا پڑتا تو بیچارے دل کو مسوس کر رہ جاتے تھے۔ ہمیں اتنا افسوس ہوتا، اور اتنا ملال ہوتا کہ پیچھے ہٹتے وقت ایک دوسرے کی آنکھ سے آنکھ نہ ملاپاتے تھے۔

"...میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ کبھی قید سے پالا پڑے گا۔ مگر ہونی ہوکر رہی۔ پہلی بار میں ستمبر کے شروع میں زخمی ہوا تھا مگر میں اپنی صفوں ہی میں رہا۔ دوسری بار اکیسویں ستمبر کو علاقہ پولتاوا کے گاؤں دینی سوفکا کی لڑائی میں زخمی ہوا اور وہاں مجھے قیدی بنا لیا گیا۔

"جرمن ٹینکوں نے ہمارے میسرے کو توڑ دیا اور ان کے بعد پیدل فوج اندر گھس آئی۔ ہم لڑتے ہوئے اس محاصرے کو توڑ کر نکل رہے تھے۔ اس روز میری کمپنی کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ دو بار ہم نے ان کے حملے پسپا کئے، ان کے چھ ٹینکوں کو آگ لگادی اور ایک بکتربند گاڑی پھونک دی اور مکئی کے کھیت میں کوئی ایک سو بیس ہٹلریوں کی لاشیں بچھا دیں۔ لیکن پھر وہ اپنی توپیں گھسیٹ لائے اور دوپہر سے لیکر سہ پہر چار بجے تک ہم جس بلند مقام پر قابض رہے تھے اس کو ہمیں چھوڑنا پڑا۔ صبح سویرے ہی سے سخت گرمی تھی، آسمان میں بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہ تھا، اور دھوپ اس قدر تیز تھی کہ دم گھٹا جاتا تھا۔ گولے دنادن گر رہے تھے، اور مجھے یاد ہے ہم سب کے مارے پیاس کے منہ خشک تھے، ہونٹ سیاہ پڑگئے تھے اور خود میرا گلا اس قدر خشک ہو گیا تھا کہ حکم دیتے وقت عجیب پھٹی پھٹی سی آواز نکل رہی تھی۔ ہم بھاگ کر ایک گڈھا پار کر رہے تھے کہ ایک گولا میرے سامنے آن کر پھٹا۔ اس ایک لمحے میں مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے گرد و غبار کا ایک کالا بادل سا زمین سے اٹھتا ہوا دیکھا اور پھر کچھ ہوش نہ رہا۔ گولے کا ایک ٹکڑا میرے خود کو چیرتا ہوا گزر گیا تھا اور دوسرے نے میرے داہنے شانے کو چھید ڈالا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ میں وہاں کب تک پڑا رہا۔ لیکن جب ہوش آیا تو قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے سر اٹھاکر دیکھا کہ اس جگہ نہیں ہوں جہاں زخمی ہوا تھا۔ کسی نے میرا کوٹ اتار دیا تھا اور شانے پر پٹی باندھ دی تھی۔ میرا خود غائب تھا اور

جس کسی نے میرے سر پر پٹی کی تھی وہ عجلت میں تھا کیونکہ پٹی کا سرا اڑسا ہوا نہیں تھا اور میرے سینے پر پڑا تھا۔ ہوش میں آنے کی پہلا خیال یہ ہوا تھا کہ میرے جوان مجھے یہاں سے اٹھا کر لے گئے ہیں اور بھاگتے بھاگتے میری مرہم پٹی کردی گئی ہے اور بمشکل سر اٹھا کر دیکھتے ہوئے انہیں کے نظر آنے کی توقع تھی۔ لیکن جو لوگ دوڑ کر میری طرف آرہے تھے وہ جرمن تھے۔ وہ مجھے بالکل صاف نظر آرہے تھے جیسے کسی فلم میں دیکھ رہا ہوں۔ ہاتھوں سے ٹٹول کر آس پاس دیکھا کہ قریب کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ نہ کوئی پستول، نہ بندوق، یہاں تک کہ کوئی دستی گولہ بھی نہیں تھا۔ میرے ہی کچھ آدمیوں نے نقشوں کا ڈبہ بھی نکال لیا ہوگا اور میرے ہتھیار بھی۔

"'لو اب موت آگئی۔'، میں نے سوچا۔ اس لمحے میں نے اور کیا سوچا؟ کچھ بھی نہیں۔ اگر آپ اپنے آئندہ ناول کے لئے کچھ جاننا چاہتے ہوں، تو خود ہی کچھ سوچ کر لکھ دیجیئے کیونکہ واقعی کچھ اور سوچنے کی مجھے قطعاً مہلت نہیں تھی۔ جرمن بہت نزدیک پہنچ چکے تھے اور میں لیٹے لیٹے مرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیٹے لیٹے میں قطعی نہیں مرنا چاہتا تھا، سمجھے آپ؟ میں نے اپنی رہی سہی ساری قوت مجتمع کی اور چاروں ہاتھوں اور پیروں سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جرمنوں کے پہنچتے پہنچتے میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں کھڑے ہوکر جھوم رہا تھا اور خوف اس بات کا طاری تھا کہ میں گرپڑونگا اور وہ لیٹے ہی لیٹے مجھے تہ تیغ کردیں گے۔ مجھے صورت ایک کی بھی یاد نہیں۔ وہ مجھے گھیر کر کھڑے ہوگئے تھے اور آپس میں باتیں کرکے قہقہے لگا رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا: 'آؤ، مار ڈالو مجھے، حرامزادو! مجھے گرنے سے پہلے مار ڈالو۔'، ان میں سے ایک نے اپنی بندوق کا کندہ میری گردن پر مارا۔ میں گرپڑا مگر سنبھل کر پھر اٹھا۔ سب نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ان میں سے ایک نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور مجھے چلنے کا حکم دیا۔ میں چلا۔ میرے پورے چہرے پر خون کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ سر کے زخم سے تازہ خون کی ایک باریک سی لکیر اب بھی جاری تھی۔ شانے میں سخت درد تھا اور دایاں ہاتھ اٹھایا نہیں جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرا جی کس قدر چاہ رہا تھا کہ فوراً زمین پر لیٹ جاؤں اور کہیں نہ جاؤں مگر پھر بھی میں چل پڑا...

"نہیں، میں مرنا ہرگز نہیں چاہتا تھا اور قید میں رہنا تو بالکل



بھی نہیں۔ سر چکرا رہا تھا، متلی ہو رہی تھی، مگر ان سب پر قابو پا کر میں چلتا رہا، اور اس کے معنے یہ تھے کہ میں زندہ تھا، مجھ میں عمل کی صلاحیت اب بھی باقی تھی۔ اللہ، کس قدر شدت کی پیاس تھی! منہ بالکل خشک ہوچکا تھا، آنکھوں کے سامنے جیسے سیاہ نقاب لہرا رہی تھی۔ میں قریب قریب بیہوش تھا مگر چلے چلا جا رہا تھا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا: ' تھوڑا سا پانی اور کچھ آرام مل جائے تو فوراً بھاگ کھڑا ہوں۔ '

"ہم سب قیدیوں کو جنگل کے باہر جمع کرکے قطاریں لگوائی گئیں۔ بیشتر جوان دوسرے دستے کے تھے اور صرف دو میری رجمنٹ کی تیسری کمپنی کے تھے۔ بیشتر قیدی زخمی تھے۔ ٹوٹی پھوٹی روسی میں جرمن لفٹننٹ نے پوچھا کہ ہم میں کوئی کمیسار یا افسر ہے۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ پھر اس نے کہا: ' کمیسار اور افسر، دو قدم آگے! ' کسی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

"لفٹننٹ آہستہ آہستہ قطار کے سامنے سے گزرا اور پندرہ سولہ آدمیوں کو جو صورت سے یہودی لگے چن لیا۔ ' یہودی ؟ '، اس نے ان آدمیوں میں سے ہر ایک کے سامنے رک کر پوچھا تھا اور ان کے جواب کا انتظار کئے بغیر انہیں قطار سے باہر نکل آنے کا حکم دیا تھا۔ بیشتر یہودی ہی تھے مگر کچھ آرمینیائی اور روسی بھی تھے جن کے بال سیاہ اور رنگت سانولی تھی۔ ان کو ایک طرف لیجاکر ہماری آنکھوں کے سامنے گولی سے اڑا دیا گیا۔ اس کے بعد جلدی جلدی ہماری جامہ تلاشی لی گئی۔ ہمارے بٹوے اور جو کچھ بھی ہمارے پاس تھا وہ چھین لیا گیا۔ میں اپنا پارٹی کارڈ بٹوے میں کبھی نہیں رکھتا تھا کہ کہیں کھو نہ جائے۔ اس کو میں اپنی پتلون کی جیب میں رکھتا تھا اور تلاشی کے وقت وہ جرمنوں کے ہاتھ نہ لگا۔ میں تو کہوں کا انسان عجیب مخلوق ہے! مجھے معلوم تھا کہ میری جان کو سخت خطرہ ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر بھاگ نکلنے کی کوشش میں نہ مارا گیا تو راستے میں ماردیا جاؤنگا کیونکہ خون نکل جانے کی وجہ سے میں اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ باقیوں کے ساتھ پیدل نہ چل سکوں گا۔ اور پھر بھی مجھے بےحد خوشی تھی کہ پارٹی کارڈ محفوظ ہے، اتنی کہ اپنی پیاس تک کو بھول گیا۔

"پورے جتھے کو مغرب کی طرف پیدل روانہ کردیا گیا۔ سڑک کے دونوں طرف بہت بڑا محافظ دستہ ساتھ تھا۔ اور کوئی دس آدمی موٹرسائیکلوں پر سوار تھے۔ ہم کو تیز چال سے چلنے پر مجبور کیا جا رہا



میخائل شولوخوف ۱۹۳۶ء میں۔



ڈان کے بیٹے۔

قارئین کے جلسے میں جس میں فیکٹری کے مزدوروں نے شرکت کی۔





نووچیرکاسک۔ میمبر اور ان کے ووٹر۔

محاذ جنگ پر۔ ادیب یوگینی پتروف، میخائل شولوخوف اور الکساندر فادیئف ان آلات کا معائنہ کر رہے ہیں جو ایک تباہ شدہ جرمن ٹینک سے نکالے گئے ہیں۔





سنہ تیس کی دہائی کی ایک تصویر۔



۱۹۴۴ء۔



میخائل سولوموف موچیوں کے ایک دستے کے ساتھ۔

جرنیل لفٹنٹ یوسف میخائل سولوخوف اور الکساندر فادیئف سے باتیں کر رہے ہیں۔





مجاہدین وطن ۔

شولوخوف پیدل فوج کے دستے کی کمان کی ایک چوکی پر ۔





ویشنسکایا کا ایک منظر ۔

ویشنسکایا کی ایک سڑک ۔





ویشینسکایا ۔ دن کی طرف جانے والی سڑک ۔

مصنف کے گھر سے ساحل ڈان کا منظر ۔





شولوخوف اور ان کی اہلیہ ماریا پیتروونا ناشتے کی میز پر ۔

مصنف اپنے کام میں مصروف ہیں ۔





شولوخوف اور ان کی اہلیہ اپنے باغ میں -



کنبے کی ایک تصویر -

مچھلی کا شکار -





مرغابی کے شکار پر روانگی۔



وادیٔ ڈان پر پرواز۔

فلم ''مقدر انسان کا،، کی شوٹنگ کے دوران۔



تھا اور میری طاقت رفتہ رفتہ جواب دیتی جا رہی تھی۔ دو مرتبہ میں گرا اٹھا اور پھر چل پڑا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اگر ذرا سست پڑا تو یوں پڑا رہا اور دستہ آگے بڑھ گیا تو وہیں سڑک پر گولی مار دی جائے گی۔ میرے آگے والی قطار میں ایک سارجنٹ کے پاؤں بھی گولی لگی تھی۔ اس کی ٹانگ میں زخم تھا اور وہ بمشکل چل پا رہا تھا۔ وہ کراہتا رہا اور جب درد برداشت سے باہر ہو گئی تو رو بھی دیا۔ کوئی ایک کلومیٹر چلنے کے بعد اس نے بہ آواز بلند کہا: 'نہیں، اب نہیں چلا جاتا۔ خدا حافظ ساتھیو،' اور وہ بیچ سڑک پر بیٹھ گیا۔ بغیر رکے، لوگوں نے اسے اٹھانے اور پیروں پر کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ پھر بیٹھ رہا۔ خواب کی طرح مجھے اب بھی اس کا زرد، پرشباب نوجوان چہرہ، سکڑی ہوئی بھنویں اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں یاد ہیں... دستہ آگے بڑھ گیا۔ میں مڑا تو دیکھا کہ موٹرسائیکل سوار ایک محافظ آکر سارجنٹ کے پاس رکا، اپنا پستول نکالا اور اس کی کنپٹی پر رکھ کر داغ دیا۔ آپ جانتے ہیں وہ اپنی موٹرسائیکل سے اترا تک نہیں۔ دریا تک پہنچنے سے پہلے جرمنوں نے اس طرح پیچھے رہ جانے والے کئی دوسرے قیدیوں کو گولی مار دی تھی۔

''اب دریا نظر آنے لگا تھا، اس کا پل بھی جو اڑا دیا گیا تھا، اور لاری جو ایک سرے پر پھنس گئی تھی۔ یہاں پہنچکر میں منہ کے بل سڑک پر گر گیا۔ نہیں، میں بیہوش نہیں ہوا تھا۔ میں وہیں ٹانگیں پھیلائے پڑا رہا، دھول منہ میں بھر گئی تھی، شدید غصے کے مارے دانت کٹکٹا رہا تھا مگر اٹھتے کسی طرح نہ بن پڑ رہی تھی۔ لوگ میرے پاس سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے دھیرے سے کہا: 'چلو، اٹھ کھڑے ہو، ورنہ تمہیں گولی ماردیں گے۔' میں نے اپنا منہ نیچے کیا اور آنکھیں نوچ ڈالیں تاکہ تکلیف کی شدت مجھے اٹھ کھڑے ہونے میں مدد دے...

''دستہ گزر چکا تھا اور مجھے موٹرسائیکل قریب آتی سنائی دے رہی تھی اور میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ متوقع جلاد کی طرف مڑ کر دیکھے بغیر، شرابی کی طرح جھومتا ہوا آکر دستے میں پھر شامل ہو گیا اور ساتھ چلنے لگا۔ جرمن ٹینکوں اور گاڑیوں نے جو ابھی ابھی اس چھوٹی سی ندی کو پار کرکے کنارے آئی تھیں پانی کو گدلا کر دیا تھا لیکن ہم اس گرم اور گدلے پانی پر ٹوٹ پڑے اور یہ کیچڑ ملی جنت کے شفاف پانی سے بھی زیادہ میٹھی معلوم ہوئی۔ میں نے اپنے سر اور زخمی شانے کو پانی سے دھویا اور مجھ میں حیرت انگیز تازگی آگئی۔ اب مجھ میں چلتے رہنے



آج کے داویدووں کے درمیان (لینن گراد کے کیروف کارخانے میں)۔

کی طرف آ گئی تھی، مجھے آس ہو گئی تھی کہ گر کر راستے میں ڈھیر نہ ہو جاؤں گا۔

"ابھی ہم دریا پار کر کے کچھ ہی آگے بڑھے تھے کہ سامنے سے سڑک پر منجھولے جرمن ٹینکوں کی ایک ٹکڑی اپنی طرف آتے دیکھی۔ آگے والے ٹینک چلانے والے نے ہمیں پہچان لیا کہ قیدی آرہے ہیں اور اس نے رفتار تیز کردی اور سیدھا ہمارے دستے میں گھس آیا جس کی وجہ سے اگلی قطاروں میں بھگدڑ مچ گئی اور ہمارے آدمی ٹینکوں کے پہیوں میں آ کر کچل گئے۔ اس منظر کو دیکھ کر ہمارے محافظوں کا مارے ہنسی کے برا حال ہو گیا اور وہ ٹینک چلانے والوں سے جو مو کھے کھول کر باہر جھانکنے لگے تھے چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگے۔ جب ہنسی کا یہ دورہ ختم ہوا تو انہوں نے ہماری قطاریں پھر سے لگوائیں اور سڑک کے کنارے کنارے لیکر پھر سے روانہ ہو گئے۔ واقعی خوب ٹھٹھے لگانا آتا ہے ان جرمنوں کو...

"اس رات میں نے بھاگ نکلنے کی کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ مجھے احساس تھا کہ ایسی حالت میں بھاگ کر زیادہ دور نہ پہنچ پاؤنگا۔ اس کے علاوہ ہماری نگرانی اتنی سخت تھی کہ اس میں ناکامی یقینی تھی۔ مگر آپ کو نہیں معلوم کہ یہ کوشش نہ کرنے پر میں نے بعد میں اپنے آپ کو کتنا کوسا! اگلے روز ہمیں اس گاؤں میں سے لیجایا گیا جس میں جرمن پیدل فوج کی ایک کمپنی کا پڑاؤ تھا۔ سارے جرمن ہمیں دیکھنے سڑک کے کنارے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ہمارے محافظوں نے پورے گاؤں سے ہمیں دوڑا کر گذارا، ہماری توہین کی تا کہ محاذ جنگ پر روانہ ہونے والی اس پیدل فوج کی ہمتیں بڑھائیں۔ ہم دوڑے۔ جو بھی لڑکھڑایا یا گرا اسے وہیں گولی مار دی گئی۔ دن ختم ہونے سے پہلے ہم جنگی قیدیوں کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ اس مقصد کے لئے ایک مشین اور ٹریکٹر اسٹیشن کے صحن کے چاروں طرف موٹے خاردار تار کھنچوا دئے گئے تھے اور اس کے اندر قیدیوں کو اس طرح ٹھونس دیا گیا تھا جیسے ڈبوں میں مچھلیوں کو۔ ہمیں کیمپ کے محافظوں کے سپرد کر دیا گیا جنہوں نے اپنی بندوقوں کے کندوں سے ٹھوکے دیکر اور مار مار کر اس احاطے میں ہمیں ٹھونس دیا۔ یہ جہنم نہیں تھی، اس سے بھی بدتر جگہ تھی۔ وہاں پاخانے نہیں۔ قیدی جہاں تھے وہیں رفع حاجت کر لیتے تھے اور ان کو وہیں اس غلاظت میں کھڑے رہنا یا لیٹنا پڑتا تھا۔ جو کمزور تھے وہ تو کبھی اٹھ ہی نہ پائے۔ ہمیں دن

میں ایک بار کھانا اور پانی ملتا تھا۔ ایک مگا پانی اور مٹھی بھر کچے کدوؤں یا سورج مکھی کے سڑے ہوئے بیج۔ کسی کسی دن تو قیدیوں کو محافظ کھلانا بھی بھول جاتے تھے۔

"ہمیں وہاں پہنچے تیسرا ہی دن تھا کہ موسلادھار بارش ہونے لگی۔ گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ کھڑی ہو گئی۔ صبح لوگوں کے جسم سے یوں بھاپ اٹھتی جیسے گھوڑوں کے اور بارش کے تھمنے کے کوئی آثار ہی نظر نہ آتے تھے... ہر رات دسیوں آدمی مرتے۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم لوگ فاقوں کی وجہ سے کمزور ہوتے گئے۔ اس پر طرہ یہ کہ اب میرے زخموں میں سخت تکلیف شروع ہو گئی تھی۔

چھٹے دن میرے شانے میں سخت درد شروع ہو گیا اور سر کی حالت اس سے بھی خراب تھی۔ زخموں میں مواد بھرنے لگا تھا۔ سخت سڑاند بھی آنے لگی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ شدید زخمی سوویت فوجیوں کو اس کیمپ کے قریب ہی اجتماعی فارم کے اصطبل میں رکھا گیا ہے اور ان کی دیکھ بھال کے لئے ایک ڈاکٹر بھی موجود ہے۔ صبح میں نے محافظوں کے سارجنٹ سے کہا کہ وہ مجھے ڈاکٹر کو دکھا دے۔ اس کو روسی اچھی آتی تھی۔ جواب دیا 'جاؤ، اپنے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ وہ ابھی تمہارا علاج کر دے گا۔'

"طنز کو میں نہ سمجھ سکا اور بڑی امید لیکر اصطبل کی طرف چلدیا۔

"سرجن مجھے دروازے پر ہی مل گیا۔ یہ آدمی بالکل ختم ہو چکا تھا۔ خوفناک حد تک بے جان دبلا پتلا وہ شخص جو مصیبتیں جھیل چکا تھا ان کے باعث نیم پاگل ہو گیا تھا۔ زخمی گندے بھوسے پر پڑے تھے اور اصطبل کی بدبو میں ان کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ بیشتر کے زخموں میں کیڑے پڑنے شروع ہو گئے تھے اور جن زخمیوں میں اتنی ہمت تھی وہ ان کو اپنی انگلیوں یا تنکوں سے کرید کرید کر نکال رہے تھے... وہیں ایک ڈھیر کی شکل میں مردے بھی پڑے تھے۔ جتنی تیزرفتاری سے ان میں اضافہ ہو رہا تھا اتنی تیزی سے انہیں ہٹایا نہیں جا سکتا تھا...

"'کہئے؟ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟' ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا۔ 'میرے پاس پٹی کی ایک چندی تک نہیں ہے، میرے پاس کچھ نہیں ہے! چلے جاؤ، خدا کے لئے، یہاں سے چلے جاؤ! اپنی پٹیاں نوچ ڈالو اور اپنے زخموں پر تھوڑی سی راکھ چھڑک لو۔ یہیں دروازے کے قریب۔'

"میں نے وہی کیا جو اس نے کہا تھا۔ جب میں واپس کیمپ میں پہنچا تو محافظوں کے سارجنٹ نے باچھیں چیرتے ہوئے کہا: 'کہو، کیسی بیتی؟ تمہارے فوجیوں کے پاس بہت ہی اچھا ڈاکٹر ہے!' اس نے مدد کی تمہاری؟' میں بغیر کچھ کہے اس کے پاس سے چلا جانا چاہتا تھا لیکن اس نے میرے منہ پر ایک مکّہ رسید کیا اور چیخا: 'اچھا، تو تو جواب نہیں دے گا، گندے سور؟' میں گر پڑا اور اس نے میرے سر اور سینے کا نشانہ لے لیکر ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں۔ وہ اس وقت ہی رکا جب خود بیدم ہوگیا۔ اس نازی کو میں تازیست نہیں بھولوں گا، ہرگز نہیں! اس کے بعد بھی میں نے کئی بار اس کی مار کھائی۔ جب بھی کبھی خاردار تاروں کے پیچھے وہ مجھے دیکھ لیتا فوراً باہر آنے کا حکم دیتا اور نہایت مستعدی اور خاموشی سے مجھے زد و کوب کرنا شروع کر دیتا۔

"آپ پوچھینگے میں زندہ کیسے بچ نکلا؟

"بات دراصل یہ ہے کہ مستری بننے سے پہلے میں دریائے کاما پر حمالی کیا کرتا تھا اور جب جہاز سے سامان اتارنا ہوتا تو میں اپنی پیٹھ پر نمک کے دو دو بورے لاد لیا کرتا تھا — ہر ایک سو سو کلوگرام کا۔ چنانچہ جسمانی اعتبار سے میں خوب طاقتور تھا، میری صحت عموماً اچھی رہتی تھی، لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں مرنا نہیں چاہتا تھا، مجھ میں زبردست قوت مدافعت پیدا ہوگئی تھی۔ میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ وطن کی حفاظت کرنے والی اپنی فوج میں کسی طرح پہنچ جاؤں۔ اور میں دشمن سے انتقام لینے واپس پہنچ ہی گیا۔

"میرا تبادلہ ایک اور کیمپ میں کوئی ایک سو کلومیٹر کے فاصلے پر کردیا گیا۔ پہلا والا ایک طرح سے تقسیم کا مرکز تھا۔ دونوں کیمپ بہت کچھ ایک ہی جیسے تھے۔ یہاں بھی خاردار تاروں کی بہت اونچی باڑھ کھنچی ہوئی تھی اور کوئی چھت نہیں تھی۔ کھانا بھی گندہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کچی کودوں کی جگہ کبھی کبھی ہمیں سڑے ہوئے گیہوں کا دلیہ ملتا تھا اور کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی مردہ گھوڑا لا کر احاطے میں ڈال دیا جاتا اور اس کا بدبودار گوشت آپس میں بانٹ لینے کا کام ہم پر چھوڑ دیا جاتا۔ ہمیں اسے کھانا پڑتا کہ کہیں بھوکوں نہ مرجائیں اور زہرباد سے مرتے بھی تھے سینکڑوں کی تعداد میں... ستمبر ختم ہونے سے پہلے ہی سردیاں شروع ہوگئیں۔ بارش مسلسل ہوتے جارہی تھی۔ صبح سویرے کہرہ جمنے لگا تھا۔ زندگی ایک عذاب مسلسل بن گئی تھی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مرنے والوں میں سے ایک کی وردی اور

گرم کوٹ مجھے مل گیا تھا۔ مگر پھر بھی ٹھنڈ کے مارے ہڈیاں تک یخ ہوگئی تھیں۔ بھوک کی تو اب عادت پڑ چکی تھی...

"ہمارے ہاں پہرہ ان فوجیوں کا رہتا تھا جو لوٹ مار سے موٹے ہورہے تھے۔ کردار کے اعتبار سے وہ سب ایک ہی سانچے کے ڈھلے تھے، اور ان میں سے ایک ایک پکا بدمعاش تھا۔ دل بہلانے کے لئے وہ لوگ جو کچھ کیا کرتے تھے وہ بھی سن لیجئے: صبح کو لانس کارپورل خاردار تاروں کے پاس آتا اور مترجم سے کہلواتا کہ ہم لوگ کھانا لینے قطار باندھ کر کھڑے ہوجائیں جو کیمپ کے بائیں سرے سے تقسیم ہونا شروع ہوگا۔

"ہم سب وہاں جا کر جمع ہو جاتے یعنی وہ لوگ جن میں ابھی تک کھڑے ہونے اور گھنٹے، دو گھنٹے، تین گھنٹے تک انتظار کرنے کی سکت باقی ہوتی۔ سینکڑوں زندہ ڈھانچے، سخت سردی سے کپکپاتے کھڑے رہتے اور انتظار کئے جاتے۔

"اچانک صحن کے دوسرے سرے پر پہریدار آتا اور خاردار تاروں کے اوپر سے گھوڑے کے گوشت کے ٹکڑے اچھال کر پھینکنا شروع کردیتا۔ بھوکوں کی بھیڑ اس طرف دوڑ پڑتی اور گوشت کے گندے لوتھڑوں پر جانوروں کی طرح آپس میں دھکم پیل کرتی ٹوٹ پڑتی... یہ منظر دیکھ کر پہریدار قہقہے لگاتے اور پھر اچانک مشین گن سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہوجاتی۔ زمین پر کچھ مردوں اور کچھ زخمیوں کو چھوڑ کر مجمع گھبرا کر بائیں طرف لپکتا۔ پھر طویل قامت اوبر لفٹنٹ جو کیمپ کا افسراعلی تھا خاردار تار کے پاس آتا اور اپنے قہقہے پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہتا: 'کھانے کی تقسیم کے وقت تم لوگ بہت بدتمیزی سے پیش آئے! یہ حرکت اگر پھر سے ہوئی تو روسی سورو، میں تم کو بلاتامل بھنوا کر رکھدوں گا۔ لاشوں اور زخمیوں کو ہٹاؤ۔' اپنے افسراعلی کے پیچھے جو فوجی جمع ہوجاتے ان کا ہنستے ہنستے برا حال ہوجاتا۔ وہ اس کو بڑا ہی ظریف الطبع گردانتے اور یہ مذاق ان کا بھی پسندیدہ شوق تھا۔

"ہم لوگ لاشیں اٹھاتے اور کیمپ سے قریب ہی ایک کھائی میں دفن کر دیتے... اس کیمپ میں بھی زدوکوب کرنا روز کا معمول تھا۔ مکّے، لاٹھیوں اور بندوق کے کندوں سے کام لیا جاتا۔ پہریدار ہمیں صرف اس لئے پیٹا کرتے کہ خالی بیٹھے بیٹھے اکتا جاتے تھے اور اس سے تفریح طبع کا اچھا سامان پیدا ہوجاتا تھا۔ میرے زخم اچھے ہو گئے تھے مگر سیلن یا پٹائی کی وجہ سے وہ پھر کھل جاتے اور بے قراری کا درد ہونے لگتا۔

لیکن پھر بھی میں زندہ رہا اور امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا... ہم لوگ زمین پر، کیچڑ میں سوتے، بستر کے لئے بھوسہ تک نہیں دیا گیا تھا۔ ہم لوگ گٹھڑی بنکر ایک دوسرے کے قریب لیٹ جاتے۔ ہمارا ڈھیر رات کے وقت بےچینی سے کلبلایا کرتا، کوئی سرک سرک کر ادھر ادھر جاتا، کوئی کروٹیں بدلا کرتا کیونکہ جو لوگ کیچڑ پر لیٹے ہوتے یا سب سے اوپر ہوتے ان کے لئے تو سردی قلفہ جمادینےوالی تھی۔ جانکنی کا عالم ہوتا تھا، نیند کیا خاک آتی۔

''اور اس طرح دن گھسٹ گھسٹ کر گزرتے رہے جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہے ہوں۔ میں دن‌بدن زیادہ کمزور ہوتا چلا گیا۔ بچہ مجھے دھکہ دیکر گرا سکتا تھا۔ میں اپنے سوکھے ہوئے بازوؤں کو دیکھ کر تھراجاتا تھا — خشک کھپچیاں جن پر کھال منڈھ دی گئی ہو — اور حیرت سے سوچا کرتا کہ یہاں سے میں کبھی بھاگ بھی سکوں گا کہ نہیں؟ میں اپنے آپ کو کوسا کرتا کہ شروع ہی میں بھاگ نکلنے کی کوشش کیوں نہ کی۔ اگر اس وقت ان لوگوں نے مجھے مار ڈالا ہوتا تو کیا تھا؟ اس اذیت سے تو بچ جاتا۔

''جاڑا آیا۔ ہم نے برف ہٹائی اور جمی ہوئی زمین پر سونے کےلئے جگہ بنائی۔ کیمپ میں اب ہم تھوڑی ہی تعداد میں رہ گئے تھے... آخرکار ہمیں بتایا گیا کہ جلد ہی کہیں کام پر بھیجدیا جائیگا۔ ہماری ہمتیں پھر بڑھ گئیں۔ بہت ہی ہلکی سی امید تھی مگر پھر بھی ہم میں سے ہر ایک نے پھر سے آس لگانی شروع کردی تھی کہ ممکن ہے نکل بھاگنے کی کوئی سبیل ہوجائے۔

''رات بڑی سردی تھی مگر ہوا نہیں تھی۔ پو پھٹنے سے پہلے ہم نے توپ دغنے کی آواز سنی۔ ہمارا پورا یکجا ڈھیر ہڑبڑا کر جاگ اٹھا۔ جب آواز دوبارہ آئی تو کسی نے بہ‌آوازبلند کہا: 'ساتھیو، یہ تو ہماری فوج پیشقدمی کر رہی ہے!'

''اللہ، پھر تو دیکھئے کیسی کھلبلی مچی! ہم سب ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے، ہم میں سے وہ لوگ بھی جن سے پچھلے کئی روز سے مارے نقاہت کے ہلا بھی نہ جاتا تھا۔ پرجوش سرگوشی کے لہجے میں لوگ باتیں کررہے تھے، دبی دبی سسکیاں بھی سنائی دےجاتی تھیں... میرے پاس ہی کوئی رو رو کر اپنی جان ہلکان کئے لے رہا تھا، عورت کی طرح سسکیاں لے رہا تھا... اور میں... میں بھی... آنسو بہتے ہوئے میرے گالوں پر آ گئے اور برف بن کر جمے رہ گئے... کسی نے پھٹی پھٹی ہلکی سی آواز میں

''انٹرنیشنل،، گانا شروع کردیا اور ہم اپنی باریک بےسری آوازوں میں اس کا ساتھ دینے لگے۔ محافظوں نے مشین گنوں اور ٹامی گنوں سے ہم پر فائر کئے اور حکم دیا گیا: 'لیٹ جاؤ!'، میں برف سے بالکل چپٹ کر لیٹ گیا، اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہ خوشی کے آنسو تھے اور اپنی قوم پر فخر کے آنسو۔ نازی ہمیں غیرمسلح اور بھوک سے کمزور لوگوں کو ہلاک کر سکتے تھے، ایذائیں پہنچا پہنچا کر مار سکتے تھے، لیکن ہمارے جذبے کو ختم نہیں کرسکتے اور ہرگز نہ کرسکینگے! اور اگر ان کا خیال ہے اسے ختم کرسکتے ہیں تو انہیں چاہئے پھر غور کر لیں۔ ،،

* * *

لفٹنٹ گیراسیموف کا باقی قصہ اس رات نہ سن سکا کیونکہ ہیڈ کوارٹر سے ان کا فوری بلاوا آ گیا تھا۔ چند روز بعد ہماری پھر ملاقات ہوگئی۔ خندق میں سے پھپھوندی اور صنوبر کی رال کا بھبکہ آرہا تھا۔ لفٹنٹ گیراسیموف اپنے چوڑےچکلے شانے جھکائے اور بڑے بڑے ہاتھوں سے اپنا گھٹنا دبوچے ایک بینچ پر بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اس طرح بیٹھنے کی عادت اس کو کیمپ میں گھنٹوں تک بغیر بات کئے، اپنے تلخ، بےفائدہ خیالات میں گم بیٹھے رہنے سے پڑی ہوگی...

''آپ جاننا چاہتے ہوں گے کہ میں بھاگ کیسے نکلا؟ میں اب وہی بتانےوالا ہوں۔ ،، اس نے کہنا شروع کیا۔ ''جس رات ہم نے توپوں کی آواز سنی تھی اس کے بعد ہی ہمیں دفاعی پشتے وغیرہ بنانے کےلئے لے گئے۔ برف پگھلنی شروع ہوگئی تھی اور بارش بھی ہوئی۔ کیمپ سے ہمیں شمال کی طرف کو لیجایا گیا اور پھر وہی بات ہوئی: جب کوئی تکان کے مارے گر پڑا تو اس کو گولی ماردی گئی اور سڑک ہی پر پڑا ہوا چھوڑ دیا گیا۔ ایک آدمی کو اس لئے گولی ماری گئی کہ اس نے یخ بستہ آلو اٹھا لیا تھا۔ ہم آلو کے کھیت سے گزر رہے تھے اور اس شخص نے — گونچار اس کا نام تھا، وہ یوکرینی تھا — اس کمبخت آلو کو اٹھالیا اور اس کو چھپانے کی کوشش کی۔ جرمن محافظ نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی اور ایک لفظ کہے بغیر وہ گونچار کے پاس آیا اور گولی مار کر بھیجا اڑا دیا۔ دستے کو رکنے اور قطار باندھ کر کھڑے ہو جانے کا حکم ملا۔ 'یہ سب رائخ کی ملکیت ہے'، محافظ نے کھیتوں کی طرف عام اشارہ کرتے ہوئے

کیا۔ ان میں سے جو بھی بھاگ سے کوئی چیز بلا اجازت اٹھائیگا اس کو گولی مار دی جائیگی۔'

"جب ہم ایک گاؤں کے اندر سے گزرے تو وہاں کی عورتوں نے روٹی کے ٹکڑے اور ابلے ہوئے آلو ہماری طرف پھینکے۔ ہم میں سے کچھ ان کو ایک لینے میں یا زمین پر سے اٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔ باقی اتنے خوش قسمت نہ تھے کیونکہ ہمارے محافظوں نے کیمپ والوں کی طرف فائر کرنے شروع کر دئیے اور ہمیں حکم دیا کہ تیز تیز قدموں سے چلیں۔ گاؤں کے بچے ۔ آپ جانیں بچے تو نڈر ہوتے ہی ہیں — دوڑ کر ہم سے بہت آگے نکل گئے اور سڑک پر روٹیاں ڈال گئے تاکہ جب ہم گزریں تو اٹھا لیں۔ میں چند خوش قسمتوں میں سے تھا — میں نے ایک بڑا سا آلو اچک لیا تھا۔ آدھا میں نے اپنے پڑوسی کو دیدیا اور اسے ہم چھلکے سمیت کھا گئے۔ زندگی میں مجھے اس سے زیادہ لذیذ کھانا پہلے کبھی نہیں ملا تھا!

"پشتے جنگل میں تعمیر ہونے تھے۔ محافظوں کی تعداد دگنی کر دی گئی اور ہمیں بیلچے دے دئیے گئے۔ میں چاہتا یہ تھا کہ پشتے بناؤں نہیں بگاڑ دوں!

"میں نے فیصلہ کیا کہ آج رات ہونے سے پہلے ہی بھاگ نکلوں گا۔ جو گڑھا ہم کھود رہے تھے میں اس میں سے باہر نکل آیا، بیلچہ بائیں ہاتھ میں پکڑا اور پہریدار کے پاس گیا۔ وہ ہمارے جتھے کی نگرانی پر اکیلا ہی تھا کیونکہ باقی سب جرمن ان قیدیوں کی نگرانی کر رہے تھے جنہیں خندق کھودنے پر لگایا گیا تھا۔

"'دیکھو میرا بیلچہ ٹوٹ گیا ہے۔' میں نے منمناتے ہوئے کہا۔ مجھے احساس تھا کہ اگر پہلے ہی وار میں اس کو مار گرانے میں کامیاب نہ ہوا تو موت یقینی ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ میرے چہرے سے اس کو کچھ شبہ ہو گیا تھا کیونکہ اس نے سب مشین گن کا پٹکہ کندھے سے سرکانا شروع کر دیا تھا۔ اسی وقت میں نے اپنے بیلچے سے اس کے منہ پر زور سے وار کیا۔ اس کے سر پر وار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ خود پہنے ہوئے تھا۔ پھر بھی میری ضرب زوردار پڑی اور وہ بلا آواز وہیں ڈھیر ہو گیا۔

"اب میرے پاس ایک سب مشین گن اور کارتوسوں کے تین خزانے تھے۔ میں نے بھاگنا شروع کر دیا اور یہاں مجھے پتہ چلا کہ بھاگ نہیں سکتا۔ طاقت ہی باقی نہ رہی تھی اور پیر میں دم نہ تھا۔ پھر آگے بڑھنے لگا، گھونگھے کی رفتار سے۔ خشک نالے کے پار جنگل زیادہ گھنا ہو گیا تھا اور میرا رخ اسی طرف کو تھا۔ یہ نہیں کہہ سکتا کتنی بار میں گرا، گر کر اٹھا اور پھر گر پڑا۔ پھر بھی میں دور ہی نکلتا چلا جا رہا تھا۔ ٹیلے کی دوسری طرف گھنی جھاڑیوں میں گرتا پڑتا، سسکیاں لیتا اور تھکن کے مارے ہانپتا چلا جا رہا تھا کہ بہت دور پیچھے سے سب مشین گن کی تڑتڑاہٹ اور کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ اب مجھے پکڑنا آسان نہیں تھا۔

"اندھیرا ہو چلا تھا۔ اگر جرمن مجھے ڈھونڈ نکالتے تو میں ایک کے علاوہ ساری گولیاں ان پر چلا دیتا۔ آخری گولی خود کو ختم کرنے کے لئے باقی رکھتا۔ اس خیال سے ہمت بندھی اور میں زیادہ احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔

"رات میں نے جنگل میں گذاری۔ تھوڑی ہی دور ایک گاؤں دکھائی دیا مگر اس ڈر کے مارے کہ کہیں دشمن کے ہاتھ نہ لگ جاؤں میں وہاں نہیں گیا۔

"اگلے روز چھاپہ مار مجھے اٹھا لائے۔ دو ہفتوں تک میں ان کی خندقوں میں بستر پر لیٹا آرام کرتا اور تقویت حاصل کرتا رہا۔ شروع شروع میں انہوں نے مجھے ایک حد تک شبہے کی نظر سے دیکھا حالانکہ میں ان کو اپنا پارٹی کارڈ دکھا چکا تھا جو میں نے کیمپ میں سے اوورکوٹ کے استر میں کسی نہ کسی طرح سی لیا تھا۔ جب میں ان کی کارروائیوں میں حصہ لینے کے قابل ہو گیا تو ان کا رویہ میری جانب بالکل بدل گیا تھا۔ وہیں سے میں نے باقاعدہ حساب رکھنا شروع کیا کہ کتنے نازیوں کو مارا اور یہ عدد بتدریج سو کے قریب پہنچنے لگا۔

"جنوری میں چھاپہ ماروں نے مجھے محاذ کے پار پہنچا دیا۔ تقریباً ایک مہینے تک میں اسپتال میں رہا جہاں توپ کے گولے کا وہ ٹکڑا میرے شانے سے نکالا گیا جو اب تک وہیں گڑا ہوا تھا۔ کیمپ میں مجھے گٹھیا کا جو روگ لگ گیا تھا میں نے اس کو اور دوسری بیماریوں کے علاج کو جنگ ختم ہونے کے بعد تک اٹھا رکھا۔ اسپتال سے جب چھٹی ملی تو مجھے صحت بحال کرنے کی غرض سے گھر جانے کی چھٹی ملی۔ وہاں میں ایک ہفتے رہا اور اس سے زیادہ وہاں نہ ٹھہر سکا۔ فوج میں واپس پہنچنے کے لئے جی بیقرار تھا کیونکہ آپ چاہے کچھ کہیں میری جگہ تو آخر تک یہیں ہے۔"

* * *

خندق میں جانے کے راستے کے پاس ہم نے خداحافظ کہا۔ جنگل سے ابھرے ہوئے میدان میں پھیلی ہوئی دھوپ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے لفٹننٹ گیراسیموف نے کہا:

''ہم نے صحیح طریقے سے لڑنا سیکھ لیا ہے، ہم نے نفرت کرنا اور محبت کرنا سیکھ لیا ہے۔ تمام احساسات پر دھار رکھنے کے لئے جنگ ایک اچھا سان ہے۔ شاید کوئی سوچے کہ محبت اور نفرت کبھی ساتھ نہ ہوسکتی ہوں۔ نظم کے شاید وہ مصرعے آپ کو یاد ہوں جن میں کہا گیا ہے کہ مضبوط گھوڑے اور نازک اندام ہرنی کو ایک گاڑی میں نہیں جوتا جاسکتا۔ مگر ہم نے جوت لیا ہے۔ اور دونوں ساتھ ساتھ مزے میں چل رہے ہیں۔ جو سلوک میرے وطن اور خود میرے ساتھ نازیوں نے کیا ہے اس کی وجہ سے میں ان سے نفرت کرتا ہوں اور اپنے ہموطنوں سے میں دل‌وجان سے محبت کرتا ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ وہ نازیوں کی ماتحتی کی صعوبتیں برداشت کریں۔ یہی دونوں احساسات، محبت اور نفرت، مجھے اور ویسے تو ہم سب کو مجبور کرتے ہیں کہ جوش انتقام سے لڑیں اور یہی وہ دو جذبات ہیں جو ہمیں فتح سے ہمکنار کریں گے۔ وطن کی محبت ہمارے دلوں میں جاگزیں ہے اور جب تک ہمارے دلوں میں دھڑکن باقی ہے وہیں رہیگی۔ اپنی نفرت کو ہم سنگینوں کی نوک پر لئے پھرتے ہیں۔ اس مبالغہ‌آرائی کی معافی چاہتا ہوں، مگر مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔،، ان الفاظ کے ساتھ اس نے اپنا قصہ پورا کیا اور جب میری اس سے ملاقات ہوئی تھی تب سے اب تک پہلی بار اس نے سادہ، پیاری سی، بچوں جیسی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا۔

پہلی بار میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس بتیس سالہ آدمی کی جو اتنا کچھ سہنے کے بعد اب بھی شاہ بلوط کی طرح طاقتور تھا، کنپٹیاں سفید ہوچکی تھیں۔ یہ سفیدی جو بےپناہ تکلیفوں اور دکھ درد سے حاصل ہوئی تھی اس قدر شفاف تھی کہ اس کی دوہلی فوجی ٹوپی میں لگا ہوا مکڑی کا جالا بالوں کو چھوتے ہی غائب ہوگیا اور لاکھ جتن کرنے پر بھی مجھے قطعی نظر نہیں آیا۔

۱۹۴۲ء

امریکی دوستوں کے نام ایک خط

ہم بہ مشکل، دشوار جنگ تقریب دو سال سے لڑرہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ دشمن کی پیشقدمی کو ہم نے روک دینے اور اس کو پیچھے

ڈھکیلنے کا اہتمام کرلیا ہے۔ لیکن غالباً آپ کو ان مصیبتوں کے بارے میں کافی معلومات نہیں ہیں جو اس جنگ کی وجہ سے ہم کو برداشت کرنی پڑرہی ہیں۔ اور میں چاہوں‌گا کہ ہمارے دوستوں کو ان کا علم ہو۔

جنگی نامہ‌نگار کی حیثیت سے میں جنوبی، جنوب مغربی اور مغربی محاذوں پر گیا تھا۔ آجکل میں ایک ناول لکھ رہا ہوں ''وطن کے مجاہد،، جس میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اپنی آزادی کے لئے لوگ جو لڑائی لڑ رہے ہیں وہ کتنی سخت ہے۔ ناول ابھی ناتمام ہے اور اس لئے میں ایک ادیب کی طرح نہیں بلکہ اتحادی ملکوں میں سے ایک ملک کے محض ایک شہری کی حیثیت سے آپ سے مخاطب ہونا چاہتا ہوں۔

ہم میں سے ہر ایک کی زندگی میں جنگ ان تمام شدتوں کے ساتھ داخل ہوگئی ہے جو ایک قوم کی دوسری قوم کو صفحۂ‌ہستی سے مٹا دینے، نگل‌جانے کی کسی کوشش سے مخصوص ہوتی ہیں۔ محاذجنگ پر جو کچھ ہورہا ہے، جنگ کامل میں جو کچھ ہورہا ہے وہ ہم سب کی زندگی پر ایک انمٹ نقش چھوڑ چکا ہے۔ میں اپنی ماں کو کھوچکا ہوں جو ہمارے گاؤں پر جس کی جنگی اعتبار سے قطعی کوئی اہمیت نہیں ہے، ہوائی حملے کے دوران جرمن ہوائی جہاز سے گرائے ہوئے ایک بم سے ہلاک ہوئیں۔ اس کارروائی کے پیش‌نظر مقصد وہ تھا جو ڈاکوؤں کا ہوتا ہے— آبادی کو تتربتر کر دیا جائے تا کہ بڑھتی ہوئی جرمن فوج کے روبرو لوگ اپنے مویشیوں کو مشرق کی طرف ہانک کر نہ لیجاسکیں۔ جرمن توپوں کے گولوں نے میرے گھر، میری لائبریری کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ میرے بہت سے دوست — ادیب اور میرے گاؤں کے ساتھی — مجھ سے بچھڑ چکے ہیں، وہ محاذجنگ پر کام آئے۔ ایک عرصۂ‌دراز تک مجھے اپنے بال بچوں کی کوئی خبر نہ مل‌سکی۔ اس دوران میں میرا بیٹا بیمار رہا اور میں کسی طرح کی کوئی مدد نہ کرسکا۔ لیکن، بہرحال یہ نجی مصائب ہیں، وہ ذاتی رنج‌وغم جن سے ہم میں سے بیشتر کو سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ جب جنگ لوگوں کی زندگی کا جزو بن جاتی ہے تو یہ غم جمع ہوکر ایک عام، قومی المیہ بن جاتے ہیں۔ ہمارے اپنے ذاتی المئے عوام کی مصیبتوں پر جن کے بارے میں کوئی ادیب، کوئی فنکار ابھی دنیا کو باخبر نہیں کر سکا ہے، غالب نہیں آسکتے۔

آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے دیس کے وسیع خطے اور کروڑوں لوگوں کو دشمن نے، تاریخ کے سب سے زیادہ سنگدل دشمن نے ہتھیا لیا ہے۔ قدیم تاریخوں سے ہمیں ہنوں، منگولوں اور دوسرے وحشی

قبیلوں کے خون‌آشام حملوں کا حال معلوم ہوا ہے۔ ہمارے خلاف جنگ میں جرمن نازیوں نے جو ایذائیں پہنچائی ہیں ان کے سامنے سب ماند پڑجاتے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہ گاؤں اور باڑے دیکھے ہیں جنہیں مسمار کرکے زمین کے برابر کردیا گیا — یہ گھر میرے ہموطنوں کے تھے میری کتابوں کے ہیروؤں کے — اور میں نے یتیموں کو دیکھا ہے، ان لوگوں کو جن کے سروں پر چھت کا سایہ نہ تھا، میں نے خوفناک حد تک مسخ شدہ لاشیں دیکھی ہیں اور ہزاروں برباد زندگیاں۔ یہ سب کچھ ہمارے ملک میں ہٹلری لیکر آئے ہیں اپنے دیوانے رہنما کے احکامات پر۔

دنیا کے تمام ملکوں — آپ کے ملک کے لئے بھی، آپ کے گھر، آپ کی زندگی کے لئے ہٹلریت اسی کی تیاریاں کر رہی ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ آپ مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے غور کریں۔ آپ کی دوستانہ، بےلوث مدد کو ہم بہت سراہتے ہیں۔ ہمارے ملک کے لئے سامان تیار کرنے اور خاص طور پر اسے پہنچانے میں آپ جس پیمانے کی کوششیں کررہے ہیں اور جو دقتیں آپ کو پیش آرہی ہیں ان کا ہمیں علم ہے اور ان کی ہم قدر کرتے ہیں۔ میں نے آپ کے ہاں کے ٹرک وادی ڈان کے میدانوں میں دیکھے ہیں اور میں نے آپ کے ہاں کے شاندار ہوائی جہازوں کو ان جہازوں سے نبردآزما دیکھا ہے جو ہمارے گاؤں پر حملہ کرنے آئے تھے۔ ہمارے ملک میں ایک بھی شخص ایسا نہیں ہے جو آپ کی دوستانہ امداد سے واقف نہ ہو۔

لیکن میں آپ سے نہایت صاف گوئی سے باتیں کرنا چاہتا ہوں اس طرح جس طرح جنگ نے ہمکو بات کرنا سکھا دیا ہے۔ اس جنگ میں ہمارے ملک اور ہماری قوم کو کاری زخم آئے ہیں۔ ٹکر تو ابھی زور پکڑ ہی رہی ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے دوست ہمارے شانہ بہ‌شانہ لڑیں۔ ہم آپ کو میدان‌جنگ میں چلنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ہم آپ کو محض دو قوموں کی دوستی کی ہی نہیں بلکہ فوجیوں کی دوستی کی پیش کش کرتے ہیں۔

اگر محل وقوع کی بنا پر واقعی شانہ‌بشانہ نہیں لڑسکتے تو ہم یہ خبر سننی چاہتے ہیں کہ آپ کی فوجوں کی طاقتور ضربیں اس دشمن کی پشت پر پڑ رہی ہیں جو ہمارے ملک پر حملہ‌آور ہے۔

"ہم جانتے ہیں کہ آپ کی ہوائی فوج ہمارے مشترک دشمن کے صنعتی مرکزوں پر زبردست کامیابی کے ساتھ بمباری کررہی ہے۔ لیکن اگر جنگ اچھی طرح لڑنی ہے تو تمام قوتیں شامل ہونی چاہئیں۔ ہمارا مقابلہ

ایک طاقتور، چالاک دشمن سے ہے جو ہمارے اور آپ کے بھی عوام سے نفرت کرتا ہے، مہلک نفرت۔ اپنے ہاتھ خون‌آلودہ کئے بغیر اس جنگ سے نکل آنا غیرممکن ہے۔ جنگ خون کے پسینے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اگر انکار کیا گیا تو وہ دگنی قیمت وصول کرے گی۔ پس‌وپیش کا انجام ممکن ہے ناقابل تلافی نقصان ہو۔ آپ نے اپنے جگر گوشوں کا خون اپنے گھر کی دہلیز پر بہتے نہیں دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے اور اس لئے مجھے آپ سے اس طرح دو ٹوک بات کرنے کا حق پہنچتا ہے۔

۱۹۴۳ء

وہ فتح جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی

(ایک مضمون کا اقتباس)

... اگر تاریخ عالم میں اس سے زیادہ خون‌آشام اور تباہ کن جنگ جو ۱۹۴۱ء — ۱۹۴۵ء میں ہوئی تھی، پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی تو یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی بھی فوج نے اتنی شاندار فتوحات حاصل نہیں کیں جتنی سوویت فوج نے، اور نہ ہی شان‌وشوکت، قوت‌وعظمت کی اس تابناکی کے ساتھ حیران‌و‌ششدر نوع انسانی کے سامنے نمودار ہوئی۔

جب ہماری فوجوں نے مشرقی پروشیا میں آئڈکونین پر قبضہ کیا تو ریلوے اسٹیشن کی عمارت پر جرمن عبارت: "برلن ۱۰۷۳ کلومیٹر دور ہے" کے ساتھ روسی میں ایک عبارت تحریر تھی۔ ہمارے ایک فوجی نے موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا: "پھر بھی ہم پہنچ جائیں گے۔" اور نیچے دستخط کئے تھے: "چیرنووسوف"۔

کیا روسی فوجی کی لکھی ہوئی اس سادہ تحریر میں حقیقی معنوں میں پرشکوہ اعتماد کی کھنک سنائی نہیں دیتی؟ اور یہ روسی فوجی یقیناً برلن پہنچے اور بڑی بات یہ کہ انہوں نے ہٹلر کے صدر مقام کے کھنڈر میں عالمی اقتدار کے مجنونانہ خوابوں کو بھی ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا۔

صدیاں گزر جائیں گی مگر نوع انسانی ہماری بہادر لال فوج کو ہمیشہ احسانمندی کے ساتھ یاد کیا کرے گی...

۱۹۴۵ء

ویشنسکایا کے رائے دہندگان
کے ایک جلسے میں تقریر

ساتھیو!

سوویت یونین کی اعلی سوویت کی میمبری کے لئے مجھے نامزد کرکے آپ نے جو میری عزت افزائی کی ہے اور مجھ پر جو اعتماد کا اظہار کیا ہے اس کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

خود اپنے گاؤں کے لوگوں کے سامنے پیش ہوتے ہوئے مجھے خوشی ہورہی ہے۔ آپ سب مجھے اچھی طرح جانتے ہیں اور میں بھی آپ سب سے بخوبی واقف ہوں۔ اس لئے مجھے اپنے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف چند باتیں ان فرائض کے بارے میں کہوں گا جو آپ کو اور مجھے درپیش ہیں۔ سوویت حکومت اور ہماری پارٹی ہم سے چاہتی ہیں کہ جنگ کی تباہ کاریوں کا جلدازجلد ازالہ کر لیں۔ معیشت کو بحال کرنے پر ہمیں اپنی ساری کوششیں صرف کرنی چاہئیں۔ زراعت کی بحالی مادروطن کی صلاحیت میں اضافہ کردیگی۔

عام مسئلوں کے علاوہ جنہیں ہم سارے سوویت عوام کے ساتھ مل کر حل کریں گے، ہمیں اپنے ضلع کی سابقہ شان و شوکت اور حسن و دلکشی بھی بحال کرنی ہے۔ ویشنسکایا ضلع کی بحالی کے لئے حکومت نے بڑی بڑی رقمیں منظور کی ہیں لیکن ہمیں مقامی امکانات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ فریضہ یہ ہے کہ دو ایک سال کے اندر اندر اپنے تباہ و برباد ویشنسکایا گاؤں کو خوبصورت، آراستہ مقام بنا دیں جیسا کہ وہ جنگ سے پہلے تھا۔

میمبر کو بہت سارے پیچ در پیچ فرائض انجام دینے ہوتے ہیں۔ میمبر کو چاہئے کہ وہ اپنے رائے دہندگان کی تمام درخواستوں اور شکایتوں کو گوش ہوش سے سنے۔ میمبر کو سرگرم عمل کارکن ہونا چاہئے جو حکومت کے فیصلوں کی خود اپنے حلقۂ رائے دہندگان میں تعمیل کی جوش و خروش سے نگرانی کرے۔

میں آپ کے مفادات کی خدمت کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ میرا خاص پیشہ تصنیف و تالیف ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ ادبی میدان عمل میں بھی اچھا کام کروں گا تاکہ آپ کو میری وجہ سے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔

۱۹۴۶ء

اک بات مادروطن کی
(اقتباس)

سردیاں ہیں۔ رات کا وقت...

رات کی تنہائی اور خاموشی میں، میرے پیارے ہموطن اور دوست، اپنی آنکھیں بند کر لے اور یادوں کے سہارے ماضی قریب میں پہنچ جا۔ پھر ذہن کی بصارت تجھے دکھائیگی:

... ٹھنڈا، دودھیا کہرا بیلوروس کے جنگلوں اور دلدلوں پر، خالی، عرصۂ دراز سے اجاڑ، فرن کی چرمرائی ہوئی ٹہنیوں سے ڈھکی ہوئی خندقوں پر، گرتے ہوئے پشتوں اور زنگ آلود پانی سے بھرے گڈھوں پر جن کی تہ میں پڑی کارتوسوں کی پیٹیوں کی جھلک نظر آتی ہے، بھیانک انداز میں بل کھا رہا تھا...

اسمولینسک اور ماسکو کے دیہی علاقوں میں صنوبر کے درخت جنہیں گولوں کی کرچیوں نے اوپر سے نیچے تک جگہ جگہ سے کاٹ ڈالا تھا، کھوکھلی سی آواز میں کراہتے ہیں اور تند شمالی ہوا کے سامنے اپنی چوٹیاں سرنگوں کر لیتے ہیں۔

لینن کے لازوال شہر کے مضافات میں روئی کے گالوں جیسی برف تیز تیز گرتی ہے۔ جیسے اس سرزمین کے جسے ہمارے عوام متبرک تصور کرتے ہیں جنگ کے دوران لگے زخموں کے داغوں کو جلدی سے ڈھانک دینے کی کوشش کر رہی ہو۔

پھر سے جی اٹھنے والے یوکرینی کھیتوں پر جنہیں توپوں اور بموں کے بیشمار گولے بار بار جوت چکے تھے، جنہیں لڑائیوں کی گرج کڑک کا شور ابھی تک یاد ہے سائے اترتے چڑھتے نظر آرہے ہیں۔

کورسک، اوریل، وورونیژ اور تولا کی اس قدیم روسی سرزمین پر کڑکڑاتے جاڑے کی تیز برف باری ہورہی ہے اور تیز ہوا کے جھکڑ برف کو چاروں طرف اڑائے پھر رہے ہیں جو ہزاروں ٹینکوں کے بے پناہ بوجھ سے پورے تین برس تک لرزتی رہی تھی۔ پالے کی ماری آخری پتیاں درختوں سے جھڑ چکی ہیں اور وہ ہر جگہ — کھیتوں میں، شاہراہوں اور کچے راستوں پر جو بلاشبہ دنیا کی بہترین ہماری پیدل فوج کے بےشمار پراستقلال پیروں کے تلے آچکے ہیں — گیروے رنگ کے دھبوں کی شکل میں نظر آرہی ہیں گویا انسانی خون جمی ہوئی برف سے رس رس کر اوپر آرہا ہو۔

استالن گراد کے اطراف و جوانب کے بے کنار میدانوں میں جہاں زمین کے ایک ایک چپے میں ایک زمانے کے مہلک گولوں کی کرچیاں پیوست

ہیں، جہاں چنندہ جرمن فوجوں کے ڈویژن خاک و خاکستر کردئے گئے تھے، والگا کے اس پار سے آتی ہوئی غضبناک تیز ہوائیں خس و خاشاک کے ایک گولے کو رگید رہی ہیں جو اسی قدر بدنما اور ویسا ہی زنگی کتھئی رنگ کا ہے جیسے کہ جرمن ٹینکوں اور گاڑیوں کے ڈھانچے جو سارے میدان میں بکھرے پڑے ہیں۔

کرانمیانی اور نیلگوں قفقازی پہاڑیوں کے دامن میں باریک جالے کے چمچماتے ہوئے سفید تار اب بھی شفاف اور ٹھنڈی ہوا میں تیرتے پھر رہے ہیں۔ جہاں کبھی دن رات لڑائی کی گھن گرج ہوتی رہتی تھی وہاں خندقیں اور ٹولیوں کے بنائے ہوئے گڈھے جن کی کگروں پر گھنی گھاس اگ آئی ہے اب نقرئی جالے سے ڈھک گئے ہیں اور ان جالوں کے تار جن میں شبنم کے اشک نما قطرے پروئے ہوئے ہیں، بوجھ سے جھول گئے ہیں اور لرز رہے ہیں۔

اور ہر جگہ، استالن گراد سے برلن تک، قفقاز سے بحیرہ بارینتس تک، میرے دوست، جہاں بھی تیری نگاہ ٹھہریگی تجھے ان فوجیوں کی قبریں نظر آئیں گی جو لڑائی میں کام آئے، وہ قبریں جو ہماری مادروطن کو دل سے عزیز ہیں۔ اور اس لمحے تجھے ایک کسک کے ساتھ وہ بے شمار نقصانات یاد آئیں گے جو تیرے ملک کو، ہماری اپنی سوویت حکومت کی مدافعت کرتے ہوئے، برداشت کرنے پڑے تھے اور تیری یادداشت میں "ہماری مادروطن کی آزادی اور خودمختاری کے لئے میدان جنگ میں شہید ہونے والے سورما امر ہیں" کے الفاظ ایک دعا بن کر گونجیں گے۔

ماضی کو یاد کرتے ہوئے تو ضرور سوچیگا: جنگ میں کتنے لوگ یتیم ہوئے! جاڑوں کی اس لمبی رات میں جب غمناک یادوں کے لئے وقت بھی ہوگا اور موقع بھی، تو کتنی عورتوں نے، جنگ نے جن کا سہاگ لوٹ لیا، تنہائی میں اپنے سن رسیدہ چہرے کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانک لیا ہوگا اور تاریکی میں افسنتین کی طرح تلخ آنسوؤں سے اپنی انکھیوں کو جھلسا لیا ہوگا۔ بہت سے بچوں کے دل، جو سوشلسٹ مادروطن کی خاطر میدان جنگ میں کام آنے والے اپنے باپ کی موت کے غم سے ہمیشہ کے لئے مجروح ہو چکے ہیں، رات کو سوتے وقت اتفاقاً یاد آجانے پر غیر طفلانہ درد و کرب سے سہم کر رہ جاتے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو: ایک چھوٹے سے کمرے میں، جہاں برسوں سے ایک افسردہ سی خاموشی چھائی رہتی ہو، ایک بوڑھا آدمی اپنی بیوی کے پاس آئے، جس کے بال سفید ہوچکے ہوں اور جو بغیر آنسو بہائے اپنے شہید بیٹوں کا سوگ منا رہی ہو اور اس کی بے نور

آنکھوں میں جھانک کر دیکھے جن کے آنسوؤں کا ایک ایک قطرہ سوگوار ماں کے شدید المئے نے خشک کرکے رکھدیا ہو۔ اور کپکپاتی سی، تھرتھراتی ہوئی آواز میں وہ کہہ رہا ہو: "آؤ، آؤ، ماں، یوں اپنی جان ہلکان نہ کرو... غم نہ کرو... غمزدہ ہم ہی تو نہیں..." کسی جواب کا انتظار کئے بغیر وہ کھڑکی کے پاس چلا گیا ہو اور چھوٹی سی خشک سسکی کے ساتھ امڈتے ہوئے اپنے آنسوؤں کو کھنکھار کر اپنا گلا صاف کرنے کے بہانے روکا ہو اور دھندلائی ہوئی کھڑکی کو، کچھ نہ دیکھتے ہوئے دیر تک گھورتا رہا ہو...

دوست، یاد رکھنا، سوویت حکومت کے تیس سال میں سوویت یونین نے کبھی مات نہیں کھائی ہے، نہ جنگ میں نہ کسی اور کام میں خواہ کتنی بڑی مشکلیں کیوں نہ سامنے آئی ہوں۔ پچھلی ساری لڑائیوں میں سب سے بڑی لڑائی میں فتح بڑی مصیبتیں اور بے اندازہ نقصانات اٹھانے کے بعد حاصل ہوئی لیکن اپنے وطن کی آزادی کے لئے پیش کی ہوئی ان قربانیوں نے ہماری قوت سلب نہیں کی، نہ جانی نقصان کی تلخی سے ہماری ہمتیں پست ہوئیں۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ گھاس کے میدانوں کی افسنتین گھنگھنا کر پھوٹ آتی ہے اور گیہوں کے کھیتوں کے پاس لہلہاتی گھاس کی چراگاہوں پر نیلگوں دھند کی طرح چھا جاتی ہے اور جب گیہوں کے دانے پکتے ہیں تو وہ افسنتین کی تلخی جذب کرلیتے ہیں۔ اس گیہوں کا آٹا کیک اور ایسی ہی تکلفات کی چیزوں کے لئے اچھا نہیں ہوتا۔ لیکن روٹی پھر روٹی ہوتی ہے، چاہے مزے میں ہلکی سی تلخی کیوں نہ ہو۔ اور جو خون پسینہ ایک کرکے محنت کرتے ہیں ان کے لئے نعمت ہوتی ہے کیونکہ وہ انسان کو آئندہ محنت کے لئے توانائی فراوانی سے بخشتی ہے۔

جنگ میں کھائے ہوئے زخموں کو لوگ کرشماتی سرعت کے ساتھ مندمل کر رہے ہیں۔ کھنڈروں کی جگہ شہر اور گاؤں تعمیر ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے ڈانباس کی معدنی کانوں میں زندگی واپس آ گئی ہے۔ ان کھیتوں میں فصل اگ رہی ہے جن میں دو سال ہوئے گھاس پھوس اور سرکنڈے کھڑے تھے۔ جن کارخانوں میں زندگی کی روح پھونکدی گئی ہے ان کی چمنیوں سے دھواں اٹھنے لگا ہے۔ جہاں پہلے سناٹا چھایا رہتا تھا وہاں اب نئے صنعتی کارخانے قائم ہو رہے ہیں۔ سوویت باشندہ بھی جو اپنی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھ چکا ہے اور عوام کے علم و دانش کی زبردست تخلیقی قوت سے ناممکن کے ممکن ہونے کی توقع کرنا سیکھ چکا ہے،

بے منکر دم بخود رہ جائیگا اور حیرت و خوشی کے مارے سر ہلا ہلا کر کہیگا کہ دھات سازی کا ایک ازسرنوتعمیرشدہ ڈیوپیکر کارخانہ وقت مقررہ سے پہلے چالو کر دیا گیا ہے یا یہ کہ اب تک کے ایک گمنام استخانوونائٹ* نے ایک نیا کل یونینی ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔

لینن گراد کے مزدور طبقے نے — جس پر سارا ملک ناز کرتا ہے — ہر جگہ کے مزدوروں کو چیلنج دیدیا ہے کہ کوشش کریں اور پنجسالہ منصوبہ چار سال میں پورا کرکے دکھائیں۔ اور ایک نئی، خوبصورت زندگی کا خاکہ ہماری آنکھوں کے سامنے ابھرنا شروع ہو گیا ہے۔

وہ پارٹی واقعی بڑی زبردست قوت کی حامل ہے جو لوگوں کو تاریخ کے بےنظیر کارنامے انجام دینے کے لئے منظم کر سکی، ان کو تعلیم دے سکی، بسلح و یکجا کر سکی۔ واقعی عظیم اور ناقابل تسخیر وہ عوام ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنے ملک کی خودمختاری کی حفاظت کی اور تمام دشمنوں کا صفایا کردیا بلکہ دنیا میں ہر جگہ محنت کش عوام کی امیدوں کی مشعل راہ بن گئے ہیں!

ایسے عوام اور ایسی پارٹی کا سپوت ہونا، کیا میرے دوست، وہ عظیم‌ترین مسرت نہیں جو ہم اور ہمارے ہم عصر زندگی میں حاصل کرسکتے ہیں؟ اور کیا ہم کو، جو آج کی دنیا میں رہتے ہیں اپنی مادروطن کے لئے، پارٹی کے نصب‌العین کے لئے اس سنجیدہ ذمہ‌داری سے، جو ہم پر نہ صرف آنے‌والی نسل کی جانب سے بلکہ ہمارے ملک کی حفاظت میں جو لوگ لڑے اور جان دیدی ان کی متبرک یاد سے بھی عائد ہوتی ہے انتھک کوشش کرتے رہنے اور بہادری کے کارہائے نمایاں انجام دیتے رہنے کا جوش و خروش نہیں ملتا؟

* * *

۲۱ جنوری کو، لینن کی وفات کے دن، ساری دنیا کے مزدور اس انسان کو جس نے نوع انسانی کو نئی زندگی کی راہ دکھائی، خاموش خراج‌عقیدت پیش کریں گے، بالکل اسی طرح جس طرح انہوں نے ۲۴ برس

* استخانوف — اس صدی کی چوتھی دہائی کے مشہور کان کن جن کے نام سے محنت کی کارگزاری بڑھانے کی مزدوروں کی تحریک موسوم کی گئی تھی۔ (ایڈیٹر)

پہلے کیا تھا، بالکل اس طرح جس طرح وہ اس ماتمی دن سے اب تک کرتے ہیں۔ انہوں نے، عظیم پارٹی کے رہنما اور دنیا کی سب سے پہلی سوشلسٹ ریاست کے بانی نے ۱۹۱۹ء میں یہ ناقابل‌فراموش الفاظ کہے تھے:

''اس ملک میں، روس میں، دنیا کی تاریخ میں پہلی بار، ملک کی حکومت اس طرح منظم ہوئی ہے کہ استحصال کرنے‌والوں کو مستثنا کرکے، صرف مزدور اور محنت کش کسان، عوام‌الناس کی ان تنظیموں کی تشکیل کرتے ہیں جو سوویتیں کہلاتی ہیں، اور ان سوویتوں کو ریاست کا سارا اقتدار حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس کے متعلق تمام ملکوں میں بورژوازی کے نمائندوں کی افتراپردازیوں کے باوجود لفظ 'سوویت' ساری دنیا میں نہ صرف قابل فہم بلکہ مقبول ہو گیا ہے، مزدوروں کا اور تمام محنت کشوں کا پسندیدہ لفظ بن گیا ہے۔''

لینن نے کہا تھا: ''سوویت اقتدار سوشلزم کی طرف لیجانے‌والی شاہراہ ہے جو محنت کش عوام‌الناس نے دریافت کی تھی اور یہی وجہ ہے کہ یہ سچی شاہراہ ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ ناقابل تسخیر ہے۔''

ہمارے دوست جانتے ہیں کہ جنگ اور پرامن کام دونوں کے لئے ہماری قوت کا لازوال سرچشمہ کیا ہے۔

ہمارے دشمن اپنے روپیے کی نمک حلالی کرتے ہیں: بعض بھونڈے‌پن اور اپنی کرداری ڈھٹائی سے براہ‌راست بہتان لگاتے ہیں، جبکہ کچھ اور ہیں جو ''کرشماتی سلافی روح'' اور ''روسی کٹرپن'' کے بارے میں پرانے کرم‌خوردہ دلائل پیش کرتے اور ان چیتھڑوں سے اپنی رذالت اور کمینگی کی پردہ‌پوشی کرنا چاہتے ہیں اور یوں ظاہر کرتے ہیں کہ جیسے ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا ہو کہ سوویت عوام کو اپنی بےپناہ قوت کہاں سے حاصل ہوتی ہے۔

برسہابرس مصیبتیں جھیلنے اور عظیم‌الشان انقلابی جدوجہد کے بعد ہمارے عوام نے حکومت کا واحد منصفانہ نظام دریافت کیا، اس کے لئے وہ عزم و شجاعت سے لڑے، اپنے خون اور اپنی محنت سے اس کو مستحکم کیا اور اس نظام پر ان کے اعتماد کو دنیا کی کوئی طاقت متزلزل نہیں کر سکتی۔

آپ جب حالیہ ماضی کا ہمارے حال سے موازنہ کریں گے تو صاف نظر آجائیگا کہ روحانی اعتبار سے روسی اور خاص طور سے روسی کسان جنہوں نے اجتماعی کاشتکار کی حیثیت سے قابل تعریف نئی خوبیاں حاصل کرلی ہیں، کتنے بدل گئے ہیں۔

* * *

جنوری ۱۹۳۰ء میں جب ڈان کے دیہات میں کاشتکاری کو اجتماعی کرنے کا عمل جاری تھا تو میں ایک مرتبہ میلیراوو سے ویشنسکایا کا سفر گھوڑوں سے چلنے والی سلیج میں کر رہا تھا۔ مجھے اور میرے گاڑیبان دونوں کو کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ ہم ۱۶۸ کلومیٹر کا سفر کسی طرح جلدی طے کر لینگے۔ گھوڑے تھک گئے تھے، سڑک بہت ہی خراب تھی، کم ازکم لوگوں کا یہی کہنا تھا کہ بے شمار گڈھے سارے راستے ملیں گے، میدانوں میں زمین پر برف تھی اور مشرق کی سمت سے تاریک پہاڑی سلسلوں میں سے اٹھتے ہوئے نارنجی بادل خراب موسم کی غمازی کر رہے تھے۔

صبح تڑکے ہی ہم روانہ ہو گئے۔ شہر سے باہر نکل کر دہات کی بدبو کی اور چمنیوں میں سے نکلتے ہوئے دھوئیں کی دھانس رفتہ رفتہ غائب ہو گئی تھی اور ہوا میں صاف، نئی برف کی ٹھنڈک، گاڑیوں میں سے راستے کے دونوں طرف گرے ہوئے پھوس کی مہک اور گھوڑوں کے پسینے کی تیز بو نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ سردیوں کی گہری خاموشی کو برف گاڑی کی پھسلنے والی لکڑیوں کی چرمراہٹ، گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور کبھی جب سڑک کا گڈھا زیادہ ہی گہرا ہوتا تو بموں کے آڑی لکڑیوں سے ٹکرانے کا شور ہی توڑ رہا تھا۔

میرا گاڑیبان جو ایک معمر، باریش، پرشباب انداز، شرارت کی چمک لئے چھوٹی چھوٹی دھنسی ہوئی آنکھوں والا جن پر ایک گنگھریالی سی لٹ پڑی ہوئی تھی کاسک تھا اور نہایت ہی باتونی آدمی ثابت ہوا۔ شروع شروع میں، تو وہ چپ چاپ، منہ کی سیٹی سے کوئی غمگین سی دھن نکالتا اپنے ہی خیالوں میں مست، گھوڑوں کو ہنکائے چلا جارہا تھا۔ مجھے صرف اس کی چوڑی چکلی پیٹھ جس پر بھیڑ کی کھال کا کوٹ منڈھا ہوا تھا، اس کی جھریوں دار بادامی گدی اور بالوں کی وہ لٹ دکھائی دے رہی تھی جس پر برف کے گلے جمے ہوئے تھے اور جو اس کی ترچھی سموری ٹوپی میں سے نکل آئی تھی۔ لیکن جیسے ہی میں نے اس سے کچھ پوچھا تو وہ لگام اپنی گدی کے نیچے اڑس کر فوراً میری طرف گھوم گیا اور مسکراتے ہوئے میری بات کا بخوشی جواب دیا:

”آج کل ہمارے ٹکٹوں میں جو ہورہا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے... خدا بچائے اور اپنے حفظ و امان میں رکھے...“

”کیا ہورہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی، اجتماعی فارم شروع ہو رہے ہیں، اور لوگ کینوں جلسوں میں بیٹھے رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، ماسکو میں بھی اس طرح جلسے نہ کیا کرتے ہوں گے!“

”کس طرح؟“

”ارے، رات اور دن جلسے ہوتے رہتے ہیں، تین تین دن لگاتار!“

”تمہارے ہاں بہت سے لوگ اجتماعی فارم میں شامل ہو گئے کیا؟“

”دو حصوں میں بٹ گئے ہیں: آدھے شامل ہوگئے ہیں اور باقی ابھی ڈھلمل یقین ہیں اور بھیڑوں کے گلے کی طرح باڑے کے پھاٹک پر گڈمڈ جمع ہو جاتے ہیں۔ جلسہ کرنے سب بیٹھتے ہیں، اور وہاں لڑنا بھی شروع کردیتے ہیں، مرغوں کی طرح۔ سچ، بڑی ہنسی آتی ہے! میرا پڑوسی میخیئی فومیچ بوڑھا آدمی ہے، عمر کی آخری منزلوں میں۔ وہ جلسے میں سے صرف اس وقت اٹھتا ہے جب حاجت بہت ہی ستاتی ہے، جیسے بڈھوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ یوں سمجھئے وہ اب گاؤں کی سوویت ہی میں رہتا ہے، وہیں سوتا بھی، وہیں کھاتا پیتا بھی ہے۔ اس کی بڑھیا کھانے کے وقت ایک برتن میں بند گوبھی کا شوربہ لے آتی ہے۔ مگر وہاں پہنچتے پہنچتے اسے گھنٹوں لگ جاتے ہیں، برف میں سے گھسٹ کر آنا پڑتا ہے۔ تو میخیئی فومیچ ٹھنڈا برف شوربہ تھوڑا بہت چمچوں سے حلق میں انڈیل لیتا ہے اور جلسے کی کارروائی میں حصہ لینے پھر جم کر بیٹھ جاتا ہے۔ گاؤں سوویت میں اس طرح چپکتا ہے جیسے دیوار میں کیل گاڑ دی ہو... اف فو، کتنا سرگرم کارکن نکلا وہ!“

”کیا وہ اجتماعی فارم کا سرگرم کارکن ہے؟“

”کون، میخیئی فومیچ؟ جی، وہ تو دوسری طرف کا سرگرم کارکن ہے، وہ تو مالدار، متوسط کسانوں میں سے ہے۔ وہ اجتماعی فارم کی مخالفت میں تقریر نہیں کرتا۔ وہ تو چپ چاپ پچھلی نشست میں بیٹھا زہر چھوڑتا رہتا ہے۔ کبھی کوئی انجیل کا فقرہ، یا نبیں کوئی اپنے ہی دل سے گھڑی ہوئی بات۔ ابھی پچھلے دنوں میں خود اس جلسے میں گیا تھا۔ بینچوں کی کچھ کمی پڑ گئی تھی۔ اسی میخیئی فومیچ کے پاس میں ایک کگر پر بیٹھ گیا اور اس کے برابر ایک بیوہ بیٹھی ہوئی تھی، یفروسینیا میلنی کووا اس کا نام ہے۔ میخیئی فومیچ کچھ بھنبھنائے جارہا تھا اور تقریر کرنے والوں کی بات نہیں صاف تھی

منائی دے رہی تھی۔ اسی یفروسینیا میلنی کووا نے اس سے نہایت نرمی سے کہا کہ وہ چپ ہو جائے، پھر اس نے دوبارہ کہا مگر پھر بھی وہ بھنبھنائے گیا۔ ضلع کے مرکز سے پارٹی کا کوئی آدمی تقریر کرنے آیا تھا۔ وہ ہمیں اجتماعی فارم کے بارے میں سمجھا رہا تھا۔ اور میخیئی فومیچ اپنی تقریر الگ کئے جا رہا تھا۔ سرگوشی کئے جا رہا تھا کہ یہ برا ہوگا، اور یہ تو اور بھی خراب ہوگا... اور پھر اس نے یفروسینیا کو کہنی سے ٹھوکا دیا اور چپکے سے کہا: 'پہلے تو یہ لوگ ساری گایوں کو مشترک ملکیت بنالیں گے، اور پھر وہ تم سب عورتوں کو گھیر کر ایک ہی لحاف کے اندر گھسا لیں گے کہ مردوں کے ساتھ سو۔ کسی جانکار آدمی سے سنی ہے میں نے یہ بات۔' اور اس نے بھی مذاق اڑاتے ہوئے فوراً ہی جواب دیا: 'ارے، کیا ہے، میں تو غریب بیوہ ہوں، میرا کیا نقصان ہے، مگر اللہ بچائے، کہیں تمہارے پاس نہ لیٹنا پڑے! تب تو پھر مجھے اجتماعی فارم سے استعفا دینا پڑے گا۔' تو فومیچ کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس نے زیادہ اونچی آواز میں کہا: 'تیرا کیا مطلب ہے، بےشرم بیسوا کہیں کی؟' اس پر تو یفروسینیا واقعی غصے سے پاگل ہوگئی اور اس نے اتنے زور سے چلا کر کہا کہ سب سن لیں: 'میرا مطلب یہ ہے کہ پرانے کنیلیاں کی طرح تجھ میں سے چوہوں کی مینگنیوں کی بو ایک میل سے آتی ہے!' خیر تو بات سے بات نکلتی چلی گئی اور دونوں دست و گریباں ہو گئے۔ اس نے اسے بےشرم فلاں فلاں، بےدین، گنہگار وغیرہ وغیرہ کہا اور وہ بولی کہ 'تو تو اجتماعی فارم کی مخالفت کرنے پر کرے، کولکوں جیسا ہی تو ہے، دو جوڑیاں بیلوں کی ہیں، ایک جوڑی گھوڑوں کی مگر میرے پاس کیا ہے صرف ایک سہمی سسکی گائے۔' اس نے گندی سی گالی دی۔ وہ بھی جس قدر کوسنے دے سکتی تھی دیتی رہی۔ اور پھر ہاتھاپائی کی نوبت آ گئی۔ پرانی حکومت کے زمانے کی طرح فومیچ نے اس کا شال اتار پھینکا اور جھونٹے پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ یفروسینیا بھی کوئی بیوقوف عورت نہیں تھی، اس نے بھی ڈاڑھی پکڑلی۔ وہ نوجوان طاقتور عورت تھی اس لئے بکثہ بھر کے بال نوچ لائی۔ دونوں کو الگ الگ کرنا واقعی کار دارد تھا۔ میں نے فومیچ کی طرف دیکھا اس کی آدھی ڈاڑھی صاف غائب ہوچکی تھی! میں نے بمشکل ہنسی ضبط کی اور اس سے کہا: 'میخیئی فومیچ، اب ان جلسوں میں مت جانا۔ ورنہ عورتیں چوزے کی طرح تمہارے پر

نوچ کر رکھدیں گی، بدن پر ایک رواں بھی باقی نہ چھوڑینگی۔' اس نے میری طرف مغروروں کی طرح دیکھتے ہوئے کہا: 'میرے سر کا ایک ایک بال بھی نوچ ڈالیں تو بھی ان جلسوں میں جانا ہرگز نہیں چھوڑوں گا!' اتنا سرگرم کارکن نکلا وہ۔ یہ تو میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔"

"اور تم، کیا تم اجتماعی فارم میں شامل ہوگئے؟" میں نے اس سے معلوم کرنا چاہا۔

"جلدی نہیں ہے" اس نے کہا "شادی ہو یا اور کوئی خوشی کا موقع، میں کبھی کوشش نہیں کرتا کہ پہلے کرسی پر ڈٹ کر بیٹھ جاؤں۔ آخر میں بیٹھو تو سرے کی کرسی ملتی ہے۔ اور ضرورت پڑے تو سب سے پہلے اٹھ کر جاسکتے ہیں۔" اگر میں یہ اندازبیان نہ سمجھ پایا ہوں تو مزید سمجھنے کے لئے اس نے کہا: "ممکن ہے مجھے اس دسترخوان پر بیٹھنا پسند نہ ہو تو کیوں خواہ مخواہ بھیڑ میں پہنچ کر بیچوں بیچ پھنسا بیٹھا رہوں؟"

ہنستے ہوئے میں نے کہا کہ اگر اس نے بہت دیر کردی تو ممکن ہے اس دسترخوان پر جگہ ہی نہ ملے۔

"میرے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا" اس نے ضدی پن سے سر ہلا کر کہا "میں اس کا خوب خیال رکھتا ہوں۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ میں مثالی وضع کا ہچکچانے والا متوسط کسان ہوں مجھے اجتماعی فارم میں شامل ہونے کا بلاوا آیا ہے۔ گھوڑوں کی ایک جوڑی اور ایک گائے بس یہی میرا اثاثہ ہے۔ لیکن چونکہ وہ لوگ جلسوں میں مجھے ہچکچانے والا کہتے ہیں اس لئے میں ذرا اور ہچکچاؤں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ جو اجتماعی فارم ہے اس کو ذرا اور اچھی طرح سے دیکھ لوں اور لپک کر اس میں جا کر شامل ہوجانا، کیا کہنا چاہئے..."

"ڈراؤنی سی بات معلوم ہوتی ہے؟" میں نے لقمہ دیا۔

"نہیں، میں یوں آسانی سے ڈرنے والا نہیں ہوں، مگر احتیاط سے کام لینا چاہتا ہوں۔ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔ آپ مجھے یہ بتائیے: بےخطر کیا ہے — اجتماعی کاشتکار ہونا یا انفرادی؟ کس قسم کی زندگی سے مجھے بچکر رہنا چاہئے؟ بات یہ ہے کہ میں غلطی کرنے سے ڈرتا ہوں۔ جوانی میں بڑی ٹھوکریں کھا چکا ہوں۔ اور مجھے معلوم ہے کہ جدھر سے آفت کی توقع کرو ادھر سے تو آتی نہیں دوسری کسی طرف سے نازل ہو جاتی ہے، پھر خدا ہی حافظ ہے! مثال کے

طور پر میں ایک بات بتاتا ہوں آپ کو۔ کوئی تیس برس ہوئے میرے مرحوم والدین نے ایک اور نگلے میں میری شادی کے لئے لڑکی ڈھونڈی اور ہم اس کو دیکھنے گئے۔ میں بہادر نوجوان تھا مگر اس کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو دل کی دھڑکن جیسے رک گئی اور دوسرے ہی لمحے محسوس ہوا کہ جیسے وہ حلق میں آکر اٹک گیا ہو... میرے سامنے ایک ہٹی کٹی چھوکری کھڑی تھی، بڑی بڑی چمکتی ہوئی آنکھیں اور صورت ایسی موہنی جیسے حسین ترین پھول! وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور میں باوجود کوشش کرنے کے ایک لفظ نہ کہہ سکا اور سٹی گم، زبان گنگ۔

"خیر تو ہمیں کمرے میں تنہا چھوڑ دیا گیا اور ہم ایک پیٹی پر پاس پاس بیٹھ گئے۔ اور میرے منہ سے اب بھی کوئی لفظ نہ نکلا اور میں بیٹھا بیٹھا اسے آنکھیں مچکا مچکا کر اوپر سے نیچے تک دیکھتا رہا۔ ایک چیز پر میری خاص توجہ گئی: اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ، اتنے چھوٹے جیسے بچے کے ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میں سوچنے لگا تھا کہ ایسے ہاتھوں سے وہ چوشاخہ کیسے اٹھائیگی اور پھر کھیت میں وہ کیا خاک مدد دے گی؟ میرا دماغ تو کام کر رہا تھا مگر زبان تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔ ہم بہت دیر تک یونہی بیٹھے رہے اور آخر صبر کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس نے جھک کر میرے کان میں کہا: 'کہیں تم گونگے تو نہیں ہو؟' میں نے سر کے اشارے سے انکار کیا مگر بول پھر بھی نہ سکا، میں نے بولنے کی کوشش کی مگر بیکار۔ پھر اس نے گھور کر دیکھا اور تیزی میں آکر بولی: 'زبان دکھاؤ۔ راستے میں گاڑی کے ہچکولوں سے کہیں دانتوں میں آکر کٹ تو نہیں گئی۔' بیوقوف کی طرح میں نے زبان نکال کر دکھا دی... غضب ہے، آج بھی جب کبھی یاد آتا ہے تو منہ لال ہو جاتا ہے۔ کتنا احمق لگ رہا ہونگا اس وقت۔ وہ اس زور سے ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہنستے ہنستے اس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ ہاتھوں سے اپنے کیجے کو بھینچتے ہوئے اس نے بمشکل آواز دی: 'ماں، یہاں تو آؤ! ذرا اسے دیکھیو تو! یہ تو نرا احمق ہے! میں اس سے بھلا کیسے شادی کر سکتی ہوں؟' یوں ستیاناس ہوا۔

"مجھے اس پر بے حد تاؤ آیا لیکن میں بھی ہنسنا چاہتا تھا اور یہاں میں نے اس کے ہنستے ہوئے منہ کی طرف دیکھا اور میرا

دل پھر مرجھا گیا۔ اس کے دانت بے حد سفید تھے، چمکتا چمک، مضبوط اور تیز، قریب قریب اور سیدھے اور اس کا منہ بھرا ہوا تھا جیسے بھیڑیئے کے بچے کا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا: اب غور کرو۔ ایسے دانتوں سے تو وہ ایک سال کے بچھڑے کو چیر پھاڑ کر رکھ دے۔ اگر اس سے شادی کرلی تو میرا کیا حشر ہوگا؟ اگر کبھی آپس میں کچھ ان بن ہوجائے تو اپنے ہاتھوں سے تو خیر وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ پائیگی — اس کے ہاتھ ہیں ہی بہت چھوٹے چھوٹے — مگر فرض کیجئے دانتوں سے حملہ کر بیٹھی تو پھر خدا ہی بچائے؟ میری کھال کے تو وہ چیتھڑے بکھیر دیگی۔ ارے میرے سنبھلتے سنبھلتے وہ اتنی چمڑی تو نوچ ہی لائیگی کہ گھوڑے کے ساز کی کم از کم دو پیٹیاں بن جائیں۔

"معلوم نہیں یہ خوف تھا یا پتہ نہیں کہ غصہ مگر بہرحال میری زبان کھل گئی اور میں نے کہا: 'ابھی تو تم خوب ہنس لو، مگر یاد رکھنا مجھ سے شادی کے بعد کہیں رونا نہ پڑے۔' اور اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور بولی: 'دیکھا جائیگا۔ دیکھتے ہیں ہم میں سے کسے رونا پڑتا ہے۔'

"یہ بات ہم نے یہیں ختم کردی۔ اور کیا آپ کا خیال ہے دانتوں کی مدد سے وہ مجھ پر حاوی ہوئی؟ نہیں، دانتوں سے نہیں۔ جی نہیں، خدا نے ان سے تو مجھے محفوظ رکھا۔ بوڑھی ہو گئی ہے مگر منہ اب بھی دانتوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور بوڑھی کھوسٹ ان سے چیری کی گٹھلیاں اس طرح توڑ لیتی ہے جیسے سورج مکھی کے بیج ہوں۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس نے مجھے اپنے بس میں کیا۔ رفتہ رفتہ، سال بہ سال وہ راسیں کھینچتی سی چلی گئی، اور ممکن ہے میں اب چاہوں تو راس تڑا کر بھاگ نکلوں مگر اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ گھوڑے کے ساز کے اس گلوبند کو پہنے رہنے کا اب میں عادی ہو گیا ہوں۔ اپنی بدبختی کو اب میں اپنا مقسوم تصور کرچکا ہوں جیسے خارشی گھوڑا اپنی پیٹھ کی پیڑی کو۔ جب میں نشے میں ہوتا ہوں تو مجھے سنبھالنا آسان ہوتا ہے اور ہوش میں ہوں تو اس سے بھی زیادہ آسان۔ چنانچہ وہ، چڑیل جس طرح چاہتی ہے مجھے ستاتی ہے۔

"بعض اوقات ہم بوڑھے نامک چھٹی کے دن کہیں مل بیٹھتے ہیں، ایک ایک مٹکی شراب پی جاتے ہیں، پرانے وقتوں کی باتیں کرتے ہیں کس نے کہاں کہاں نوکری کی، کون کہاں لڑا، اور دوایک

کیت تانے ہیں... مگر آپ جانتے ہیں گھوڑی کا بچہ چراگاہ میں چاہے جتنی کلیلیں کرے آخر ماں کے پاس گھر لوٹنے کا وقت آن ہی پہنچتا ہے۔ خیر تو میں چاروں ہاتھ پاؤں کے بل رینگتا گھر پہنچتا اور وہاں میری بیوی بندوق کی طرح فرائی پان تانے دروازے پر ہی میرا انتظار کرتی ملتی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ ظاہر ہے میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا... ایک بات میں آپ کو ضرور بتاؤں گا: یہ میں ضرور مانوں گا کہ اس نے مجھے گھر کا دروازہ پیٹھ سے کھولنا سکھا دیا۔ میں نے چاہے کتنی ہی کیوں نہ پی رکھی ہو دروازے پر پہنچکر اپنے آپ کو یہ حکم دینا کبھی نہیں بھولتا: 'گھوم جاؤ!' اور اس طرح سے میں گھر میں داخل ہوتا ہوں، آگے آگے پیٹھ۔ یوں زیادہ محفوظ رہتا ہوں، نقصان کم ہوتا ہے۔ اگلے روز صبح جب اٹھتا ہوں تو پوری کمر میں سخت درد ہوتا ہے جیسے کسی نے اس پر دھان کوٹے ہوں۔ پلنگ کے پاس ایک کٹورے میں بند گوبھی کا کھاری پانی رکھا ہوتا ہے اور بیوی جا چکی ہوتی ہے۔ خمار ختم ہونے سے پہلے ممکن ہے میں بدلہ لوں مگر شام تک اس کا کہیں پتہ ہی نہیں ہوتا اور اپنی لالٹین لیکر اگر شیطان بھی اس کو ڈھونڈنے نکلتا تو نہ ڈھونڈ پاتا۔ قدرتی بات ہے دن چھپنے سے پہلے میرا غصہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے اور جب وہ واپس آتی ہے تو بڑے پیار سے میری طرف دیکھتی ہے اور پوچھتی ہے: 'اور اگنات پروکوفیئرویچ، کیسے مزاج ہیں؟' اور میں جواب دیتا ہوں: 'میں ٹھیک ہوں، افسوس مگر یہ ہے کہ آج صبح سے ہاتھ نہیں آئیں کمبخت، ورنہ ٹکڑے کرکے ڈالدئے ہوتے'۔"

"وہ مجھ سے ہمیشہ کہتی رہتی ہے کہ فرائی پان کے لئے شاہ بلوط کی لکڑی کا دستہ بنا دوں مگر میں بھی اتنا بھولا نہیں ہوں اس لئے نہایت سڑی سی لکڑی لیکر اتنا پتلا سا دستہ بناتا ہوں کہ فرائی پان اٹھاتے وقت ٹوٹ نہ جائے... بس یوں گزرتی جارہی ہم لوگوں کی۔

"یہ ساری باتیں میں آپ کو کیوں بتا رہا ہوں؟ اس لئے کہ آپ جانیں، جب میں نے شادی کی تو اپنی بیوی کے دانتوں سے خوف آیا لیکن اذیت بھگت رہا ہوں اس کے ساتھیوں کی۔ اب بھی یہی بات ہے: اجتماعی فارم میں شامل ہو جانے سے مجھے خوف آتا ہے، لیکن کون جانے کہیں اپنی کھیتی باڑی الگ کرنے سے مجھے کیدڑ کی طرح اکیلا بھی چیخنا نہ پڑے۔ الگ کاشتکاری کرنے پر جمے رہو مگر پتہ بھی نہ چلے اور زبان باہر لٹک پڑے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

اپنی ڈاڑھی کے اندر ہی اندر دانت دکھاتے ہوئے اس نے مجھے آنکھ ماری، تیوری پر بل ڈالکر آنکھیں چڑھائیں گویا اپنی عیارانہ نظر سے مجھے بتا رہا ہو کہ وہ اتنا سیدھا سادا اور بےضرر نہیں ہے جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے اور جو کچھ اس نے کہا تھا وہ سب میرے اوپر چھوڑ رہا تھا کہ جو چاہوں مطلب پہناؤں — مذاق سمجھوں یا چاہے سچ۔

کئی منٹ تک وہ خاموش رہا اور پھر زیادہ افسردہ لہجے میں بولا، جس میں لاابالی پن کی جھلک نہیں تھی: "میں خدا مارا کیسے جانوں کہ کیا کرنا چاہئے... چلو خیر، جیئیں گے تو دیکھینگے۔"

اچانک وہ اپنی گدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور غیرمتوقع شدت کے ساتھ گھوڑوں کی پٹائی شروع کردی اور ان پر چلایا: "کم بخت الگ کھیتی کرنے والو، تم کن سوئیاں لئے رہے تھے، کیوں؟ سکھاتا ہوں تمہیں دم ہلانا!"

برف جو ابھی تک اکادکا گالوں کی شکل میں پڑ رہی تھی اب زور سے پڑنے لگی، ہوا اور بھی زیادہ تیز ہو گئی، سڑک پر برف کے بگولے اڑنے لگے اور تھکے ہوئے گھوڑے، جن کی رانوں پر کہرے کے لچھے جم گئے تھے دلکی چلتے چلتے اب قدم پر آ گئے تھے۔

نیژنے یابلونسکوئے گاؤں پہنچتے پہنچتے ہمیں آدھی رات ہوگئی تھی۔ بڑا سا گاؤں تھا جو اب اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا۔ صرف ایک مکان کی برف جمی کھڑکیوں میں سے ہلکی ہلکی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

ہم وہاں پہنچے اور رات گذارنے کی جگہ مانگی۔ میں اندر چلا گیا اور پروکوفیئرویچ گھوڑوں کا ساز کھولنے لگا۔ نیچے سے اور ایک طرف کو جھکے ہوئے اسٹول پر پلنگ کے پاس جس پر پرانے کمبلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا ایک بوڑھا آدمی اداسی کے عالم میں کندھے جھکائے ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس کے قدموں میں بھوسے کی چٹائی پر گٹھڑی بنا ایک کالا میمنہ سو رہا تھا۔ اس کا گھنگھریالا اون مٹی کے تیل کے لیمپ کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ بوڑھے نے میرے سلام کا بڑے تامل سے جواب دیا، ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالی اور پھر گردن جھکالی اور اپنی بڑی بڑی، کھردری انگلیاں چمکتے ہوئے سیاہ گھنگھریالے اون پر پیار سے پھیرنے لگا۔

ایک بوڑھی عورت نے جو اس کی بیوی معلوم ہوتی تھی، آتش دان

کے اوپر بچھی ہوئی چوکی پر سے آواز لگائی: "ارے جاکر یہ تو بتا دو کہ اپنے گھوڑے کہاں باندھیں۔"

میرے میزبان نے بھیڑ کی کھال کا کوٹ کندھوں پر ڈالا اور چپ چاپ باہر چلا گیا۔

"آپ لوگ روز اتنی ہی دیر سے سوتے ہیں یا آپ کی کھیتی میں کچھ گڑبڑ ہوگئی آج؟" میں نے عورت سے پوچھا۔

کسی اجنبی سے بات کرنے کا موقع ملتے ہی اس نے بخوشی جواب دیا:

"ارے بھیا، کیا کھیتی ہے ہمارے پاس! لگتا ہے ہماری کھیتی باڑی کے دن تو اب پورے ہوگئے۔ اب تو یہاں نحوست کا پہرہ ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ رہ گیا ہے وہ دو بھیڑیں اور یہ چھوٹا سا میمنہ ہے۔ ہمارے خالی خالی آنگن سے گھبرا کر کتا بھی بھاگ گیا۔ رکھوالی کے لئے اب باقی ہی کیا رہا تھا؟"

کراہتے اور خرخراتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھی، آتش دان کی چوکی پر سے اپنی ٹانگیں لٹکالیں جن پر لمبے موزے چڑھے ہوئے تھے۔ لیمپ کی چمنی کے اندر سے جھلملاتی ہوئی لو کی طرف چندھیا کر دیکھا اور اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا:

"اللہ قسم، میرا بڈھا تو اپنی سدھ گنوا بیٹھا ہے۔ آج چوتھی رات ہے کہ ان کی نیند غائب ہے۔ شام کو پلنگ پر لیٹیں گے، تھوڑی دیر پڑے رہیں گے اور پھر لیمپ روشن کرلیں گے۔ میز کے سامنے جائینگے ایک بڑی موٹی سی سگریٹ بنالینگے اور ساری رات چپ چاپ بیٹھے سگریٹ پیتے رہیں گے۔ میں تو ان کی آواز تک بھول گئی ہوں۔ صبح تک سارے گھر میں اتنا دھواں بھر جاتا ہے کہ آپ مانیں یا نہ مانیں، میرا سر چکرا اٹھتا ہے اور گھٹن کے مارے سانس نہیں آتا۔ اور ان سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی: وحشیوں کی طرح مجھے گھورتے رہیں گے، ایک لفظ بھی زبان سے کہے بغیر کواڑوں کو دھڑا دھڑ بند کرکے گھر سے باہر صحن میں نکل جائیں گے۔"

روسی کسان عورتوں کے نہ جانے کب سے چلے آرہے انداز کے مطابق اس نے اپنا گال اپنے ہاتھ پر ٹکایا اور غمگین انداز میں بولی:

"ان چار دنوں میں انہوں نے بمشکل ہی کچھ کھایا ہوگا۔ کھانا کھانے بیٹھیں گے، چمچہ اٹھائیں گے اور پھر رکھدیں گے اور دوسرا ہاتھ بڑھا کر تمباکو کی تھیلی اٹھا لیں گے۔ اتنی سگریٹ پینے سے ان کا جی کیوں نہیں متلانے لگتا، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔

نہ کھانے سے گال سارے پچک گئے ہیں، رنگ مٹیالا ہو گیا ہے اور پھر بھی ہیں کہ سگریٹ پر سگریٹ پئے جاتے ہیں۔ ویسے تندرست ہیں مگر دل کو روگ لگالیا ہے، اور یہ بیماری اندر ہی اندر انہیں کھائے جارہی ہے..."

"یہ کس قسم کی بیماری ہے؟" میں نے بیماری کے سبب کا اندازہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

بڑی بی نے میرے خدشات کی فوراً ہی تصدیق کردی۔

"بیماری کیا ہوتی سوائے اس کے کہ پچھلے ہفتے ہم اجتماعی فارم میں شامل ہوگئے؟ وہ خود اپنا گھوڑا وہاں لے گئے، بیلوں کی جوڑی ہانک لے گئے اور گائے کو مشترکہ باڑے میں پہنچا آئے۔ بھیڑیں ابھی تک ہمارے ہی پاس ہیں۔ مویشیوں کے بغیر یہ جگہ قبرستان معلوم ہوتی ہے..."

آگے کو جھکتے ہوئے اس نے رازداری کے ساتھ سرگوشی کے لہجے میں کہا: "جانتے ہیں آپ، کل جاکر انہوں نے کیا کیا؟ سیب کا ایک درخت ایندھن کی لکڑی کے لئے کاٹ ڈالا۔ اور اچھا خاصا درخت۔ میں تو دم بخود رہ گئی۔ میرے بڑے میاں کہیں دیوانے تو نہیں ہو گئے! شروع فصل کے کتنے میٹھے سیب دیا کرتا تھا یہ درخت! مگر اب لگتا ہے ان کو کسی بھی چیز کا غم نہ ہوتا ہو۔ کسی چیز کی ان کو ضرورت نہ ہو۔ اتنے لاپروا ہوگئے ہیں کہ جیسے ان سب چیزوں کا کوئی اور مالک ہو۔ اجتماعی فارم میں شامل ہونے کے لئے ان کو کسی نے مجبور نہیں کیا۔ خود اپنی مرضی سے انہوں نے اپنا نام لکھا۔ مگر پھر بھی دیکھئے انسان کی حالت اس نے کیا سے کیا کردی! اس جلسے سے وہ بڑے خوش خوش واپس آئے اور مجھ سے کہا: 'لے بیوی، اب تو اور میں پنچائتی کاشتکار ہیں۔ آج میں اپنا نام لکھ آیا۔ ہم سب ملکر ساتھ ساتھ ایک انجمن میں کام کریں گے۔ شاید یہ تو نہ ہو کہ اس اجتماعی فارم میں کھانے پینے کی چیزوں کے ڈھیر لگ جائیں مگر کم از کم ہمیں اتنی سخت محنت تو نہ کرنی پڑے گی۔ اور اب ہماری عمر بھی آرام کرنے کی آ گئی ہے۔' میں رونے لگ گئی اور وہ بولے: 'اری پگلی، ہم بوڑھے لوگوں کو آسانی ہو جائیگی۔ چلو، آنسو پونچھ ڈالو۔'، مگر جب مویشیوں کو کھول کر لے چلے تو وہ کچھ اور ہو چکے تھے... مانا کہ ہماری

کائیں واپس دے دینے کا وعدہ کیا گیا ہے، مگر کون جانے، دیں، چاہے نہ بھی دیں...،،

مکان کے سامنے کے راستے پر ہمیں برف کی چرمراہٹ اور آدمیوں کی باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ بڑی بی باتیں کرتے کرتے رک گئیں اور جلدی سے اپنا پھٹا پرانا لحاف اوڑھ، منہ ڈھاک کر پڑ رہیں۔

برف میں جمے اپنے نمدے کے جوتے زور زور سے پٹخ کر چلتے ہوئے پروکوفیئے وچ گھر کے اندر داخل ہوا اور اس کے پیچھے پیچھے ہمارا میزبان۔

کھانے کے وقت پروکوفیئے وچ نے لاکھ کوشش کی کہ میزبان سے بات چیت کا سلسلہ شروع ہو جائے مگر بڑے میاں غمناک ہی چپ سادھے رہے یا صرف ''ہاں،، یا ''نہیں،، میں جواب دے کر ظاہر کیا کہ اس کا چم چچڑ مہمان وبال جان بن رہا ہے۔ کچھ برا سا مان کر پروکوفیئے وچ نے بھیڑ کی کھال کا اپنا کوٹ بینچ پر بچھایا اور سونے کے لئے لیٹ رہا۔ بڑی بی بھی اب پھر سو گئی ہوں گی اور صرف ہمارا میزبان اب بھی جاگ رہا تھا۔ وہ باہر صحن میں گیا اور جلانے کی کچھ لکڑیاں لے آیا۔ اپنے بستر کے نیچے اس نے جو آتش دان بنا رکھا تھا اس کو جلایا اور ٹانگیں پھیلا کر آگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ حرارت محسوس کرکے میمنہ بھی قریب سرک آیا۔ وہ کھڑا ہوا تو کمزور خمیدہ ٹانگیں تھرتھرا رہی تھیں۔ پھر وہ ماں کو بلانے کے لئے آہستہ آہستہ ممیانے لگا اور آخرکار بڑے میاں کی ٹانگوں کے پاس جا کر پھر لیٹ گیا اور اپنے ابلے ابلے زرد دیدوں سے آگ کو گھورنے لگا۔ اس کی لمبی لمبی ترچھی آنکھوں میں، سچ سچ شیطانی آنکھوں میں شعلوں کے قوس قزح کے سے رنگ کا عکس لہرانے لگا۔

''ذرا اس کیڑے کو دیکھئے، ابھی پیدا ہوا ہے مگر پھر بھی جانتا ہے آرام کہاں ملیگا۔،، بڑے میاں نے سر کے اشارے سے میمنے کو دکھاتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

اب جبکہ طویل خاموشی ٹوٹ چکی تھی تو میں نے ہمت کرکے سوال کیا: ''آپ بستر میں لیٹ کر سو کیوں نہیں جاتے؟،،

''نیند ہی نہیں آرہی، اس لئے۔،،

اپنے دل میں غم کا جو بوجھ لئے بیٹھے تھے وہ بظاہر اب سارے بند توڑ چکا تھا، خاموشی اب برداشت نہیں ہورہی تھی اور انہوں

نے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اپنی ذہنی ہوئی، غمناک آنکھوں سے بیچ بیچ میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا:

''بوڑھے لوگ کبھی گہری نیند نہیں سو سکتے اور پھر آجکل کے جیسے حالات ہیں تو نیند بالکل ہی غائب ہوجاتی ہے۔ دفتروں کے بابو اور شہروں کے لوگ ہمارے کسانوں کی زندگی کو سہل سمجھتے ہیں، مگر ان کو ایسا نہ سوچنا چاہئے۔ پچھلے دنوں ایک آدمی یہاں سے گذرا، ضلع کے مرکز کا کوئی نمائندہ تھا۔ میں اپنے بیل اور گائے ابھی اجتماعی فارم لیکر پہنچا تھا اور اس نے مجھ سے کہا: 'اب دادا، تم چین کا سانس لوگے۔ دنیا میں اب تمہیں کوئی فکر نہ ہوگی۔ باڑہ صاف نہیں کرنا پڑےگا، چارے کی کوئی فکر نہ کرنی ہوگی۔ جاڑا آئیگا تو تمہارا کام صرف کھانا اور سونا ہوگا۔ بہار کے موسم میں یا فصل کی کٹائی کے زمانے میں جتنا تم سے ہو سکیگا اتنا کام کرکے اجتماعی فارم کی بس مدد چاہے کردیا کرنا۔'

''غیرسنجیدہ لوگ باتیں بھی لاابالی کرتے ہیں۔ کیا میں نے اجتماعی فارم میں اس لئے شرکت کی تھی کہ میں کاہل بننا چاہتا ہوں؟ میں تو کام ضرور کروں گا، اس وقت تک کہ میرے ہاتھوں میں جان ہے، جب تک میں چلنے پھرنے کے قابل ہوں، تاکہ مارے اکتاہٹ ہی کے نہ مرجاؤں۔ اور اس کے قول کے مطابق معاملہ یوں ہے: مجھے اب اطمینان کا سانس لینا چاہئے کیونکہ مویشیوں سے چھٹکارا مل گیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ چلو پاپ کٹا۔ اور درحقیقت اس نے جو سوچا تھا اس کے مطابق قطعی نہیں ہوا۔ میں نے اپنا گھوڑا، اپنے بیل، اپنی گاڑی، لوہے کے پہیوں والی سراون، گھوڑے کے دو گلوبند اور گھوڑے کا سارا ساز جو میرے پاس تھا سب دے دیا اور اب سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں زندہ بھی ہوں یا نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے لمبی چوڑی ساری دنیا میرے لئے اندھیری ہوگئی ہو... دل کو بڑا صدمہ ہے، اور اس کا میرے پاس کوئی علاج بھی نہیں، بس غم مجھے کھائے جا رہا ہے۔ سوچئے تو، جب میں گھٹنیوں چلتا تھا تب سے گھوڑوں اور بیلوں کے پاس پلا بڑھا، زندگی بھر ان کی بدولت مجھے روٹی میسر ہوئی، ان کے ساتھ ساتھ میں بوڑھا ہوا، اور اب میرے پاس کھیتی باڑی کے کوئی مویشی نہیں ہیں اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے جنگل میں سوکھے ہوئے درخت کا ٹھنٹھ ہوں... باہر صحن میں کوئی میرا منتظر نہیں، صحن خالی پڑا ہے... ارے بھیا سمجھتے ہو

نم، صحن میں کوئی میرا منتظر نہیں؟ یا شاید تم سمجھتے ہو کہ اس قسم کا رنج انسان کے دل پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا؟

"مثال کے طور پر بیلوں ہی کو لو۔ تم حیران ہوگے کہ ان کو کتنی دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔ گرمیوں میں اور فصل کی کٹائی کے زمانے میں — رات رات بھر ان کو چرانا پڑتا ہے تاکہ وہ خوب موٹے تازے طاقتور ہو جائیں اور اس خوف کے مارے نیند کی ایک جھپکی بھی نہیں آتی کہ صبح ہوتے ہوتے کہیں وہ ادھر ادھر بھٹک نہ جائیں اور کسی غیر کے گیہوں کے کھیت کا نقصان نہ کردیں۔ دن میں کام کرنا پڑتا ہے اور جب لگاتار کئی راتوں کی نیند پوری نہ ہوئی ہو تو شرابیوں کی طرح جھومنے لگتے ہیں اور چوشاخہ اتنا بوجھل معلوم ہونے لگتا ہے کہ ہاتھ سے چھوٹ کر گرجاتا ہے۔ جب خزاں آتی ہے تو ان بیلوں کی وجہ سے کام میں غرق ہو جانا پڑتا ہے اور سارے جاڑے بھی۔ رات کو دو یا تین بار اٹھ اٹھ کر جانا اور ان کو دیکھنا پڑتا ہے۔ ناندوں میں گھاس زیادہ ڈالنی پڑتی ہے کیونکہ راتیں لمبی ہوتی ہیں اور شام کو بہت زیادہ نہیں ڈالی جا سکتی — پیروں تلے بہت روندی جاتی ہے اور برباد بہت ہو جاتی ہے۔ اور گھاس کو موسم بہار تک چلانا پڑتا ہے۔ سردیوں کے بعد بیل چاہے جتنے بھی تندرست ہوں، بہاروں میں ان کی کھلائی خوب ہی کرنی ہوتی ہے ورنہ گرم ہوائیں چلتے ہی ٹھس ہو جاتے ہیں اور پھر چل کر نہیں دیتے۔ اس کے بعد تو ان کے ساتھ میں کہتا ہوں بڑی مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔

"یہی بات گھوڑے کی ہے، اس کو بھی ایسی ہی اچھی دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے: وقت پر پانی پلانا، کھریرا کرنا، اور رات کو کہیں نکلنے سے پہلے اس کو دانہ دینا یا کٹی کھلانا ضروری ہوتا ہے... اچھا کاشتکار اپنی رات اس طرح گذارا کرتا ہے — دیکھ بھال اور کام کرنے میں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خرگوش کی طرح سوتا ہے: لگتا ہے کہ جیسے سو رہا ہو مگر اس کے کان ہر وقت کھڑے رہتے ہیں اور صبح مرغ کی بانگ کے ساتھ ساتھ اس کو اٹھ جانا چاہئے، بستر میں لوٹ لگانے کی اسے مہلت نہیں ہوتی۔

"پچاس برس سے زیادہ عرصے میں جب سے میں اپنے گھر کا مختار ہوا ہوں، ساری رات سونے کی میری عادت ہی چھوٹ گئی ہے اور اب مرتے دم نیند ہی اڑ گئی، رات رات بھر پڑا جاگتا رہتا ہوں۔

شام کو تو کچھ غنودگی ہو جاتی ہے، لیکن آدھی رات کے قریب آنکھ کھل جاتی ہے اور پھر نیند غائب۔ اور میں جاگتا رہتا ہوں۔ کل رات کو بھی تھوڑی دیر کے لئے اونگھ گیا تھا اور پھر چونک کر جاگ اٹھا کیونکہ بیلوں کو چارہ اور ڈالنے کا وقت ہو گیا تھا۔ نمدے کے بوٹ میں نے موزے پہنے بغیر ہی پاؤں میں ڈالے، بھیڑ کی کھال کا کوٹ اوڑھا اور باہر صحن میں نکل گیا۔ غلے کی کوٹھی کے پاس جاکر کہیں یاد آیا کہ مویشی تو مشترک باڑے میں ہیں اور آخرکار مجھے آسائش کی زندگی میسر آگئی ہے... اور آسائش کی اس زندگی سے مجھے دلی رنج ہوا، بدترین بیماری سے بھی خراب تھی یہ!"

... سوتے میں میری آنکھ باربار کھلی اور دیر تک مجھے بڑے میاں کی غمناک دبی دبی آواز اور خشک کھانسی کی دھسک سنائی دیتی رہی۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے پروکوفیئروچ نے مجھے جگا دیا۔ چھوٹے سے چولہے میں راکھ سے ڈھکے ہوئے کوئلے آہستہ آہستہ سلگ رہے تھے اور چھوٹے چھوٹے نیلگوں شعلے لپک رہے تھے۔ بڑے میاں اپنی نیچی بینچ پر بیٹھے، بستر کا سہارا لئے سو رہے تھے۔ ان کا ہاتھ پہلے ہی کی طرح میمنے کی پیٹھ پر پڑا تھا اور ان کی بڑی بڑی گٹھیلی لرزتی ہوئی انگلیاں گھونگھریالے اون میں خلال کررہی تھیں۔

پروکوفیئروچ کے قدموں کی چاپ سے خلل محسوس کرتے ہوئے بڑے میاں نیند میں کلبلائے مگر ہاتھ جہاں تھا وہیں رہا، سوتے میں بھی وہ میمنے کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، ننھی سی جان جو ان کی آخری ملکیت رہ گئی تھی جس کی زندگی کی حرارت انفرادی کاشتکار کی حیثیت سے ان کے حالیہ ماضی کی آخری کڑی تھی۔

* * *

گذشتہ خزاں میں استالن گراد سے لوٹتے ہوئے مجھے وہی بڑے میاں یاد آئے۔

کلاچ سے تھوڑی ہی دور جو اجتماعی فارم تھے ان میں سے ایک میں ہم آدھی رات کو پہنچے۔ ۱۹۳۰ء ہی کی طرح ہم اس واحد مکان پر پہنچے جس کی کھڑکی سے روشنی نظر آرہی تھی۔ ایک چوڑی سڑک پر جہاں گھاس اگ آئی تھی یہ ایک چھوٹا سا آخری مکان تھا۔

چاندنی رات کے اس منظر میں کچھ عجیب رقت اور پیار امنڈتا معلوم ہوا: نئے سفیدی کئے ہوئے دو رویہ مکانوں اور بلند قامت

لومبارڈی درخت حور کی قطاریں گویا ان کی پاسبانی کرتی نظر آرہی تھیں۔ ڈرائیور نے کار روکی اور قریب کی چراگاہ سے فوراً ہی میرے نتھنوں میں انستین کی تلخ مہک آئی۔

کار کی روشنی نے سرمئی احاطے کو جب روشن کردیا تو ایک شخص اوورکوٹ کندھوں پر ڈالے پورچ میں نمودار ہوا۔ تیز روشنی میں آنکھیں چندھیا کر وہ لنگڑاتا ہوا سیڑھیوں پر آیا اور آواز دی:

"تم ہو کیا، کولیسنی چینکو؟" پھاٹک پر پہنچکر اس نے مایوسی کے لہجے میں کہا: "نہیں یہ تو دوسری کار ہے۔ کون ہیں آپ؟ کہاں سے آئے ہیں؟"

"لیجئے یہ ہیں صاحب خانہ، مزاج کے اتنے سخت"، ڈرائیور نے مذاق میں کہا۔ "پھاٹک پر آن کر ابھی ہم رکے ہی ہیں اور حضرت نے پوچھ تاچھ شروع کر دی اور ابھی دیکھئے حکم دیں گے شناختی کاغذات پیش کرو۔ کیا یہاں سب اسی طرح مین میخ نکالا کرتے ہیں؟"

اوورکوٹ والا آدمی کار کے دروازے کے قریب آیا اور بھلی منساہت سے بولا:

"بیشک ضرورت پڑیگی تو شناختی کاغذات میں ضرور دیکھوں گا، رات گذارنے والے ہیں نا آپ؟ یہی تو بات ہے۔ دیر ہوچکی ہے۔ کسی اور جگہ کا میں مشورہ نہیں دے سکتا۔ اس لئے آپ کو میرے ہاں ہی ٹھہرنا پڑیگا۔ سوالات پر آپ دھیان مت دیجئے۔ یہ محاذ کی عادت ہے... ویسے یہاں میری عملداری بھی ہے، اجتماعی فارم کا صدر جو ہوں۔"

وہ راستہ دکھاتا ہوا ہمیں گھر کے اندر لے گیا۔ چوڑے سے پلنگ پر ایک بزرگ سی عورت دو بچوں کے ساتھ سو رہی تھی۔ ذرا کی ذرا اس نے آنکھیں کھولیں اور فوراً ہی پھر بند کرلیں اور ایک ایسے شخص کی نیند میں غائب ہوگئی جو حددرجے تکان کے بعد اس کے غلبے میں آگیا ہو۔ ہمارے میزبان نے لیمپ کی بتی ذرا اوپر کی اور ہم سے بیٹھنے کو کہا۔

"معاف کیجئے مگر میں بیوی کو جگاؤں گا نہیں"، اس نے دبی دبی آواز میں، قریب قریب سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ "تین راتوں کی جاگی ہوئی ہے سرکاری گوداموں میں اناج پہنچا رہی تھیں۔"

سنولائے ہوئے چہرے کی کنپٹیوں کے سفید بال اور پیشانی کی

گہری گہری سلوٹیں ہمیں بتا رہی تھیں کہ اس شخص کی زندگی عیش و آرام سے نہیں گزری۔

پنجوں کے بل چلتا ہوا وہ گیا اور ایک جگ میں دودھ لے آیا اور ہمارے پاس ہی میز کے سامنے بیٹھ گیا۔

"نوش فرمائیے۔ اس وقت تو یہی آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔"

"کیا آپ کو صدر بنے بہت دن ہوگئے ہیں؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"۱۹۴۳ء سے۔ ٹانگ میں زخم کی بنا پر طبی رائے کے مطابق جب مجھے فوج سے چھٹی دی گئی تو میں محاذجنگ سے واپس آگیا۔ اور مجھے اس فارم کا صدر منتخب کرلیا گیا۔"

دیکھنے میں وہ کم از کم ساٹھ کے پیٹے میں نظر آتا تھا اور میرے ڈرائیور نے قدرے حیرت سے پوچھا:

"آپ محاذ پر کیسے پہنچے؟ آپ جیسے عمر رسیدہ لوگوں کو تو بھرتی کا بلاوا نہیں آیا تھا۔"

ہمارے میزبان نے رعب جھاڑنے کے انداز میں مذاقاً اپنی کھچڑی مونچھوں کو تاؤ دیا اور دانت نکال دئے۔

"میں ایسے ہی پہنچ گیا جیسے کہ بیٹے تم۔ یہ صحیح ہے کہ میری عمروں کے لوگوں کو لازماً بھرتی نہیں کیا گیا تھا اور میں سن بیالیس کی گرمیوں میں جب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا تو رضاکار کی حیثیت سے شامل ہو گیا تھا۔ ہماری ضلع پارٹی کمیٹی کے سیکریٹری مجھ پر ہنسے: 'اس عمر میں بھلا وہاں کس کام آؤگے؟ ممکن ہے تم کو پیدل فوج میں ڈالدیا جائے اور پھر محاذ پر نوجوانوں کے سامنے تمہاری ہیٹی ہوجائے۔ بہتر یہی ہے کہ تم یہیں جتھے کے لیڈر کی حیثیت سے کام کرو۔ عقب میں بھی ہمیں لوگوں کی ضرورت ہے۔' اس کے جواب میں میں نے کہا: 'یہ وقت مذاق کرنے کا نہیں ہے، کامریڈ سیکریٹری، جبکہ جرمنوں نے ایک ٹکڑے کو کاٹ کر الگ کر دیا ہے۔ اگر مجھے اپنی صلاحیت پر اعتماد نہ ہوتا تو خود ہی بھرتی کی درخواست نہ دیتا۔ رہ گیا کام جتھے کی لیڈری کا تو وہ ہماری کوئی بھی ذرا عقلمند عورت کر سکتی ہے۔ دیکھئے نا ہم لوگوں پر ہی کیسی حکومت جتاتی ہیں۔'، چنانچہ میں بھرتی ہوگیا۔ پہلے پہل تو مجھے سفرمینا میں ڈرائیور بنانا چاہتے تھے مگر میں نے درخواست

کی کہ پیدل فوج میں میرا تبادلہ کردیا جائے۔ میری عمر میں یہاں کام، میں آپ کو بتادوں، کچھ سہل نہیں ہوتا۔ لیکن مجھے ہنس ہنس کے سب کچھ برداشت کرنا پڑا کیونکہ یہاں تبادلہ میں نے کہہ کر کرایا تھا۔ میں استالن گراد میں لڑا اور پھر کورسک تک آن پہنچا۔ اور پھر پروخوروو کا پہنچکر میرے لئے لڑائی ختم ہوگئی — مجھے ڈاکٹری رائے کی بنیاد پر فوج سے چھٹی دیدی گئی۔ قسمت ہی خراب ہے کم بخت۔ صرف ایک سال ہی فوج میں رہا اور تین بار زخمی ہوا۔ اور میں اتنا جوان بھی نہیں رہا تھا جتنا پہلے تھا۔ "

جب وہ اپنے قصے کے اس حصے پر پہنچا تو جوش بڑھ چکا تھا اور پہلے سے قدرے اونچی آواز میں بول رہا تھا:

"نوجوانوں کا زخم تو پلک جھپکاتے ٹھیک ہوجاتا ہے، جیسے چھوٹے چھوٹے درختوں میں دیکھا ہوگا آپ نے، لیکن آدمی بوڑھا ہو تو پھر بشکل ہوتی ہے۔ مجھے اپنے تجربے سے یہ معلوم ہے۔ دوسری بار جب میں زخمی ہوا تو مجھے تامبوف کے اسپتال میں لے جایا گیا اور وہاں کچھ لوگ ایسے تھے جن کی ٹانگیں ضائع ہوگئی تھیں۔ زیادہ عمروں والے بستروں میں پڑے رہتے، چہرہ زرد، جھریاں پڑی ہوئیں، رات رات بھر چیختے کراہتے، کروٹیں بدلتے اور اسی فکر میں گھلے جاتے تھے کہ اب اپنے بال بچوں کی پرورش کیسے کر پائیں گے اور اپاہجوں کی طرح زندگی کیسے تیر کریں گے۔ ان کے پلنگ ساری رات چرچراتے رہتے تھے۔ قدرتی بات ہے کہ ان راتوں میں جب ان کی نیندیں اڑی ہوئی ہوتی تھیں تو ان کے خیالات نہایت مایوسانہ ہوتے تھے۔ یہ بھی سمجھ لو۔ اور نوجوان، وہ ذرا بھی پروا نہیں کرتا۔ وہ رنج بہت مناتا ہے مگر کسی پر ظاہر ہرگز نہیں ہونے دیتا۔ جب وہ صبح کو اٹھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ بیسا کھیاں غائب ہیں — اسپتال میں سب کے لئے کافی بیسا کھیاں نہیں تھیں — تو جہاں جانا چاہے کسی نہ کسی طرح، ایک ہی ٹانگ پر اچھلتا ہوا، پلنگوں کے پائنتیوں کا سہارا لیتے ہوئے یا سہارے کے لئے راستے میں جو چیز بھی ملجائے اس کی مدد سے وہاں پہنچ جاتا ہے۔ ممکن ہے اچھلتے ہوئے وہ محبت کا کوئی گیت بھی گنگنانے لگے۔ یہ ہوتی ہے جوانی! اس کو دیکھ کر آپ کو اس پر ترس آئیگا اور رشک بھی اگر میں بھی بیس تیس برس چھوٹا ہوتا تو دل ہی دل میں یہی سوچتا کیوں نہ چڑیا کی طرح پھدکتا پھروں۔

"کبھی کبھی کوئی نوجوان فوجی اسپتال میں لایا جاتا تو اس کی حالت بہت ہی خراب ہوتی اور وہ بدمعاش چند ہی ہفتوں میں نرسوں سے اشارہ بازیاں شروع کردیتا، گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز کی طرح ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتا اور ایسی ایسی مسخری صورتیں بناتا کہ میں تو اپنی عمر میں کبھی ہرگز نہ بنا سکتا۔ آپ اس کو دیکھتے اور عش عش کرتے! بڑی عمروں کا فوجی اس کے مقابلے میں کم زخمی حالت میں ہر وقت پلنگ پر پڑے پڑے پیٹ میں زخم ڈال لیتا، ڈاکٹروں اور نرسوں کو تنگ کرتا اور خود اپنے وجود سے اکتا جاتا، پھر بھی وہیں پڑا رہتا، کھویا کھویا رہتا اور چھت کو تکے جاتا اور اس طرح اشد ضرورت کے پلنگ کو گھیرے رہتا جبکہ بہت دنوں پہلے ہی وہ اٹھ کر گھوم پھر سکتا تھا۔

"لیکن پھر میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ بڑی عمر کے لوگ اس جنگ میں جا کر اس لئے شامل ہوئے کہ ہم نے سوویت عہد حکومت میں جو کچھ حاصل کیا تھا دشمن ہمیں اس سب سے محروم کر دینا چاہتا تھا۔ ہم شامل ہوئے بغیر تو رہ سکتے ہی نہیں تھے۔ یہ بھی سمجھ لو...

"خود میری ہڈی گولے کی ایک کرچ لگنے سے ٹوٹ گئی اور وہ جڑتی ہی نہیں تھی۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا: 'اتنے دن اس میں کیوں لگ رہے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ پلاسٹر ٹھیک طرح سے نہ بندھا ہو، اور اس نے مجھ سے الٹا سوال کیا تھا کہ 'تمہاری عمر کیا ہے؟'، 'چھپن برس'، میں نے کہا۔ پھر اس نے قہقہہ لگایا اور کہا: 'اگر آج سے بیس برس بعد تم پھر زخمی ہوئے تو تمہاری ہڈی کبھی جڑیگی ہی نہیں۔'، میں نے تب اپنے آپ سے پوچھا تھا کہ کیا بیس برس بعد بھی مجھے لڑنا ہوگا؟ کم بخت، کیا مزیداری ہے۔

"'نہیں، شکریہ کامریڈ ڈاکٹر'، میں نے اس سے کہا 'مجھے تو نازیوں کا خاتمہ اس سے پہلے کرنا ہے۔ ایک بات تو یہ کہ ان کمبختوں نے مجھے یہ زخم لگایا اور دوسرے مجھے اتنی مہلت کہاں کہ اتنے دنوں تک ان کے پیچھے مارا مارا پھروں۔ پھر یہ کہ بیس برس بعد میں کس کام کا فوجی رہ جاؤں گا؟ اچھلتا کودتا مذاق بن چکا ہوں گا، فوجی نہیں۔ اگر میں بغیر رخصت غائب ہوجاؤں گا تو میری پلٹن کے کمانڈر کی رات کی نیند حرام نہ ہوگی اور اس وقت تک

میرا جسم ریزہ ریزہ ہو کر جھڑنے سے راستے میں جو لکیر سی بنتی جائے، اس کو دیکھ دیکھ کر میرا پیچھا کرے اور پکڑ لے۔،

”ڈاکٹر خوش مزاج تھا وہ ہنس دیا اور بولا: ’تم فکر مت کرو۔ یہ ہم ڈاکٹروں پر چھوڑ دو۔ اگر اب سے بیس برس بعد ضرورت درپیش ہوئی تو ہم اس صفائی سے تمہیں ٹھیک کر دیں گے کہ تمہارے جسم سے ایک ذرہ بھی نہیں جھڑیگا اور مرغ پٹھے کی طرح سینہ تان کر دم پھیلا کر اکڑے اکڑے پھروگے!، اس اسپتال میں میں کوئی دو مہینے رہا۔ اور واقعی انہوں نے خوب اچھی طرح پیوند لگا کر مجھے ٹھیک کردیا۔ مگر کورسک میں جو گھائل ہوا تو زخم کاری آیا تھا۔“

تھوڑی دیر بعد اس نے ایک طرح سے مدافعتی لہجے میں قصہ پھر سنانا شروع کیا: ”اس جیسے دشمن کے خلاف فوج میں بھرتی ہوئے بغیر میں کیسے رہ سکتا تھا؟ سوچئے تو ان ملعون نازیوں نے کتنی اچھی زندگی کا ڈھانچہ توڑ مروڑ کر رکھ دیا ہے! جنگ سے فوراً پہلے ہمارے اجتماعی فارم کے پاس تین ٹرک تھے، دو اسکول، ایک کلب گھر، آٹے کی چکی، ہر چیز کی افراط تھی، کھانے پینے کی چیزوں کی اور ضرورت کی ہر چیز کی۔ اور پھر جرمن ان علاقوں میں دندناتے چلے آئے اور کھنڈروں کے علاوہ کچھ نہ چھوڑا، موذی کیڑے ہر چیز برباد کر گئے۔

”۱۹۴۳ء میں جب میں گھر واپس آیا تو ھکابکا رہ گیا۔ خونی حرامزادوں نے فارم کی آدھی جائداد جلا کر خاک کر ڈالی تھی۔ باقی مکانات سے فوجیوں کے لئے زمین‌دوز رہائشی جگہیں بنالی تھیں۔ اسکولوں کو آگ لگا دی تھی۔ ہمارے پاس ایک سو اسی جوڑی بیل تھے جن میں سے صرف دو جوڑی بیل بچے تھے۔ گھوڑا ایک بھی نہیں بچا تھا اور ہمارے پاس جو ٹریکٹر تھے وہ سب توڑ پھوڑ ڈالے گئے تھے۔ تو اس طرح ہمیں سب کچھ بالکل شروع سے شروع کرنا پڑا۔

”کھیتوں میں کام کرنے کے لئے عورتیں اور بچے ہی تھے اور ٹریکٹر چلانے کو لڑکے اور لڑکیاں۔ ایک دفعہ عجیب واقعہ ہوا: بہار کا زمانہ تھا۔ میں جو گھومتا ہوا ایک کھیت میں پہنچا تو دیکھا کہ کھیت میں ایک ٹریکٹر کھڑا ہے انجن چل رہا ہے اور آس پاس کسی کا نام و نشان نہیں۔ ڈرائیور کہاں غائب ہے اور ٹریلر پر کام کرنے والا کہیں گیا۔ میں یہی سوچتا ہوا کھیت کے

برابر سرے پر درختوں کے ایک جھنڈ میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دونوں وہاں موجود ہیں۔ درختوں پر چڑھے پرندوں کے گھونسلوں سے انڈے نکال رہے ہیں۔ دونوں بچے تھے زیادہ سے زیادہ کوئی پندرہ برس کے ہونگے۔ ان سے بھلا اور کیا توقع کی جاسکتی تھی؟ اور پھر بھی سچ پوچھئے تو وہ دو بڑے آدمیوں کا کام کر رہے تھے، سخت محنت کا کام۔ رات کو ٹھنڈ زیادہ پڑ جائے تو ٹریکٹر کے انجن کو چالو کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا کہ ان ڈرائیوروں میں سے کوئی لڑکی دو کلومیٹر دوڑتی، کھیتوں کو پار کرتی، مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلوں سے ٹھوکریں کھاتی اور زور زور سے ہاتھ ہلاتی چلی آرہی ہے۔ ’کورنٹی واسی‌لیوچ، اچھی ذرا، دو چار ہینڈل مار دیجئے، مجھ میں تو ذرا دم نہیں ہے!، آپ ہی بتائیے لڑکی میں بھلا کہاں دم ہوتا ہے کہ وہ ہینڈل مارے؟ پیٹ پھٹ جائے، آنتیں باہر آجائیں۔ ہم مرد زیادہ سخت جان ہوتے ہیں پھر بھی اتنا زور پڑتا ہے کہ کمر چٹخ کر رہ جاتی ہے...

”اور عورتیں؟ فارم میں ان کو جو کام کرنا پڑتا اسے دیکھ کو تو قسم ہے خدا کی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ گھر میں بھی اس کو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے کھانا پکانا ہوتا ہے، بچوں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے، خانہ‌داری کے سارے کام کرنے ہوتے ہیں اور فوجی شوہر کی ہر وقت فکر الگ لگی رہتی ہے۔ اس کے پاس اتنا کام ہے کہ جو اس کے بس سے باہر ہوتا ہے اور پریشان کن خیالات اتنے ہیں کہ سوچ ہی نہیں سکتی...

”ایک بار میں صبح اندھیرے ہی کھیت کی طرف سے گزرا اور اپنی پڑوسن کو گائے کے لئے چارہ کاٹتے ہوئے پایا۔ اس کا شوہر لڑائی میں کام آیا تھا اور اس کو چار بچوں کی پرورش کرنی تھی۔ میں اس کے پاس گیا کہ کچھ ہاتھ ہی بٹالوں۔ مگر اس نے ایسی تیز نگاہوں سے دیکھا کہ میں واقعی تھرا کر رہ گیا۔ کھیتوں کے پڑاؤ پر پہنچنے کے بعد پہلا جو کام میں نے کیا وہ یہ تھا کہ ایک سگریٹ پی۔ سگریٹ پینا میں ترک کر چکا تھا۔ محاذ جنگ پر میں نے سگریٹ بالکل نہیں پی۔ مگر یہاں تمباکو لیکر بنائی اور پھر بیٹھ کر پی۔ اس نے جن نظروں سے مجھے دیکھا تھا انہوں نے پھر میرے دل میں ایک خنجر سا بھونک دیا تھا۔“

ایک لمحے کسی سوچ میں غرق وہ میز پر انگلیوں سے طبلہ بجاتا رہا اور پھر بولا:

''آپ کو معلوم ہے ہمارے ہاں ایک پرانا گیت ہے، عورتیں گایا کرتی ہیں:

''میرے محبوب پر جنگ بہت بھاری ہے
بڑا بوجھ ہے اس کے دماغ پر ایک تو بندوق
ہے نشانہ لگانے کے لئے
اور اس پر میری فکر ہے...''

ایک مسرت خیز پرشباب مسکراہٹ سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

''اپنے بارے میں بڑی اونچی رائے ہے ان کی، ہماری عورتوں کی، اور ہے بھی درست! یہ صحیح ہے کہ لڑائی میں وہ ہمیں دن رات یاد آتی رہیں۔ جب لڑائی واقعی گھمسان کی ہوتی تو وہ ایک گھنٹے کے لئے سرے سے سب کچھ بھول جاتے اور پھر گھر کی یاد بری طرح ستانے لگتی۔

''جب میں واپس گھر آیا اور دیکھا کہ عورتیں کس طرح کام کر رہی ہیں تو احساس ہوا کہ وہ اپنے کندھوں پر جو بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں — تو ان پر بھی ویسا ہی سخت وقت آن پڑا ہے جیسا وہاں ہم پر پڑا تھا۔

''جب میں محاذ پر تھا تو مجھے ایک تحفہ ملا۔ وہی جو عام چیزیں ہوتی ہیں — تمباکو کی کشیدہ کاری کی ہوئی ایک تھیلی، رسک اور ایسی ہی دوسری چیزیں۔ اور ان کے ساتھ ایک خط تھا جو ماسکو کی کسی عورت کا تھا جو فیکٹری میں کام کرتی تھی۔ اس نے لکھا تھا: 'پیارے سپاہی، میں تمہیں ایک پارسل اور پرجوش تسلیمات بھیج رہی ہوں۔ دشمن کی خوب مرمت کرنا۔ یہاں ہم دفاع کے لئے دن اور رات کام کر رہے ہیں اور ہمیں ہر وقت تم لوگوں کا ہی خیال لگا رہتا ہے۔' خیر تو آگے لوگ عام طور سے اور بھی جو باتیں لکھا کرتے ہیں، صحت اور سلامتی کی دعائیں وغیرہ کی وہ سب خط میں تھیں۔

''ان دنوں ہم کورسک کے معرکے میں تھے اور صورت حال بڑی نازک تھی۔ گینڈیوں کی طرح جرمن ٹینک بڑھتے چلے آتے تھے اور ہم جی توڑ محنت کر کے ایک لمحے کی مہلت کے بغیر جوابی حملے کئے جا رہے تھے، ہر بار جب زندہ واپس آتے تو حیرت ہوتی کہ

باقی کیسے بچے اور پھر یہ پارسل آگیا... خندقوں میں ہی تھا کہ مجھے لا کر دیا گیا، اور کیا آپ یقین کریں گے اس پر میں واقعی رو دیا... میں سگریٹ پیتا نہیں تھا اس لئے تمباکو کی تھیلی میرے کام کی نہیں تھی، لیکن رسک میں نے ضرور کھائے اور ان پر تلخ آنسو بہائے... میں سوچنے لگا، دیکھئے ایک محنت کش عورت ہے، جسے ہماری طرح ہی دن رات کام سے فرصت نہیں ملتی، ہم لوگوں کے لئے جو محاذ پر ہیں، کام کر رہی ہے اور پھر بھی اس کو میرا اتنا خیال رہا۔ ممکن ہے اس نے اپنے حصے سے بچا بچا کر یہ رسک میرے لئے جمع کئے ہوں؟ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے یہ رسک مجھے اور بھی زیادہ میٹھے معلوم ہوئے...''

اس نے اپنی کھچڑی مونچھوں پر انگلیاں پھیریں اور دانت نکال کر ہنسنے لگا:

''ہنسی کی بات بھی تھی۔ جب اس نے پارسل بنایا ہوگا تو شاید وہ کسی نوجوان فوجی کے بارے میں سوچ رہی ہوگی اور ملا یہ مجھ جیسے بڈھے کھوسٹ کو...

''لڑائی کے دنوں میں ہمارے ہاں کی عورتوں نے بڑا بوجھ اٹھایا۔ انہوں نے اپنی ذرا فکر نہ کی، جانتی تھیں کہ سوویت ریاست کو ان کی محنت کی کتنی سخت ضرورت تھی۔ میرا بڈھا اور مختل دماغ تو یہ کہتا ہے کہ انہوں نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ یادگار قائم ہونی چاہئے۔''

... ابھی مجھے سوئے ہوئے ایک گھنٹہ ہی ہوا ہوگا کہ کسی کار کے ہارن سے چونک کر آنکھ کھل گئی۔ میرے میزبان کی آواز باورچی خانے سے آئی:

''کیا مطلب اتنی دیر کیوں کردی کولیسنی چینکو تم نے؟ تمہیں یہاں گھنٹوں پہلے پہنچ جانا چاہئے تھا۔ کیا تمہاری تفریح کے مارے ٹریکٹر خالی کھڑا رہے؟ میں دیکھتا ہوں، تمہیں ذمہ داری کا ذرا احساس نہیں ہے۔ تمہارے بتائے بغیر، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ٹائر اچھے نہیں ہیں۔ اچھے ٹائر ہوں تو کار کوئی بھی چلا سکتا ہے۔ لیکن خراب ٹائروں سے اتنا ہی عمدہ کام لے سکو تو یہ ہوئی تمہاری بہادری۔ اچھا اب پھرتی دکھاؤ اور پیٹرول لیکر کھیت میں پہنچاؤ۔ سیمیون سے کہنا اجالا ہوتے ہی میں بھی آرہا ہوں۔''

روشنی کئے بغیر ہی وہ کمرے کے اندر آ گیا، اپنے پلنگ پر بیٹھا اور بوڑھے آدمی کی طرح کانکھتے ہوئے اپنے بوٹ اتارنے لگا۔ میں پھر

سو گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد کھڑکی کے شیشے پر کسی کی دستک سے پھر آنکھ کھل گئی۔

”سنئے، کورنٹی واسی‌لیویچ“، ایک آدمی کی زوردار بھاری آواز سنائی دی۔ ”دوسرے جتھے کی بیل‌گاڑیاں واپس آ گئی ہیں۔ غلہ بھرنا شروع کردیں یا صبح ہونے کا انتظار کریں؟ بیل تھک کر چور ہو گئے ہیں۔“

میرا میزبان اٹھکر کھڑکی کے پاس گیا اور دبی دبی آواز میں احکامات جاری کر دئیے:

”کہنا غلہ فوراً لادنا شروع کردیں اور روانہ ہو جائیں۔ ذرا ٹھہرو، ہم ساتھ ہی کھلیان چلتے ہیں۔“

مجھے اس کے واپس آنے کی آہٹ نہیں ہوئی۔ لیکن ابھی اندھیرا ہی تھا کہ اسے پھر کسی نے آن کر جگادیا۔ اسے اٹھ کر مشین اور ٹریکٹر اسٹیشن ٹیلیفون کرنے کےلئے فارم کے دفتر جانا پڑا کیونکہ ایک ٹریکٹر چلتے چلتے خراب ہو گیا تھا۔ صبح ہونے سے پہلے اسے تین مرتبہ اور جگایا گیا۔

صبح کو ہمارے ڈرائیور غریب نے سوتے میں جس کی آنکھ باربار کھلی تھی، سرد آہ بھرتے ہوئے میزبان سے کہا: ”اف فو، کیا زندگی ہے یہ بھی! یہاں سونا تو جیسے کسی کلب میں سونا ہے جہاں بینڈ باجا زور شور سے بج رہا ہو۔“

”یہاں چین اور سکون کہاں“، ہمارے میزبان نے جو کپڑے پہنکر تیار ہوچکا تھا، پرتکان مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”فارم بڑا ہے، کام بہت ہے اور اس لئے ہمیں راتوں کو بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ جاؤ جا کر پھر سوجاؤ۔ اب کوئی نہیں آئیگا۔ میں جا رہا ہوں۔ آدھ گھنٹے میں بورڈ کا جلسہ ہونے والا ہے۔“

میں نے اپنی گھڑی میں دیکھا: ساڑھے چار بجے تھے۔

”صبح پانچ بجے بھی کہیں جلسے ہوا کرتے ہیں؟“، ہمارے ڈرائیور نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہیں ہے، بیٹے۔ دن کے وقت بورڈ میمبروں کو ایک جگہ جمع کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا: ایک اناج لاد رہا ہوگا، دوسرا کھیتوں میں ہوگا، تیسرا استالن گراد جارہا ہوگا تاکہ وہاں سے فاضل پرزے لیکر آئے اور مجھے بھی تڑکے سے پہلے کھیتوں میں پہنچنا ہے۔ اسی لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ سویرے سویرے جلسہ کرکے جلدی سے مسئلے طے کرلیں۔ ہم سب کے سامنے ایک ہی مقصد ہے: جتنی جلدی

ہو سکے اتنی جلدی فارم کو اپنے پیروں پر کھڑا کردیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ دوسرے فارموں کے مقابلے میں زیادہ غریب ہوں۔

”اس بات کو سامنے رکھئیے کہ حکومت ہمیں کتنی امداد دیتی ہے تو ایسا ہونا ہمارے لئے شرم کی بات ہوگی۔ اسی سال ہمیں دوسری سٹینوں کو اگر چھوڑ بھی دیا جائے تو تیس سے زیادہ نئے ٹریکٹر ہی ملے۔ یہ کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے! ہم چڑھائی چڑھتے جا رہے ہیں، اور بہت تیزرفتاری کے ساتھ۔ امسال فصل اچھی ہوئی تھی۔ پارسال کی بہ‌نسبت ہم نے خزاں میں زیادہ زمین جوتی تھی اور سرمائی فصل ہم نے چار سو ہیکٹر فاضل زمین پر بوئی۔

”یہ دیکھتے ہوئے کہ پارسال کے سخت سوکھے کے باوجود ہم ڈوبے نہیں تھے تو اب ہمیں بڑھنے سے روکنےوالا بھی کوئی نہیں ہے! یہ بھی سمجھ لو۔“

”کیا سوکھے سے نقصان بڑا ہوا تھا؟“، ڈرائیور نے دریافت کیا۔

”ہوا بیٹے، بہت ہوا! مگر ہم ڈٹے رہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسا سوکھا اگر پرانے وقتوں میں پڑتا تو آدھی آبادی بھوکوں مر گئی ہوتی۔ پہلے کسانوں کی زندگی کیا ہوتی تھی؟ ایک بھوکوں مر رہا ہوتا تو دوسرے مالدار آدمی کے کھلیان اناج سے بھرے پڑے ہوتے، مگر پھر بھی اپنے پڑوسی کی امداد کےلئے وہ انگلی تک نہ ہلاتا۔ اور حکومت کے افسروں کو بھلا کیا غرض پڑی تھی۔ آج‌کل کی بات ہی بالکل الگ ہے۔ جب سوکھے کی وجہ سے ہماری حالت خراب ہوئی تو ریاست نے ہمیں اناج دے کر، بیج دے کر سہارا دیا۔ ہم نے جس طرح بن پڑا لوگوں کی مدد کی، مشکل کے دن کٹوائے اور سب زندہ سلامت بچ رہے۔

”اف فو، اس بہار میں ہم نے کتنی محنت سے کام کیا! کچھ آدمیوں کی تو ہڈی سے چمڑی لگ گئی تھی اور لگتا تھا کہ جیسے ہوا کا ایک ہی جھونکا ان کو اڑا لےجائیگا۔ مگر پھر بھی وہ سب کے ساتھ کام کرنے آئے اور جتنا بن پڑا کیا۔ ہمارے لوگ، آپ جانتے ہیں، خالص سونا ہیں سونا۔ یہ بھی سمجھ لو۔“

... سورج نکلتے ہی ہم‌لوگ گاؤں سے روانہ ہو گئے۔ باہر سڑک پر آئے تو بھینی بھینی خوشبو نے تازگی بخشی۔ دریائے ڈان کی طرف سے ٹھنڈی ٹھنڈی، سیلی ہوا آرہی تھی۔ بوجھل بادل آسمان میں اتنے نیچے اڑتے پھررہے تھے کہ ڈر تھا کہیں اونچے اونچے حور کے درختوں کی پھننگوں میں اپنے پروں کی گلابی گلابی مغزی سمیت اٹک نہ جائیں۔

صبح سویرا ہونے کے باوجود اناج کی کوٹھیوں کے چاروں طرف بھیڑ لگی تھی، شور مچ رہا تھا۔ دو بوڑھے آدمی اناج چھان رہے تھے اور کوئی دس بارہ بیل گاڑیاں جو غلہ پچھوڑنے کے صحن سے ابھی ابھی آئی لگتی تھیں، کونے والی کوٹھی کے قریب خالی کی جارہی تھیں۔ وہیں ایک چھوٹا ٹرک بھی کھڑا تھا اور ڈرائیور ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ روئی کی صدری پہنے جس کے سارے بٹن سامنے سے بالکل کھلے ہوئے تھے اور اونچی سی سموری ٹوپی لگائے، ٹائر میں جوش سے ہوا بھر رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر بےآواز مگر سمجھ میں آجانے والی گالیاں تھیں۔

ہم اپنی راہ چلتے چلے گئے اور ابھی کوئی تین کلومیٹر آئے ہوں گے کہ ایک بالکل نیا ٹریکٹر سڑک سے تھوڑی ہی دور چلتا ملا۔ اتنا نیا تھا کہ ابھی اس کا روغن بھی ہلکا نہیں پڑا تھا۔ ایک آدمی فوجی اوورکوٹ پہنے اس کے پیچھے لنگڑاتا چلا جارہا تھا۔ وہ چند قدم چلتا اور ایک ٹہنی سے جتائی کی گہرائی ناپتا جاتا تھا۔

''ارے یہ تو فارم کے صدر ہیں چڑیوں کی طرح دانا چگتے پھر رہے ہیں!،، ڈرائیور نے خوشی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اس کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔ ''لنگڑا شیطان تو سر پر سوار رہتا ہے! اپنے ٹریکٹر ڈرائیوروں کو کم گہری جتائی تو وہ ہرگز کرنے ہی نہیں دے گا، شرط لگا سکتا ہوں اور لاپروائی سے بنی نہیں۔ میں نے روانہ ہونے سے پہلے راستہ پوچھنے کے بہانے یونہی ذرا کھلیانوں میں جھانک کر دیکھا تھا۔ پٹے پڑ رہے ہیں اناج سے! یہاں کے لوگ اس سے بہت خوش ہیں۔ کہتے ہیں: 'بڑےمیاں ہیں تو سخت مزاج مگر صدر بہت ہی اچھے ہیں۔ ہر کام انصاف سے کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں کام عمدہ اس لئے ہو رہا ہے کہ وہ ہماری عزت کرتے ہیں اور ہم ان کی۔' میں نے ان لوگوں سے کہا کہ اس کے گیر میں ایک لمحے نیند نہیں آئی۔ فارم کے کام سے وہ رات بھر اٹھتا رہا باہر جاتا اندر آتا رہا۔ وہیں ایک بڑےمیاں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: 'ہمارے صدر آرام کیا ہوتا ہے اس کے معنے جانتے ہی نہیں۔ مگر جو کرے میوا وہی کھائے میوا۔ اگر ہم نے اس سے کم محنت کی ہوتی تو دو سال میں فارم اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو جاتا!'،،

دور چوڑی سبز لہروں کی شکل میں سرمائی کھیت گزر گئے اور ان کا حسن دیکھ کر ڈرائیور ششدر رہ گیا۔

''وہ سرمائی کھیت بھی اس فارم ہی کا ہے۔ دیکھئے کتنی عمدہ فصل ہو رہی ہے! کورنئی واسی لیوچ ساری رات لوگوں کی تعریفیں کرتے رہے

مگر میں تو کہتا ہوں کہ لوگوں کا رہنما اچھا ہو تو ہم واقعی بہت ہی اچھا ہوتا ہے۔ یہ بھی سمجھ لو۔،، اور اس نے فارم کے صدر کے تکیہ کلام کو ہنستے ہوئے دوہرا کر اپنی بات ختم کر دی۔

* * *

کورسک کے علاقے کے استاری اوسکول ضلع کے ''نووی میر،، اجتماعی فارم میں جتھے کی سب سے بوڑھی لیڈر پیلاگیئیا واسی لیونا مارتی نووا نے ۱۹۴۶ء کے سوکھے کا المناک زمانہ یاد کرتے ہوئے کہا جبکہ گیہوں کے کلے پھوٹے اور دیکھتے ہی دیکھتے مرجھا کر ختم ہو گئے:

''ساری محنت پر پانی پھرتے دیکھ کر رنج ہوا۔ مگر ہماری محنت کو بھی جانے دیجئے۔ سوکھے سے اجتماعی فارم کو نقصان ہوا، پورے ملک کو! مرجھائے ہوئے چٹخے ہوئے کھیت دیکھ کر ایسا جی کڑھتا کہ بن پڑتی تو اپنے آنسوؤں سے اسے سیراب کر دیتی!،،

۱۹۴۷ء میں عمدہ فصل پیدا کرنے کے لئے ہماری حکومت نے کورسک کے علاقے کے اجتماعی کاشتکاروں کے ایک بڑے گروہ کو تمغے دئے ہیں۔ پیلاگیئیا مارتی نووا اسی گروہ میں شامل تھیں اور ان کو سوشلسٹ محنت کے ہیرو کا خطاب ملا تھا۔ تقریر میں انہوں نے کہا تھا:

''آج میں نے اپنی پوری زندگی، ایک ایک دن کرکے یاد کی۔ مجھے اپنا بچپن یاد آیا اور اپنی بیاہتا زندگی۔ کچھ اچھے، پرمسرت دن میرے گذرے ہیں لیکن آج جو خوشی میں محسوس کر رہی ہوں ایسی مسرت کبھی میسر نہیں آئی تھی... اس سے اور بھی زیادہ محنت سے کام کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے، لیکن کام چاہے جتنا زیادہ کیوں نہ کر لیں مجھ جیسے عام لوگوں کے لئے ریاست جو حیرت انگیز فکر و تردد کرتی ہے اس کے مقابلے میں یہ پھر بھی تھوڑا ہی معلوم ہوتا ہے۔''

اپنے شاندار وطن کی خدمت کرنے کی آرزو میں ہر میدان میں لاکھوں سوویت لوگ سخت محنت سے کام کر رہے ہیں۔

پیاری، محبوب مادروطن! ہماری ساری بے پناہ فرزندانہ محبت تیرے لئے ہے، ہمارے خیالوں میں تو ہی بسی ہوئی ہے!

۱۹۴۸ء

حامیان امن کی کل یونینی کانفرنس میں تقریر سے اقتباس

کامریڈ ڈیلی گیٹو!

میرے پیارے ہموطنو اور ساتھیو جو نوع انسانی کی تاریخ کے انتہائی نیک مقصد کے زیر قیادت اور زیر عنوان متحد ہیں!

کامریڈ غیرملکی دوستو جو ہمارے دل کے قریب اور دماغ میں بسے ہوئے ہو! آپ سے کوئی شعلہ بیان مقرر نہیں بلکہ ایک مصنف مخاطب ہے جو عام لوگوں سے ہم کلام ہونے کا عادی ہوتا ہے۔

زبان کی سادگی کے لئے میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں مگر یہ سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ وہ شخص بھی جسے خطابت پر قدرت حاصل نہیں ہوتی، اس وقت تقریر کرنے کھڑا ہوجاتا ہے جب زندگی زندگی کے نام پر اپیل کرتی ہے...

ہمارے عظیم ملک، دنیا کے عظیم‌ترین ملک — ہماری مادروطن نے جس نے مادہ شاہین کی طرح ۱۱۱ قومیتوں کو اپنے طاقتور پروں میں پناہ دی ہے — ہمیں یہاں لاکر جمع کیا ہے تاکہ نئی جنگ شروع کرنے کی خواہش کرنے والوں کی ہم عوام کی جانب سے غضبناک اور پرعزم مذمت کریں۔ ہم لوگ جو یہاں جمع ہوئے ہیں ان میں شاید ایک بھی ایسا نہ ہو جسے جنگ نے سوگوار نہ کیا ہو، جو پچھلی جنگ کے لگائے ہوئے زخم اپنے دل میں دبائے نہ بیٹھا ہو...

سرمایہ‌دار اور ان کے خدمتگار ایک نئی جنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے منافعوں کی خاطر، اپنی حیوانی خیروعافیت کے لئے ہم اپنے بچوں کو، خود اپنے آپ کو قربان کر ڈالیں...

وہ ایسا ہرگز نہ کرپائیں گے!

جو لوگ اپنی دیانت‌دارانہ محنت سے تابناک مسرت حاصل کرنے کا اپنا حق حاصل کر رہے ہیں وہ عزم کے ساتھ کہتے ہیں: ''ہمیں امن چاہئے!''

یہ بات وہ امن کانگرسوں میں کہہ چکے ہیں۔

جو لوگ محنت کش نوع انسانی کے خون سے خوش‌حالی حاصل کرنے کے اب بھی خواب دیکھ رہے ہیں انہیں اس سے خبردار ہوجانا چاہئے۔ بہتر ہے کہ وہ اس کی آس چھوڑ دیں۔

دیانت‌دار برطانوی یا امریکی فوجی، کسی بھی ملک کی وردی پہنے ہوئے

کوئی بھی فوجی خود اپنے جیسوں کے خلاف جو اس کے لئے صرف ایک چیز کے۔ پرمسرت انسانی زندگی کے خواہشمند ہیں — جنگ کرنے ہرگز نہیں نکلے گا۔

جو لوگ نئی جنگ شروع کرنی چاہتے ہیں ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ عوام کا فیصلہ سب فیصلوں سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔

ہم مستقبل کی جانب صاف طور سے دیکھ رہے ہیں، ہمیں اپنے مستقبل پر پورا اعتماد ہے۔

ہمارے ملک میں جہاں دماغی اور جسمانی محنت کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے، ہم ایک دوسرے سے برابروں کی طرح ملتے ہیں۔ آخر میں میں آپ کو اپنی اس گفتگو کے بارے میں بتانا چاہوں گا جو ایک ''عام آدمی'' سے ہوئی تھی...

وہ ایک معمولی ٹریکٹر ڈرائیور تھا، بیشماروں میں سے ایک۔ وہ اعزاز کے ساتھ جنگ میں لڑا تھا اور برلن میں جاکر اس کو ختم کیا۔ وہ چار بار زخمی ہوا اور ہر بار تندرست ہوتے ہی صفوں میں واپس پہنچ گیا تھا۔ ہم نے عام طور پر زندگی کے بارے میں تبادلۂ خیالات کیا، مستقبل کے بارے میں باتیں کیں اور اس نے جو کچھ کہا تھا وہ یہ تھا:

''میرا سینہ چوڑا ہے اور اسی طرح سوویت یونین کا بھی۔ ہم سب کچھ برداشت کرلے جائیں گے!..''

۱۹۴۹ء

ہمارے عظیم الشان تعمیراتی پروجیکٹوں میں سب سے پہلا

(ایک مضمون کا اقتباس)

روستوف بر ساحل ڈان سے لیکر تسملیانسکی گاؤں تک راستے کے دونوں طرف اناج کے کھیت بہار کی طغیانی کے بپھرے ہوئے پانی کی طرح لہریں مار رہے ہیں۔ مسرور آنکھیں جہاں تک دیکھ سکتی ہیں اس سے بھی آگے تک وہ پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ کو بخوبی علم ہے کہ اپنے تین سو کلومیٹر کے اس سفر کے دوران میں آپ نے جو کچھ دیکھا ہے وہ پورے ملک کی فصل کا محض ایک ذرہ ہے مگر پھر بھی آنکھوں کے سامنے جو کھیت ہیں وہ بے کنار معلوم ہوتے ہیں۔ بچپن میں آپ زمین کے جس مختصر سے گوشے میں رہتے تھے وہ بھی ایسا ہی وسیع اور لامتناہی معلوم ہوتا تھا...

جو رنگ جولائی میں عموماً گرم خطوں کی طرح نہایت ھی شوخ ہوتے ھیں اور قدرت انہیں اس قدر فضول خرچی کے ساتھ استعمال کرتی ہے بدلی چھا جانے کے بعد جب کبھی کبھار ھی دھوپ نکل آتی ہے، حسین ونازک نظر آنے لگتے ھیں۔ شمال مشرقی سمت میں پکی قبروں کی قطاروں کے پیچھے آدھے آسمان پر گھنگھور گھٹا چھا جاتی ہے۔ زمین سے آسمان کی طرف قوس قزح پھیل جاتی ہے مگر بادلوں کی ڈراؤنی دبیز تہ کو چھیدنے کی اس میں سکت نہیں ہوتی اور وہ افق پر دو سیدھے اور مختصر سے ستونوں کی شکل میں پھیکی پھیکی، قریب قریب بےرنگ کھڑی نظر آتی ہے۔

سڑک کے کنارے کنارے افستین کا جو پہلے وادی ڈان کے میدانوں کی ملکہ تھی، دودھیا نیلا سا فیتہ چلا گیا ہے۔ اناج نے ھر جگہ اس کو دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا ہے جو مالکانہ ٹھسے کے ساتھ قریب قریب سڑک کے کنارے تک آن پہنچا ہے اور غریب تلخ افستین کو اجتماعی فارموں کی چراگاھوں، جنگل کے بیچ صاف میدانوں اور نالوں کے ڈھلانوں پر بڑھنے کی مبہم سی آزادی دے رکھی ہے۔ افستین کے فیتے کے فوراً بعد پکتے ہوئے جئی کے پودوں کی سبزی مائل نیلی دیوار کھڑی ہوجاتی ہے جو کوئی ایک سو ہیکٹر کے رقبے میں پھیلے ہوئے ھیں اور اس کے پیچھے گہرا زرد کھیت ہے جس پر کہیں ھلکے ھلکے دھبے سے نظر آتے ھیں۔ یہ کھیت شاید یا تو گیہوں کا ہو یا جو کا جسکے پکنے میں تاخیر ہوگئی ہوگی۔ اس کے بعد پھر ایک بڑا قطعہ چمکیلے سورج مکھی کے پھولوں کا آتا ہے اور بہت دور سرمائی گیہوں کے کھیت جنکو تیز ہواؤں نے اپنے قابو میں کر رکھا ہے، بوجھل، پتھرائی ہوئی سونے کی طرح لہروں کی شکل میں لگے دکھائی دیتے ھیں۔ فصل کاٹنے کی دو کمبائنیں کھیتوں میں رینگتی چلی آرھی ھیں اور ان کے گہرے سرمئی پہلوؤں پر سورج کی شعاعیں منعکس ہو رھی ھیں۔

میدان یہاں ناھموار ہے مگر منظر حد نظر تک پھیلا ہوا ہے اور افق کا گھیرا بمشکل دکھائی دیتا ہے...

وسیع وادی کی گہرائیوں میں نیلگوں دھند گہری ہوجاتی ہے اور ڈھلان کے پرلے رخ کی بنفشی دھند میں حل ہوکر سڑک سے کوئی بیس کلومیٹر کے فاصلے پر آسمان میں بتدریج گھلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ افق کے دھندلے سے خط کو نمایاں کرنےوالی صرف ایک ٹھوس بنیادوالی پاسبان پہاڑی ہے۔

وسطی ڈان کے داھنے ساحل پر ایسے بہت سارے ٹیلے ھیں، پاسبانی

کی پہاڑیاں بھی اور قبرستانوں کی پکی قبریں بھی۔ وہ ڈان کی بلندیوں پر واقع ھیں اور دریا کے پار چراگاھی زمینوں پر پہرہ دیتی ھیں جہاں سے پرانے زمانے میں خوزاروں، پیچینیگوں اور پولوتسیوں کے حملہآور غول آیا کرتے تھے تاکہ روس میں لوٹ مار مچائیں یا اس پر حملہ کریں۔ تانائیس (ڈان کا قدیمی نام) کے بائیں ساحل پر کنارے کنارے حملہآور جنوب مشرق سے آتے تھے اور اپنے راستے پر یہ اسٹ نشانات چھوڑ گئے تھے۔

قدیم خوزاری گڈھی جس کو دسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں سویاتوسلاف اور اس کے فوجی دستے نے فتح کیا تھا اب مصنوعی جھیل میں جو بحیرہ تسملیانسکوئے کہلاتی ہے، غرق ہوگئی ہے۔ کوہ کمشات سے نیچے نظر دوڑاکر جب ہرے بھرے جنگلوں اور چراگاھوں کے درمیان عجیب و غریب انداز میں لہراتے بل کھاتے ڈان کے مانوس تنگ فیتے کی جگہ چوڑاچکلا نیلا سمندر نظر آتا ہے تو دل کو ایک عجیب احساس جکڑ لیتا ہے اور رقت سی طاری ہونے لگتی ہے...

زندہباد میرے وطن کے بحیرہ ڈان، جسے بالشویک پارٹی کے عزم نے تخلیق کیا، اس عزم نے جسے پارٹی نے ہمارے عوام کے دلوں میں جاگزیں کیا اور جس سے اس نے عوام سے بہادری کے عظیم الشان کارنامے انجام دلوائے!

پائندہباد والگا ڈان نہر — جو سوویت عوام کے علم و دانش اور محنت و مشقت کی شاندار تخلیق ہے!

والگا ڈان نہر کو ہماری پارٹی اور ہماری سوویت ریاست کے بانی ولادیمیر ایلیچ لینن کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس نہر سے ان جہازوں کے بیڑے گذرتے ھیں جن پر کوئلہ، عمارتی لکڑی، اناج، مشینیں اور کاغذ — ہمارے ملک کی دولت بار ہوتی ہے جو اس نئے آبی راستے سے لائی لیجائی جاتی ہے۔

* * *

قدرت کو فتح کرنے کے اولوالعزمانہ منصوبے کے آغاز کے ہمعصر اور عینی شاھد کی حیثیت سے ہم اس کے علاوہ تو کچھ اور کر نہیں سکتے کہ مختصراً اس کا حال بیان کردیں۔ وقت آئیگا تو کوئی ادیب اس عظیم الشان تعمیر کے شایان کوئی شاہکار تخلیق کرےگا۔

والگا ڈان نہر کی کہانی بہادری، جرأت اور لگن کی کہانی ہے۔ سوچئے تو اس دیوپیکر بند، نہر، اس کے دروازوں اور متعلقہ تمام تنصیبات

کی تعمیر کے سلسلے میں کتنی راتوں کی نیندیں اڑی ہوں گی، کتنا غور و خوض کیا گیا ہوگا اور کتنی توانائی صرف ہوئی ہوگی! والگا ڈان نہر کی تنصیبات اور مشینری کی تیاری میں پورے کثیر قومی ملک نے اپنے اپنے حصے کا کام کیا، اور تعمیر کے کام میں پورے سوویت یونین سے آئے ہوئے لوگوں نے حصہ لیا تھا۔

والگا ڈان نہر کو ہم نے روس کے صدیوں پرانے خواب کی تعبیر کا نام دیدیا ہے۔ پیٹراعظم نے اس کے متعلق سوچا تھا اور اسی طرح روس کی ترقی کے خواہاں دوسرے اعلی دماغوں نے بھی مگر ان کے خواب پورے نہیں ہوئے۔ استراخان کے گورنر شہزادہ گولیتسین کا جسے پیٹر اعظم نے کھدائی کی نگرانی کا فرض سونپا تھا، اس حیرت انگیز مہم کی تکمیل کے امکان پر سے اعتقاد اٹھ گیا تھا اور اس نے زار کو لکھا تھا: ”دریاؤں پر صرف خداوند کی حکمرانی ہے اور اس قادر مطلق نے جسے تقسیم کردیا ہے اسے متحد کرنا انسان کی گستاخی ہوگی۔“

کمیونسٹ پارٹی کے عزم سے متحد لوگوں نے وہ کام کر دکھایا ہے جو کبھی گستاخی اور ناممکن تصور کیا جاتا تھا۔

روسیوں کا صدیوں پرانا خواب جو پوری سوویت قوم کا خواب بن گیا تھا، بالشویک پارٹی نے حقیقت میں تبدیل کردیا، اور حب الوطنی کی جنگ عظیم کی طرح، یہاں بھی تعمیر کے ہر شعبے میں سیکڑوں کمیونسٹ پیش پیش رہے۔ قدرت کی قوتوں کو قابو میں کرنے اور یہ عظیم الشان پروجیکٹ پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں انہوں نے عوام الناس کی قیادت کی۔

* * *

ہمیں کامریڈ استالن کا قول یاد ہے: ”عظیم مقصد سے ہی عظیم توانائی پیدا ہوتی ہے“۔ کمیونسٹ تعمیر کے عظیم مقاصد کی خدمت انجام دیتے ہوئے عوام نے عظیم توانائی کا مظاہرہ کیا۔

تسملیانسک پن بجلی پروجیکٹ کے چوتھے حلقے کے سربراہ انجینئر فیودور ایوانووچ ریزچی کوف گورکی کے رہنے والے ہیں اور چہرے مہرے میں یا شاید محنت کشی کے جذبے میں اپنے اس ہم شہر * سے بہت ملتے جلتے ہیں جس کے نام سے اب یہ شہر موسوم ہے۔

---

* یعنی میکسم گورکی۔ (ایڈیٹر)

”میرے ہاں ایک جتھہ تھا جس کا لیڈر الیاکین تھا اور اس جتھے میں کوئی بیس آدمی تھے“، ریزچی کوف نے مسکراتے ہوئے اور ایک حد تک گھبراہٹ سی محسوس کرتے ہوئے مجھے بتایا۔ ”خود الیاکین موندا ویا کا رہنے والا ہے اور اسی طرح جتھے کے بیشتر افراد بھی۔ وہ غیرمعمولی طور پر اچھے مزدور تھے مگر اتنا ہی نہیں: پچھلی بہار میں جب برف ٹوٹنی شروع ہوئی تو ریلوے کے عارضی پل کے پایوں کے حفاظتی ڈھانچے کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ وہ لوگ تیرتی ہوئی برف پر کود گئے اور کلہاڑیوں سے کاٹ کاٹ کر برف توڑ ڈالی تاکہ پل محفوظ ہو جائے۔ محاذ جنگ پر سفرمینا کے فوجیوں کی طرح انہوں نے کام کیا۔

”سردیوں کے شروع میں ایک دن میں صبح بہت سویرے دریائے ڈان پر گیا۔ ایک بہت ہی بوڑھا کاسک میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا:

” 'اچھا تو بیٹے تم بند تعمیر کر رہے ہو؟ کیا خیال ہے، ٹھیک بن جائے گا؟'

” 'یقیناً'، میں نے جواب دیا۔ 'جب بالشویک کوئی منصوبہ بناتے ہیں تو وہ ٹھیک ہوکر ہی رہتا ہے۔'

” 'لگے رہو، بیٹے۔'، بڑے میاں نے متفکر انداز میں گھورتے ہوئے کہا۔ 'دیکھو، بید سرخ ہے — اس کا مطلب ہے کہ سردیوں میں ٹھنڈ زیادہ نہیں ہوگی، مگر جب بہار آئے تو خبردار رہنا۔ برف ٹوٹنے کے بعد پانی گرم آئیگا اور اگر ہشیار نہ رہے تو تمہیں اچھی طرح دھو دیگا۔ ڈان کو صرف کتابوں ہی میں پرسکون دریا لکھا جاتا ہے لیکن درحقیقت بہاروں میں وہ واقعی نہایت ہی غضبناک ہوجاتا ہے، راستے میں جو چیز آئے اس کو چکناچور کر دیتا ہے۔ اس لئے یہ دیکھنے کےلئے آنکھیں گاڑے رکھنا کہ تم جو بند تعمیر کر رہے ہو اس کو نہ توڑ ڈالے۔'

”وہ مڑا اور ٹہلتا ہوا چلا گیا۔

”دریا پر جب برف ٹوٹنی شروع ہوئی تو اس سے ہمیں واقعی بڑی دقت اٹھانی پڑی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز کا پہلے ہی سے خیال رکھ کے انتظام کر لیا گیا ہے۔ لیکن پانی اتنا چڑھا — پچھلے ستر سال میں سب سے زیادہ — کہ صرف طاقتور مشینوں کے ساتھ ساتھ عوام کی شجاعت ہی نے مل کر سب کچھ برباد ہونے سے بچایا۔ کئی کئی راتیں لوگ سوئے نہیں، بند اور عارضی پل کو بچانے کےلئے کام کرتے رہے۔ پانی اتنا چڑھا کہ پل کے فرش تک جا پہنچا۔ پل کے پایوں کے حفاظتی ڈھانچے اس غضبناک طریقے سے چیخ رہے تھے کہ آواز سنکر خوف آتا تھا۔

بڑے میاں کو معلوم تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ طغیانی کے پانی میں ٹوٹی پھوٹی چیزوں کے ٹکڑے، لٹھے اور وہ درخت جنہیں دریائے ڈان کی باڑھ کی زمینوں میں کاٹ ڈالا گیا تھا، بہے چلے آرہے تھے اور پل کے ستونوں کے پاس آن کر ان کا ڈھیر لگ گیا تھا اور اب ڈر یہ ہورہا تھا کہ کہیں پل ہی نہ بہہ جائے۔ برف توڑنے کے لئے بارود کا استعمال کیا گیا مگر اس سے ملبے اور درختوں کا ڈھیر تو ختم نہیں ہوا۔ الیاکین کے معماروں کے جتھے کے لوگ اس موقع پر کلہاڑیاں اور آرے لے لے کر پل کے اوپر سے کود گئے اور کمر کمر تک مچلتے بل کھاتے زور لگاتے پانی میں کھڑے ہوکر درختوں کے تنے کاٹے، ملبے کے ڈھیر کو ہٹایا تاکہ پل کے ستونوں کے درمیان پانی گذرنے کا راستہ بن جائے۔ ،،

جائے تعمیر پر اب نہ تو الیاکین تھا نہ ہی اس کے جتھے کے دوسرے افراد لیکن انہوں نے جو کارنامہ انجام دیا تھا اس کو وہ لوگ مدتوں یاد رکھیں گے جن کے ساتھ اور جن کے لئے انہوں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈالکر کام انجام دیا تھا۔

اگرچہ تعمیر کے لئے انتہائی جدید مشینیں اور مشینی کلیں بڑی تعداد میں فراہم تھیں لیکن جسمانی محنت کے بغیر جو اکثر خطرناک ہوتی تھی کام نہیں چلتا تھا۔ اس سے پہلے کے موسم بہار میں جب طغیانی آئی تو بند کی کوٹھریوں اور پن بجلی گھر کی عمارت کی بنیادوں میں پانی گھس آیا، سڑک کی ٹنیوں کو بہا لے گیا اور بند کے لئے کیچڑ چوس کر مٹی نکالنے والی مشینوں کی پائپ لائن کو ناس کرکے رکھ دیا تھا۔ ان پائپ لائنوں کو بچانے کے لئے لوگوں نے گردن گردن تک ٹھنڈے یخ پانی میں کھڑے ہوکر کام کیا تھا۔ یہ جان جوکھوں کا کام انہوں نے خود اپنی پیش قدمی پر کیا تھا، یہ کسی کے حکم کی تعمیل کی بات نہیں تھی۔ اور انہوں نے بند کے دائیں کنارے والے حصے کو اور تسملیانسک پن بجلی گھر کی کوٹھی کو آخرکار بچا ہی لیا تھا۔

جب دریائے ڈان کی اصل دھار کو پشتے کے اوپر سے بہنے کے لئے موڑا گیا تو اس کے خاص راستے کو جو اب تنگ ہو گیا تھا، باندھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہزاروں لوگ اور مٹی ڈھونے کے بیشمار ٹرک کام پر لگائے گئے تھے۔ معماروں کے علاوہ مقامی گاؤں اور نگروں کے باشندے تھے جو جس طرح کی مدد درکار ہو وہ دینے آئے تھے۔ اندھیری رات تھی اور بیشمار بلب اور فلڈ لائٹیں روشن تھیں۔ فیودور ایوانووچ ریزچی کوف نے جو اس حلقے کے نگراں تھے مجھے بتایا کہ جب وہ لکڑی کے تختوں کی

بنی ہوئی اپنی چوکی میں بیٹھے تھے، ہورہے منظر کا معائنہ کر رہے تھے تو یہ بتانا مشکل تھا کہ کیندائی مشینوں کی بالٹیاں اس قدر تیز رفتاری سے پتھروں کو ٹرکوں میں لاد رہی تھیں یا ہزاروں انسانی ہاتھ۔ انہیں تو بس وہ چنگاریاں اڑتی نظر آ رہی تھیں جو پتھروں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے سے پیدا ہورہی تھیں۔

عجیب واقعہ دستاویزی فلم بنانے والوں کے ساتھ پیش آیا جو بند باندھنے کا منظر فلمانے آئے تھے۔ یہ منظر فلمانے سے وہ چوک گئے کیونکہ انہوں نے حساب لگایا تھا کہ ڈان کا بہاؤ روکنے میں ساٹھ گھنٹے لگیں گے اور یہ کام درحقیقت آٹھ ہی گھنٹوں میں مکمل کر لیا گیا۔ صبح سویرے جب وہ لوگ پہنچے تو سارا کام ختم ہوچکا تھا اور وہ حیرت اور ناامیدی کی تصویر بنے پتھروں کے اس پہاڑی سلسلے کو دیکھ رہے تھے جو دریا کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ تعمیر کے سیاسی شعبے کے سربراہ الیکسئی گوری لوویچ چرکاسوف نے مایوسی سے نڈھال کیمرہ مینوں سے اظہار ہمدردی کیا لیکن یہ کہتے وقت ان کی آنکھوں میں خوشی کی ایک چمک تھی:
''واقعی بڑی شرم کی بات ہے! اس کام میں ساٹھ گھنٹے لگنے تھے، مگر معماروں نے اسے آٹھ گھنٹے ہی میں پورا کر لیا، بےشرم کہیں کے۔ آپ کی مدد تو میں بخوشی کروں، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے کروں۔ اس پہاڑی کو بارود سے اڑوادوں اور سارا کام پھر سے شروع کرنے کو کہوں۔ مگر یہ بنائی اس لئے گئی ہے کہ مدتوں باقی رہے اس لئے افسوس ہوگا۔ آپ کی مایوسی پر مجھے واقعی ہمدردی ہے مگر افسوس مجھے اندیشہ ہے کہ میں آپ کی مدد کچھ نہ کر سکوں گا۔ ،،

دوسرے انجینئروں کے ساتھ ساحل دریا پر اس پروجیکٹ کے ڈائریکٹر واسیلی آرسینتئےوچ یارابانوف بھی کھڑے تھے اور نہایت زبردست قوت ارادی سے کام لیکر اپنی ہیجانی کیفیت پر قابو پائے ہوئے تھے۔ بوڑھے دیہاتی اپنی آنکھوں کے سامنے مصیبت ڈھانے والے بے قابو طوفان خیز ڈان کی جگہ جس سے وہ ہمیشہ سے روشناس تھے، ایک سدھی ہوئی ندی کو دیکھ کر جو اب آئندہ لوگوں کی ضرورتیں پوری کیا کرےگی، آنسو بہا رہے تھے۔

میری ملاقات لینن گراد کے انجینئر سرگیئی گری گوریئےوچ بیتروف سے بھی ہوئی جو بہت ہی اچھے آدمی، پسند آنے والے شخص ہیں، شگفتہ مزاج، محنت کشوں جیسے صاف گو۔ وہ سولہ پن بجلی گھروں کی تعمیر میں ہاتھ بٹا چکے ہیں اور اس کے لئے دور شمال سے لیکر انتہائی جنوبی علاقے تک کا اور ملک کے مشرقی سرے سے لیکر مغربی سرے تک کا سفر کر چکے

ہیں۔ وہ ہر دم رواں دواں رہتے ہیں، ایک پروجیکٹ ختم کرکے دوسرے پر چلے جاتے ہیں اور ان پر قدرے ترس بھی آتا ہے۔ اپنے وطن اور اپنے کنبے کے پاس وہ سال میں صرف ایک بار ہی جاپاتے ہیں۔ مگر اسی جبری علیحدگی کا کوئی علاج نہیں۔ ان کے بچے، جو اب اسکول جانے لگے ہیں باپ کی خانہ‌بدوشوں کی سی زندگی کے باعث ایک اسکول سے دوسرے اسکول میں نہیں جاسکتے۔ ہر نئے تعمیری پروجیکٹ سے پیتروف کو جیسے عشق ہو جاتا ہے اور ہر ٹربائن کے چالو ہونے کے بعد جیسے وہ لگتے ہیں انہیں ذاتی طور پر ایک سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ میں انہیں جٹ سے اپنے ہاتھ صاف کرتے غور سے دیکھ رہا تھا اور مجھے خیال ہوا کہ شاید وہ اب اپنے نئے کام کے بارے میں سوچنے لگے ہوں گے — تخیہ تاش میں یا کہیں اور۔

* * *

والگا ڈان پروجیکٹ عوام کی عظیم‌ترین تخلیقات میں سے ہے۔ دنیا کا عظیم ترین * تیرہ کلومیٹر کا مٹی کا بند پہاڑ کی پشت کی طرح ڈان کی سیلابی زمین پر سر بلند ہے۔ پن بجلی گھر سے ڈان کی سرزمین کے صنعتی مرکزوں اور گاؤں کو برقی قوت فراہم ہوتی ہے اور پانی ڈان نہر کے ذریعے خشک میدانوں میں دور دور تک پہنچ جاتا ہے۔

دریائے ڈان سے والگا تک بیچ کی زمین میں ایک حیرت‌انگیز زینہ بن گیا ہے اور مال آنے جانے کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

ہم جو کچھ والگا ڈان نہر پر دیکھ رہے ہیں وہ ان عظیم‌الشان بہت سے پروجیکٹوں میں سے صرف ایک ہے جو آجکل ہمارے ملک میں عوام کی بھلائی اور مسرت کےلئے زیر تعمیر ہیں۔

عوام کی بھلائی کےلئے اس قدر وسیع پیمانے پر تعمیر شروع کرنے کا کوئی سرمایہ‌دار ملک خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ایک زمانے میں غیرملکی انجینئروں نے بحیرۂ روم کے ایک حصے کو بنیادی طور پر بدل ڈالنے کےلئے ایک جلیل القدر منصوبہ مرتب کیا تھا۔ ان کی تجویز تھی کہ جبل‌الطارق اور درہ دانیال کی آبناؤں پر بند باندھ دئے جائیں، سمندر کی سطح نیچے کی جائے جس سے زرخیز زمین کے وسیع‌وبسیط قطعات اوپر آجائیں گے۔ جبل‌الطارق کے بند پر جو بجلی گھر تعمیر ہو وہ اتنی زبردست مقدار میں

* بوقت تحریر - (ایڈیٹر)

برقی قوت پیدا کرے کہ جو ساٹھ لاکھ مربع کلومیٹر کے علاقے کو صحرائے اعظم کو ہرے بھرے باغ میں تبدیل کر دے۔ مجموعی اخراجات پہلی عالمی جنگ کے مجموعی خرچ کے پندرھویں حصے کے برابر ہوتے۔ لیکن سرمایہ‌داری کے حالات میں نوع انسانی کو بے‌پناہ فائدہ پہنچانے والے ایسے پروجیکٹ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچائے جاسکتے۔ ترقی‌پسند لوگوں کے سائنس اور انجینئرنگ کے فکری نتائج سرمایہ‌دارانہ ''پروجیکٹوں کے قبرستان،، میں دفن ہیں۔

ولادیمیر ایلیچ لینن نے لکھا تھا: ''چاروں طرف ہر قدم پر ایسے مسئلوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو انسان فوراً حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، مگر سرمایہ‌داری راستہ روک لیتی ہے۔ اس نے بے‌پناہ دولت اکٹھی کرلی ہے اور لوگوں کو اس دولت کا غلام بنا لیا ہے۔ اس نے انتہائی پیچیدہ ٹکنیکی مسئلے حل کر لئے ہیں — اور کروڑوں لوگوں کی مفلسی اور جہالت کی وجہ سے، مٹھی‌بھر کروڑپتیوں کے احمقانہ لالچ کے باعث ٹکنیکی اصلاحوں کے اطلاق کا راستہ روک دیا ہے۔،،

ہمارے والگا ڈان پروجیکٹ کی تعمیر امن اور لوگوں کی خوش‌حالی کے لئے ہوئی ہے۔ ۲۷ لاکھ ۵۰ ہزار ہیکٹر بے‌آب زمین کی سنچائی ہوگی۔ زوردار طریقے سے نشو و نما حاصل کرتی ہوئی ہماری سوشلسٹ صنعت میں تازہ قوت انڈیلی جائیگی اور سینکڑوں برقی ٹریکٹر کام کرنے لگ جائیں گے۔

* * *

والگا ڈان نہر کی تعمیر کےلئے ضروری ہوا کہ بہت سے کسک گاؤں اور نگلوں کو جو ان خطوں میں آباد تھے جہاں پانی بھرا جاتا تھا، دوسری جگہ پھر سے بسایا جائے۔ اس ہجرت سے لوگوں کو کوئی نقصان نہ اٹھانا تھا... سوویت حکومت نے کسک اجتماعی کاشتکاروں سے حقیقی معنوں میں پدرانہ شفقت کا سلوک کیا، ان کی فوری ضرورتوں اور ان کے مستقبل کا پورا پورا انتظام کیا۔

مکانوں، مویشیوں کے باڑوں، کنوؤں، سیب اور چیری کے درختوں کا کسکوں کو فراخدلی سے نقد معاوضہ ملا۔ ریاست نے ان کے لئے نقل و حمل کی سہولتیں فراہم کیں، دوبارہ بسنےوالوں کے لئے عمارتی سامان مہیا کیا، متعدد دوسری مراعات کے ساتھ ساتھ انہیں اس جگہ قطعات اراضی دئے جہاں مستقبل کے مصنوعی سمندر کا ساحل ہونا تھا۔

بوڑھے لوگوں کے لئے اپنے گھروں کو چھوڑ کر جانا واقعی ایک دلسوز جدائی تھی۔ جب وہ روانہ ہونے کے لئے تیار ہوئے تو اس دھرتی کو چوما جہاں وہ خود اور ان کے آباواجداد پیدا ہوئے تھے۔

پھر بھی اپنے نئے گھروں میں آباد ہونے اور نئے سمندر کا عادی ہوجانے میں انہیں زیادہ عرصہ نہیں لگا۔

یہی کیفیت سولینوفسکی گاؤں کے باشندوں کی تھی جنہیں مصنوعی سمندر کے عین ساحل پر، پرانے گاؤں کے اصل محل‌وقوع سے کچھ ہی دور اس جگہ پھر سے بسایا گیا ہے جہاں پن بجلی گھر کا بند تعمیر کیا گیا ہے۔

سولینوفسکی گاؤں کی اچھی خاصی ایک تاریخ ہے۔ ۱۹۱۸ء میں وہاں کے تمام کاسک لال چھاپہ‌مار دستے میں شامل ہو گئے تھے اور بعد میں انہوں نے ہی سب سے پہلے اجتماعی فارم قائم کیا اور معرکے میں کام آنے‌والے اپنے چھاپہ‌مار کمانڈر چیرنی کوف کے نام سے اس کو موسوم کیا تھا۔ سولینوفسکی کے سینکڑوں آدمی حب‌الوطنی کی جنگ‌عظیم میں لڑے اور اب ان میں بہت سارے والگا ڈان تعمیر پر کام کر رہے ہیں۔

انہیں ''تسملیانسکایا دروژینہ،، اجتماعی فارم سے کچھ ہی دور دوبارہ بسایا گیا تھا جہاں کے پرانے کاریگروں — بڑھئیوں، چھت ڈالنے‌والوں اور لوہاروں نے اپنے نئے پڑوسیوں کی حقیقی معنوں میں برادرانہ شفقت سے مدد کی تھی۔

سولینوفسکی کے چار ممتاز چھاپہ‌ماروں، الیکسئی چیرنی کوف، واسیلی تیرسکوف، موئسی یرما کوف اور واسیلی فرولوف کے جسد خاکی نئے گاؤں کے مرکز میں لاکر دوبارہ دفن کئے گئے ہیں۔

مشترکہ کوشش سے ایک فوجی کی بیوہ یودوکیا کورباتووا کے لئے اور دو معذوروں تیرینتی کوروچکن اور الکساندر اسکورباتوف کے لئے جو پرانے گاؤں میں خستہ حال مکانوں میں رہتے تھے، لکڑی کے نئے مکانات تعمیر کئے گئے۔

سولینوفسکی اجتماعی‌فارم نے نئی جگہ جڑیں پکڑ لی ہیں۔ پھلوں کے باغات لگا دئے گئے ہیں اور تھوڑے ہی دنوں میں پھل بہ‌افراط آنے لگیں گے۔ سیب اور ناشپاتی کے چھوٹے چھوٹے نئے درختوں کی پھننگوں کو مشرق سے آنے‌والی ہوائیں جھمانے لگیں گی، ڈان کے میدانوں میں سنچائی کے کھیتوں میں گیہوں کی فصل لہلہانے لگےگی اور مادروطن کا دل باغ باغ کرنے کے لئے کمیونسٹ معماروں کی نئی پود پروان چڑھنے لگ جائیگی۔

والگا ڈان سے بھی زیادہ شاندار اور پرشکوہ پروجیکٹ مکمل ہوجائیں گے۔ لیکن لوگوں کے ذہن میں والگا ڈان کی یاد عظیم تعمیراتی پروجیکٹوں میں سے پہلونٹی کے پروجیکٹ کی حیثیت سے ہمیشہ باقی رہیگی۔ اور مائیں، چاہے وہ تسلیم نہ کریں، اپنے پہلونٹی کے بچے کو ہی سب سے زیادہ چاہتی ہیں۔

لوگو، میرے ہموطنو جو ہماری دانشمند بالشویک پارٹی کے خیالوں کا مرکز ہو، تمہیں امن اور خوش‌حالی کے لئے تعمیرشدہ اپنی عظیم تخلیقات پر خوشیاں منانی چاہئیں!

روس کو برقیانے کا منصوبہ جو لینن کے اعلی دماغ کی اپج تھا خانہ‌جنگی، سامراجی مداخلت اور معاشی بدنظمی کے ناقابل یقین مشکل حالات میں شروع کیا گیا تھا۔ پہلے دو برسوں کے دوران میں محض ۱۲ ہزار کلوواٹ صلاحیت کے بجلی گھر چالو کئے گئے تھے۔ اب تک جو نتائج حاصل ہوئے تھے وہ نہایت ہی کم تھے۔ لیکن سوویت عوام سے اپیل کرتے ہوئے کہ وہ اپنا بہادرانہ شہری فرض ادا کریں، ولادیمیر ایلیچ نے کہا تھا:

''بارہ ہزار کلوواٹ بہت ہی معمولی آغاز ہے۔ جو غیرملکی لوگ امریکہ، جرمنی یا سویڈن میں برقیانے کے عمل سے روشناس ہیں وہ ممکن ہے کہ اسے مضحکہ‌خیز محسوس کریں۔ مگر جو ہنستا اٹھے وہی ہنستا بھلا۔،،

ہم اپنی عظیم تعمیرات پر خوشیاں ضرور مناتے ہیں اور ضرور مسکراتے ہیں مگر کسی طرح تنگ خیالی سے نہیں: ہماری مسکراہٹ فاتحین کی مسکراہٹ ہوتی ہے، ان لوگوں کی مسکراہٹ جنہیں نوع انسانی کی آئندہ مسرت پر یقین کامل ہے۔

۱۹۵۲ء

میں نے دعوت بخوشی منظور کرلی

میں نے جرمن جمہوری ری‌پبلک جانے کی دعوت بخوشی منظور کرلی۔ کوئی تیس برس سے زیادہ عرصہ ہوا میں ۱۹۳۰ء میں جرمنی گیا تھا۔ میں سورینتو میں گورکی کے پاس جارہا تھا مگر وہاں تک پہنچ ہی نہ پایا کیونکہ اطالوی ارباب‌اختیار نے مجھے پروانۂ‌راہداری دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پروانۂ‌راہداری کا انتظار کرتے ہوئے میں نے جرمنی کی سیر کرلی تھی۔

جرمن جمہوری ری پبلک میں میں وہ شہر اور گاؤں دیکھوں گا جو پھر سے جوان ہو گئے ہیں۔ میں مزدوروں اور کسانوں سے ملوں گا۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ میں بوڑھے اور نوجوان ادیبوں سے ضرور ہی ملوں گا جن کی تخلیقات کا میں جس قدر ممکن ہے غور سے مطالعہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جرمن جمہوری ری پبلک کے شمالی اضلاع میں سے ایک میں ایک امدادباہمی کی انجمن نے میرا نام اختیار کرنے کی مجھے عزت بخشی ہے۔ امدادباہمی کی اس انجمن کے ممبروں سے میری باقاعدہ خط و کتابت ہوتی ہے، میں ان کے ہاں جانے اور یہ دیکھنے کی کوشش کروں گا کہ ان کے کیا حال چال ہیں۔

مجھے بڑا افسوس ہے کہ یوکرین میں شیوچینکو کے جشن کی تقریبات میں حصہ نہ لے سکوں گا۔ میں اپنے یوکرینی دوستوں سے التماس کرتا ہوں کہ وہ کامیابی کے لئے، صحت اور خوشیوں کے لئے میری بہترین خواہشات تسلیم کریں۔

۱۹۶۴ء

عظمت روح

کرۂ ارض پر بسنے والے لوگوں اور ان کی قومی تہذیبوں کے ارتقاء کی تاریخ میں سنگدلی، المناک واقعات کے ساتھ ساتھ نیک مقاصد کے لئے لوگوں کے آپس میں متحد ہوجانے کی بعض بیش بہا شہادتیں، انسانی جذبے کے بے پایاں جوش و خروش کی شہادتیں بھی ملتی ہیں۔ قوموں کے مقسوم کے حقیقت افروز روزنامچوں اور ملکوں کی تاریخ کے بہترین صفحات ترقی کی، آزادی کی، بہتر مستقبل کی جدوجہد کے لئے وقف ہوتے ہیں۔

ہر قوم کے معاملے میں یہ جدوجہد، مستقبل کی تشکیل اور قومی تہذیب کا ارتقاء نہایت ہی متنوع حالات میں ہوا اور ہورہا ہے۔ اس لئے نہایت قدرتی بات ہے کہ آج دنیا میں قومیں بہتر اور زیادہ نتیجہ خیز باہمی مفاہمت کی متلاشی ہیں۔

ان قوتوں کی سازشوں اور دباؤ کے باوجود جو خود اپنے مطلب کے لئے قوموں میں نفاق پیدا کرنے کی آرزومند ہیں، ہماری تیزرفتار زندگی روزبروز زیادہ وضاحت کے ساتھ اس رجحان کو نمایاں کر رہی ہے جو تمام قوموں میں ان کی مختلف تاریخوں کے باوجود مشترک ہے اور جو ان کی نیک کوششوں کو متحد اور مستحکم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

کسی قوم کے لئے اس کے سپوت جو کوشش کرتے اور جو تصورات ان کی جدوجہد، اپنے مقصد کے لئے وقف ان کی زندگی میں جوش اور ولولہ پیدا کرتے ہیں فکرانسانی ان کی بصد احترام متلاشی ہوتی ہے۔ نوع انسانی کی تاریخ میں ایسی ہی ایک ہستی موہن داس کرمچند گاندھی (مہاتما گاندھی) کی تھی۔

ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک کی اس ممتاز ہستی کے صد سالہ جنم دن کے موقع پر شائع کی جانے والی اس کتاب کے بہت سے مضمون نگاروں میں سے ایک میں سوویت مصنف ہوں۔ قدرتی بات ہے کہ میں ہندوستانی قارئین کو گاندھی کی زندگی اور ان کے بیش بہا ادبی ورثے کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا اور نہ ہی کچھ ان کی تلاش مسلسل اور ان کے نظریات کے پرپیچ ارتقاء کے بارے میں کچھ کہوں گا۔ اس کتاب کے دیگر مضمون نگار حضرات جنہیں اس موضوع پر خاص معلومات حاصل ہیں اس کے بارے میں لکھیں گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں ہندوستانی قارئین سے گاندھی کی، سماجی اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے، صرف ان خصوصیات کے بارے میں بات چیت کرنا چاہوں گا جن سے میں اور اسی طرح بہت سارے سوویت عوام سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں گاندھی کا ایک ہمہ گیر مطالعہ پیش نہیں کررہا، جسکی میں کبھی جرأت بھی نہیں کروں گا بلکہ اس کتاب کے قارئین کو ان کی نوع بنوع سرگرمیوں کے بعض پہلوؤں کے بارے میں محض اپنے خیالات سے آگاہ کر رہا ہوں۔

گاندھی اور روس کے عظیم ادیب تالستائی کے درمیان قربت کی حیرت انگیز حقیقت کو کیا کوئی نظر انداز کر سکتا ہے؟ یہ ایک نمایاں مثال ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان تواریخی حالات میں زبردست فرق کے باوجود جن میں ہندوستان اور روس کے لوگ زندگی بسر کر رہے تھے، تعلق کا امکان، ترقی کی خاطر تعلق باہمی کا امکان ان دنوں بھی پیدا ہو گیا تھا۔ یہاں میں تالستائی کی تصنیف ''ہندوستانی کے نام ایک خط،'' کا ہی ذکر کروں گا جس کی گاندھی نے بڑی تعریف کی تھی۔ میں گاندھی اور تالستائی کے فلسفیانہ نظریات کے لب لباب اور اہمیت کا ذکر نہیں کررہا، میں صرف اس چیز کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس نے ان دونوں کو فلسفے میں اور اپنی عملی سرگرمی میں بھی سرگرمی کے طریقے اور ذرائع تلاش کرنے کے لئے اکسایا تھا۔ استبداد کے خلاف احتجاج، خود اپنے اور غیر ممالک کے لوگوں کے دکھ درد اور رنج والم کو محسوس کرنے کی صلاحیت — اسی نے ان کی جستجو کو بڑھاوا دیا اور یہی دو عظیم الشان ہستیوں — ہندوستان کی

آزادی کے عظیم مجاہد اور عظیم روسی انسان دوست ادیب کو ایک دوسرے کے قریب لائی۔

مجھے یقین ہے کہ ہندوستانی قارئین مجھے غلط نہیں سمجھیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ یہ نہ سوچیں گے کہ لیجئے یہ کمیونسٹ مصنف اپنا نقطۂ نظر ہم پر تھوپ رہا ہے اور اپنے مقاصد کی خاطر واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہا ہے۔ میں کسی پر کچھ نہیں تھوپ رہا۔ میں صرف اپنے احساسات، اپنے خیالات میں آپ کو شریک کر رہا ہوں۔

اپنے زمانے کے فوری تقاضے کو محسوس کرتے ہوئے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں گاندھی کی شخصیت کے امتیازی وصف، نسلی امتیاز کو یعنی کسی قوم پر دوسری قوم کی فوقیت کے نسل پرستانہ تصورات کو تسلیم نہ کرنے یا نسلی اور نوآبادیاتی استبداد کو برداشت نہ کرنے جیسے ان کے نیک اوصاف پر سب سے زیادہ غور سے توجہ نہ دوں؟ گاندھی کا یہ بیان کہ وہ اس قسم کی حب الوطنی کو تسلیم نہیں کرتے جو دوسری قوموں کی مصیبت یا استحصال کے بدلے فروغ پاتی ہو، احترام اور گہری توجہ کا مستحق ہے۔

برسوں تک گاندھی اس دشمنی اور نااتفاقی کے خلاف جدوجہد کرتے رہے جو مختلف مذہبی عقائد کی پیدا کی ہوئی تھی۔ یہ جدوجہد بھی انہیں اصولوں کے مطابق کی گئی ہوگی جن پر ان کا اخلاقیاتی تصور اور عمومی اخلاقی قوانین کے بارے میں ان کے تصورات مبنی ہیں۔ لیکن عمل میں اس جدوجہد نے ایک نئے، زبردست، فوری طور پر زوردار، وطن دوستانہ اور سیاسی معنی اختیار کر لئے۔ اس نے نوآبادکار کی اس خواہش کی تکمیل کا راستہ روکا جو اپنے زمانۂ قدیم کے پیشواؤں — دوسروں کو غلام بنانے والے قدیم اہل روما — کی نصیحت پر عمل کرنا چاہتے تھے جن کا اصول تھا: ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔''

ان کی زندگی کے خاص مقاصد میں سے ایک مقصد صدیوں پرانی ان کٹر روایات کو یکسر مٹانا تھا جنہوں نے ہندوستان کی زندگی کے اس خوفناک مظہر کو جنم دیا جسے خود گاندھی نے ''چھوت چھات کی لعنت'' قرار دیا تھا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ''اچھوت'' ذاتیں آبادی کے قریب بیس فیصدی حصے پر مشتمل تھیں۔ اگر گاندھی اپنا مدنی کارنامہ انجام دینے میں کامیاب نہ ہوئے ہوتے تو سماج کا ایک بڑا حصہ نوآبادیاتی غلامی کے جوئے سے ہندوستان کی نجات کی قومی جدوجہد سے علیحدہ رہ گیا ہوتا۔ اور وہ نصب العین جسے گاندھی نے سوراج کہا تھا کبھی حاصل نہ ہوا ہوتا۔

اور وہ جدوجہد جو گاندھی نے ہندوستانی عورتوں کی نجات کے لئے کی تھی؟ عورتوں میں جو آبادی کے نصف حصے کی تشکیل کرتی ہیں انہیں نہایت مؤثر مضمر سماجی قوت نظر آئی۔ انہوں نے ملک کی، قوم کی تمام قوتوں کو آزادی کی جدوجہد کے لئے صف آرا کرنے کی کوشش کی تاکہ سوراج کی وہ منزل جہاں تک پہنچنے کی سب کو آرزو تھی، حقیقت بن کر سامنے آجائے۔

یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ جواہرلال نہرو نے گاندھی کو ''ہندوستان کے عزم جہاد آزادی کی علامت'' قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ''عوام کے نبض شناس ہیں''۔

گاندھی چاہتے تھے کہ ہر ہندوستانی گھر میں چرخہ چلنے کی آواز کا نغمہ گونجنے لگے۔ ان کے اس رویے میں ہر ایک کو روزگار مہیا کرنے کی کوشش کے علاوہ ممکن ہے کہ ملک کی صنعتی ترقی کی اہمیت کو اصلیت سے کم آنکنے کی بات بھی موجود ہو۔ لیکن پھر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر لوگوں کے پاس وہ کپڑا کافی ہوگا جو کروڑوں ہاتھوں نے بنا ہوگا تو مل کے کپڑے کے ''حملے'' سے اپنی حکومت مستحکم کرنے کی سامراجیوں کی کوشش کو وہ ناکارہ کر سکیں گے۔

اس طرح اپنے قریب قریب ہر فعل سے گاندھی نے واضح کیا کہ وہ نوآبادیاتی نظام کے سخت اور اپنے انداز میں، مستقل مزاج مخالف ہیں اور یہ کہ ان کو اپنے ملک سے جس کی آزادی اور خودمختاری ان کی زندگی کا نصب العین تھا، پرجوش محبت ہے۔

جی ہاں، گاندھی نے ''پرامن انقلاب'' کی کوشش کی جو عدم تشدد کے طریقوں سے حاصل ہو۔ ہم نے بھی اپنے ملک میں کم از کم نقصانات سے اور بغیر خانہ جنگی کے انقلاب کی تکمیل کی کوشش کی تھی۔ ہمارے انقلاب کے ''ارتقا'' کی غیر امن پسندانہ راہ ہمارے محنت کش عوام پر اندرونی انقلاب دشمنوں اور چودہ سامراجی طاقتوں کی مسلح مداخلت نے تھوپی تھی جن کا مقصد آزادی کو کچلنا اور ہمارے انقلاب کی مشعل کو بجھانا تھا۔

وہ دو مختلف راستے تھے۔ لیکن ان الگ راستوں کے باوجود عوام الناس کی طاقت میں گاندھی کے ایمان کو ہم سراہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بلاشبہ انقلاب ہمیشہ عوام الناس کے وسیع حلقوں کی ایک تحریک ہوتا ہے۔ نہ ہی ہم اس حقیقت کو سراہے بغیر رہ سکتے ہیں کہ جدوجہد کی منطق

گاندھی کو اس نعرے تک لے آئی جو سامراجیوں کو کوڑے بنکر لگا:

"ہندوستان چھوڑ دو!"

لوگ کبھی نہیں بھولینگے کہ جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو گاندھی نے فاشزم کی مخالفت کا اور سوویت عوام سے گہری ہمدردی کا اظہار کیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی بمباری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی، جنہوں نے ایٹمی ہتھیاروں پر پابندی عائد کرنے، متنازع مسائل کا پرامن تصفیہ کرنے اور عام ترک اسلحہ کا نعرہ بلند کیا تھا۔

گاندھی کی زندگی ایک تلاش مسلسل تھی — سچائی کی، خود اپنے تصور کے اخلاقیات کی، سیاسی جدوجہد کے مخصوص طریقوں کی اور فلسفیانہ اصولوں کی تلاش۔ ان کی تلاش کی پیچیدگی اور تنوع سے ہندوستان کے تواریخی ارتقا کی پیچیدگی کی عکاسی ہوتی ہے۔

ہندوستان کے عوام گاندھی کو "مہاتما" کہتے ہیں۔ یہ ایک خوبصورت لفظ ہے جس کے معنی ہیں "روح عظیم"۔ عوام کے اس سپوت کی روح، میرے خیال سے، ان مظاہر میں ارفع ترین تھی جہاں وہ ہندوستان کے عوام کی جستجو — آزادی اور خودمختاری کے لئے ان کی وطن دوستانہ کوششوں کو اپنے میں جذب کرتی اور ان کی عکاسی کیا کرتی تھی۔

ایسی روح واقعی عظیم ہوتی ہے۔

۱۹۶۸ء

دوسرا حصہ

ادیب

انگریزی قارئین سے

("اور ڈان بہتا رہا..." کے انگریزی ایڈیشن کےلئے پیش لفظ)

مجھے خوشی ہے کہ میرے ناول "اور ڈان بہتا رہا..." کا انگریزی قارئین اور اخبارات نے پرجوش خیرمقدم کیا ہے۔ مجھے خاص طور پر اس لئے خوشی ہے کہ انگلستان ان عظیم ادیبوں کا وطن ہے جنہوں نے عالمی ادب کے خزانے میں بیش بہا اضافے کئے ہیں اور جن کی لافانی تخلیقات نے انگریزی قارئین میں ادب کا ایک مذاق پیدا کیا ہے۔

مجھے اس بات سے قدرے فکر لاحق ہے کہ انگلستان میں میرے ناول کو ایک "پردیسی" کہانی کی طرح دیکھا گیا ہے۔ ڈان کاسکوں کی زندگی کی تفصیلات کے بیان میں اگر انگریز قاری ان عظیم الشان تبدیلیوں کو دیکھنے کی کوشش کرے جو زندگی میں، روزمرہ کی سرگرمیوں میں اور انسانی نفسیات میں پہلی عالمگیر جنگ کے اور انقلاب کے نتیجے میں رونما ہو گئی ہیں، تو مجھے مسرت ہوگی۔

میں نے جو فریضہ اپنے ذمے لیا ہے وہ محض یہ نہیں ہے کہ پہلی عالمگیر جنگ اور انقلاب کے زمانے کی ان مختلف سماجی پرتوں کو واضح کروں جو وادیٔ ڈان کی آبادی میں موجود تھیں، نہ ہی محض یہ کہ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان کے واقعات کے زبردست بھنور میں آجانے والے مردوں اور عورتوں کے المناک مقسوم کا خاکہ پیش کردوں بلکہ یہ بھی ہے کہ انہیں لوگوں کو سوویت عہد حکومت کے تحت پرامن تعمیر کے زمانے میں بھی پیش کروں۔ اپنی پچھلی کتاب "جب زمین جاگی" میں نے اسی فریضے کی تکمیل پر وقف کی ہے۔

آخر میں میں مندرجۂ ذیل بات کہوں گا: انگریزی اخبارات کے تبصروں میں حقیقت کی میری "بیرحمانہ" عکاسی کو جتایا گیا۔ بعض نقادوں نے تو عام طور پر "روسی رسم و رواج کی بیرحمی" تک کا ذکر کیا ہے۔

اول الذکر صورت کو تسلیم کرتے ہوئے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ جو ادیب سچائی پر پردہ ڈالنے کے لئے حقیقت کو بناتا سنوارتا ہے اور

اپنے قارئین کے جذبات مجروح نہ کرنے کے لئے چاہتا ہے کہ خود کو ان کے مطابق کرے، وہ خراب ادیب ہوتا ہے۔ میرا ناول محض ان کتابوں میں سے ایک نہیں ہے جن کا لوگ قیلولہ کرتے ہوئے مطالعہ کیا کرتے ہیں اور جن کا واحد مقصد ہاضمے میں مدد کرنا ہوتا ہے۔

جہاں تک روسی رسم و رواج کا تعلق ہے، تو مجھے شک ہے کہ وہ دوسری قوموں کے رواجوں سے زیادہ بیرحمانہ ہیں۔ اور کیا وہ تہذیب یافتہ قومیں زیادہ بیرحم اور انسانیت‌سوز نہیں تھیں جنہوں نے ۱۹۱۸ء — ۱۹۲۰ء میں میری مبتلائے الم مادروطن کے خلاف اپنی فوجیں جھونکدی تھیں اور روسی قوم پر اپنی مرضی بزور شمشیر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی۔

۱۹۳۴ء

عام پرولتاری نصب‌العین کا ادب ایک حصہ ہے

(لینن‌نامی فیکٹری اور روستوف برساحل ڈان کے ریلوے جنکشن کے بہترین کارگزار مزدوروں کے جلسے میں ایک تقریر سے اقتباس)

سب سے پہلے تو ساتھیو میں سوویت مصنفوں کی انجمن کی جانب سے لینن‌نامی فیکٹری اور روستوف ریلوے جنکشن کے پرولتاریوں کو جنہوں نے روس کی نجات کے لئے انقلابی جدوجہد کی تاریخ میں انتہائی شاندار صفحات کا اضافہ کیا ہے، دلی پیغام تہنیت پیش کرنے کی آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔

آج، لین‌زاووت کے پرانے مزدوروں سے اس ملاقات کے دوران مجھے کامریڈ لینن کے وہ خیالات یاد آئے جن کا انہوں نے ایک بار اپنی خواہش کی صورت میں اظہار کیا تھا کہ ''ادب کو عام پرولتاری نصب‌العین کا حصہ بن جانا چاہئے۔'' یہ خواہش اب پوری ہورہی ہے۔ اور اس کی سب سے نمایاں مثال وہ نہایت گہری توجہ ہے جس کا مزدور طبقہ زبان پر اس ادبی مباحثے کے سلسلے میں اظہار کررہا ہے جو گورکی کے مضمون پر شروع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے زمانے اور ہمارے عہد میں ادب کا عام پرولتاری نصب‌العین کا ایک جزو بن جانے کی اور بھی زیادہ قائل کن توثیق اس زبردست دلچسپی سے فراہم ہوتی ہے جو مزدور طبقے اور پوری سوویت آبادی نے مصنفوں کی کل یونینی کانگرس کی کارروائی میں لی جو ایک مہینہ قبل منعقد ہوئی تھی۔

میرا خیال ہے کہ ہماری کتابیں جس بڑھتی ہوئی تعداد میں شائع ہوتی ہیں — اور غیرملکی ادیبوں کو جنہوں نے اس کانگرس میں شرکت کی تھی، یہ اشاعت نہایت ہی حیرت انگیز معلوم ہوئی تھی — صرف وہی ہمارے قارئین کی تہذیبی ترقی کی واحد علامت نہیں ہونی چاہئے۔ قارئین ہم مصنفوں سے روزانہ تعلق میں رہتے ہیں اور ان کی تہذیبی ترقی کا کسی اور چیز کے علاوہ اس سے ہی سب سے زیادہ مؤثر طریقے سے ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ خود اپنے تجربے سے مجھے اس کا علم ہے: ہر روز مجھے اپنے قارئین کے کم از کم دس خط ایسے ملتے ہیں جن میں وہ ''جب زمین جاگی'' اور اس کے کرداروں کے متعلق اپنی کسی نہ کسی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک ایسے مصنف کی حیثیت سے جس نے اپنے پیشے پر عبور حاصل کر لیا ہے، میرے لئے ان میں سے کچھ خطوط منجھے ہوئے نقادوں کے مضمونوں سے زیادہ مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

جب میں ''اور ڈان بہتا رہا...'' لکھ رہا تھا تو دھات ساز مزدوروں کی لینن گراد علاقائی یونین سے میرا قریبی تعلق قائم تھا اور ان کے تبصروں نے جو مجھے سینکڑوں کی تعداد میں موصول ہوتے تھے، مجھے اپنی وہ غلطیاں سمجھنے اور درست کرنے میں بڑی مدد دی تھی جو اپنی پہلی کتاب لکھتے وقت مجھ سے سرزد ہو رہی تھیں۔ میں نہایت غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سوویت یونین کے مزدور قارئین اور مصنفین کے درمیان تعلق اس بات کی مستحکم ضمانت ہے کہ ہمارا سوویت ادب بدستور دنیا کا سرکردہ ادب رہیگا۔

میں آپ کو صرف یہ بتانے تک اپنی تقریر کو محدود نہیں رکھنا چاہتا کہ مصنفوں کی کانگرس میں کیا ہوا کیونکہ میرا خیال ہے کہ آپ میں سے بہتوں نے — یقیناً اکثریت نے — اس کانگرس کی کارروائی کا بغور مطالعہ کیا ہوگا اور اس کی خاص رپورٹوں سے روشناس ہوں گے۔ میں جس چیز کے بارے میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں وہ ادب ہے، کیونکہ ادب عام پرولتاری نصب العین کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ لین‌زاووت اور روستوف ریلوے جنکشن میں بہت سے ایسے لوگ ہیں، میرا خیال ہے کہ کوئی چھ سو، جو اخبارات میں باقاعدگی سے لکھتے رہتے ہیں۔ مجھے پورا پورا یقین ہے کہ ان مزدور نامہ‌نگاروں میں سے جو اپنی تحریر سے بحیثیت مجموعی پوری صنعت کی اور خاص طور پر آپ کے کارخانے اور ریلوے کی مدد کررہے ہیں کہ کوتاہیوں کا خاتمہ ہوجائے، دسیوں ممتاز ادیب اور شاعر

ابھر کر آئیں گے جو ہمارے ہمسر ہوجائیں گے اور پھر آگے بڑھ کر ہمیں پیچھے چھوڑ جائیں گے۔

اس کانگرس کے شروع ہونے سے پہلے زبان پر جو مباحثہ شروع ہو گیا تھا اس سے پتہ چلا کہ مزدور قارئین نے ۲۷ — ۱۹۲۶ء کی بہ نسبت یعنی دس برس سے بھی کم عرصہ قبل کی بہ نسبت، لمبے لمبے ڈگ بھرے ہیں، اندازبیان کے بارے میں زیادہ دھیان دینے لگے ہیں اور ان میں مطالعے کا ایک ایسا مذاق پیدا ہو گیا ہے کہ ہم مصنف اکثر ان کی ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہاں میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے: اس امر کے پیش نظر کہ مزدور طبقے کی تہذیبی سطح بے پناہ بلند ہوگئی ہے اور اس امر کے پیش نظر کہ ہمارے نام خطوں میں، ان تنقیدی مضامین میں جو وہ رسالوں میں بھیجتے ہیں اور جلسوں میں اپنی تقریروں میں مزدور اہم‌ترین مسئلہ اعلی قسم کی کتابوں کو قرار دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادبی مباحثے، مجرد قسم کے نہیں، بلکہ ان کتابوں پر مباحثے جو فی‌الحال سوویت ادب کی بہترین تخلیقات تصور کی جاتی ہیں، انتہائی کارآمد ہوں گے، خصوصاً بعض مصنفوں اور قارئین، آپ کے لئے۔

سوویت مصنفوں کی کل‌یونینی کانگرس نے جس پر سوویت اور عالمی مزدور طبقے نے غیرمعمولی توجہ مرکوز کی تھی، ہماری کارگذاریوں کا اب تک کا نتیجہ اخذ کرکے پیش کیا تھا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ عالمی ادب کو تقسیم کرنےوالی حدیں نہایت نمایاں طور پر واضح ہو گئیں۔ ایک ثبوت ہمارے سوویت ادب کے مسلسل اور بتدریج فروغ اور بورژوا ادب کے زوال سے ملتا ہے جس کا مغربی یورپ کے ملکوں سے آئے ہوئے ڈیلی گیٹوں نے ایک زبان ہوکر ذکر کیا تھا۔ مغرب میں فنون کے زوال کی مثالیں میں پیش کرنا نہیں چاہوں گا کیونکہ اس کی تمام مثالیں ہمارے روزناموں میں آپ کو مل‌سکتی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ فاشست ملکوں میں کتابیں جلائی جاتی ہیں اور یہ کہ ہزاروں کتابیں جن میں سوویت مصنفوں کی وہ تمام کتابیں بھی جن کا ترجمہ ہو چکا ہے شامل ہیں، آمریانی حکومت کے نئے قانون کے تحت نذر آتش کی جاتی ہیں۔ چینی مندوبین نے کانگرس میں جو کچھ کہا ہے اس سے آپ کو معلوم ہے کہ جو چینی انقلابی ادیب مزدور اور کسان عوام الناس سے ان لوگوں کے خلاف جدوجہد کرنے کی اپیل کرتے ہیں جنہوں نے ان کے وسیع و بسیط قدیم متمدن ملک کو غلام بنایا ہوا ہے، بطور سزا ان کی کتابوں کو لائبریریوں

سے خارج کر دیا جاتا ہے اور اس سے بری بات یہ کہ ان کو قیدخانوں میں ڈال دیا جاتا ہے اور ان کی زندگی تختہ‌دار پر ختم ہوتی ہے۔

یہ حدبندی جو اس کانگرس میں نمایاں طور پر واضح ہوئی، دو دنیاؤں کو دکھاتی ہے جو فن کے میدان‌عمل میں بھی ایک دوسرے کے سامنے صف‌آرا ہیں۔ اور آج بھی یہ بات قطعی واضح ہے کہ ہمارا سوویت فن دنیا میں ہر جگہ جیت رہا ہے۔ یہ بات مغربی یورپی ادیبوں نے کانگرس میں اپنی تقریروں میں واضح کر دی اور خاص طور پر جرمن کمیونسٹ ادیب فرانز وائزکوپف نے۔ انہوں نے بتایا کہ سوویت ادیبوں کی تخلیقات سے ہی جرمن پرولتاریہ کو جو فاشست اقتدار کے تحت مصیبتیں جھیل رہا ہے، طبقاتی جدوجہد کے معنے معلوم ہوتے ہیں اور اس بات کا علم ہوتا ہے کہ عالمی انقلاب کی اور کرۂارض پر ہر جگہ کمیونزم کے نیک تصورات کی فتح کے لئے دشمنوں کے خلاف کیسے لڑا جائے۔ وائزکوپف نے یہ بھی بتایا کہ جرمن قارئین کو سوویت ادیبوں کی کسانوں کے موضوع پر تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری پارٹی نے، ہمارے مزدور طبقے نے اور کسان طبقے کے ترقی‌پسند حلقے نے چھوٹے پیمانے کی نجی کاشتکاری کی جگہ جس میں کتا کتے کو کھائے کی ذہنیت کارفرما ہوتی ہے بڑے پیمانے کی اجتماعی کاشتکاری جاری کرنے کےلئے، کیسی جدوجہد کی تھی۔

اس پہلے جلسے میں، جو میں توقع کرتا ہوں آخری نہ ہوگا، بہتر ہوگا کہ ہم قاری اور مصنف کے درمیان تعلقات قائم کرلیں اور بعض ایسے مسئلے سمجھنے میں ایک دوسرے کی مدد کریں جو آج تک حل نہیں ہوئے ہیں۔

ادبی زبان پر مباحثے نے، جو پانفیروف کی تصنیف "بروسکی" سے شروع ہوا تھا، ہماری کمزوریوں کو دکھایا اور واضح کیا کہ مسائل حاضرہ کے متعلق موضوع کی جستجو میں اور اپنی کتابوں میں اپنے حیرت‌انگیز دور کی عکاسی کرنے کی خواہش میں ہم خوبی کو اکثر فراموش کر دیتے اور گھٹیا تخلیقات کرنے لگتے ہیں۔ گورکی نے بالکل صحیح کہا تھا: اگر کسی کارخانے میں کام کرنےوالا مزدور کام خراب کرتا ہے اور مال خراب نکلنے لگ جاتا ہے تو اس کو مجرم تصور کیا جاتا ہے، اخباروں میں اس کو نادم کیا جاتا ہے اور رائے عامہ اسکی مذمت کرتی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ایسے ادیب کی صورت میں جو گھٹیا تخلیق تیار کرے ہم بعض ہلکی سی تنقیدی سرزنش تک ہی محدود رہیں جو ادیبوں کو بہرحال زیادہ متاثر نہیں کرتی؟ ہم اس ادیب کے معاملے میں زیادہ سخت اقدامات

کیوں نہیں کرتے جو اپنے کام میں زیادہ محنت نہیں کرتا حالاں کہ کر سکتا ہے؟

اور یہ سخت اقدامات کیا ہیں؟

سب سے پہلے آپ کی کھری رائے جو ادیب کو مجبور کرے گی کہ وہ ہزار بار ایک ہی مسئلے پر نظر ثانی کرے، فقرے کے ہر پیچ پر غور کرے، اپنے افسانے یا ناول کے پیغام اور اسکی ترتیب و تشکیل پر اچھی طرح سوچ بچار کرے، کوشش کرکے اپنی کتاب میں اس قدر جوش و خروش پیدا کرے جو عوام کو جدوجہد کے لئے ابھارے، اور ان میں شجاعت، شان اور جرأت کے کارنامے انجام دینے کا ولولہ پیدا کرے۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں آپ کی آواز، مزدور قارئین کی آواز، فیصلہ کن ہوگی۔

اب جو ہم ادب کے متعلق باتیں کر رہے ہیں تو ایک چیز اور میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ ابھی کچھ عرصے سے قارئین میں ایک عجیب رویہ پیدا ہوگیا ہے جو بنیادی طور پر غلط ہے اور ادیبوں میں ذہنی الجھن پیدا کر دیتا ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ مثلاً ایلین کوف کا ناول ”خاص محور،، پڑھ رہے ہیں۔ یہ ناول برا نہیں۔ اس میں ریلوے انجن بنانے والے ایک کارخانے کے بڑے عملے کی زندگی دکھائی گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس ناول میں کچھ خامیاں ہیں جو گورکی نے مصنف کو بتائی تھیں۔ جب یہ شائع ہوا تو ادبی حلقوں میں اس پر گرما گرم بحثیں ہوئیں لیکن مجھے کہنا پڑتا ہے کہ بحیثیت مجموعی سوویت قارئین نے ابھی تک اسے مناسب طریقے سے جانچا نہیں۔ تو گویا یہ ناول آپ کے زیر مطالعہ ہے، اور آپ کہتے ہیں: ”کتنی اچھی بات ہے کہ ایک ادیب تو ایسا نکلا جس نے ہمارے ریلوے انجن بنانے کے کارخانے کے مزدوروں کے بارے میں کچھ لکھنا تو مناسب سمجھا! اس نے پارٹی سیل کا، ایک پرانے مزدور کی خانگی زندگی اور کارخانے کی زندگی کی تفصیلات بیان کی ہیں، مگر اس نے شہر اور دیہات کے تعلقات کے بارے میں کچھ کیوں نہیں کہا؟،، بہت سے قارئین اور نقاد کا رجحان یہ ہے کہ وہ شائع ہونے والی ہر کتاب سے ایک ہی قسم کی امیدیں وابستہ کریں۔ اگر کہانی کسی اجتماعی فارم کی ہے تو وہ کہیں گے: ”مصنف نے پارٹی سیل، کومسومول اور پارٹی کی سرگرمیوں اور عورتوں کی بڑھتی ہوئی سماجی ساکھ کی ایک سچی تصویر پیش کی ہے مگر اس نے امداد باہمی کو کیسے نظر انداز کر دیا اور اس کے بارے میں کیوں ایک لفظ بھی نہیں لکھا؟،،

ایک اچھی کہاوت ہے جسے لوگوں کو واقعی ذہن میں رکھنا چاہئے: حسین ترین لڑکی جیسی ہے اس سے زیادہ خوبصورت تو نہیں ہوسکتی۔ ایک اور کہاوت ہے: منہ سے سیٹی بجانا اور گھونٹ بھرنا یکوقت نہیں کر سکتا۔ پھر بھی ادیبوں سے لوگ اکثر غیرمعقول مطالبے کرتے رہتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ غالباً دنیا میں ایک بھی ادیب ایسا نہیں ہوگا جو ہمارے ملک میں ہر روز، ہر گھنٹے رونما ہونے والے تمام واقعات، تمام تغیرات اور تمام حادثات کا احاطہ کر سکے اور ان کے تمام متنوع پہلو اجاگر کر سکے۔ آج جس فیکٹری کا حال آپ نے بیان کیا ہے وہ ایک سال بعد اتنی تبدیل ہوچکی ہوگی کہ پہچان میں نہیں آئے گی اور لکھنے والا ہر شخص اپنے آپ کو اسی مصیبت میں گرفتار پائیگا جس میں آئسینشٹین نے اپنے آپ کو وہ فلم بناتے ہوئے مبتلا پایا تھا جس کا عنوان ہونا تھا ”عام لائحہ عمل،،۔ انہوں نے یہ فلم ۱۹۲۸—۲۹ء میں بنانی شروع کی تھی جب پارٹی کی پوری کوشش یہ تھی کہ کسانوں کی چھوٹی چھوٹی کھیتیوں کو ملاکر چھوٹے اجتماعی فارم منظم کئے جائیں۔ اس کام کے لئے پیسہ خرچ کیا گیا، قرضے منظور کئے گئے اور زمین کو مشترکہ طور پر کاشت کرنے والی زراعتی انجمنیں قائم کی گئیں جو اس وقت الگ الگ مثال کی حیثیت سے نمودار ہوتی ہیں۔ اس زمانے کا ”عام لائحہ عمل،، یہی تھا۔ ۱۹۳۰ء میں جب آئسینشٹین ابھی اپنی فلم کی شوٹنگ میں مصروف ہی تھے کہ بڑے پیمانے کی اجتماعیت کا آغاز ہوگیا۔ یہ فلم وقت کے تقاضوں سے پیچھے رہ گئی اور اب اس کے کوئی معنے ہی نہیں رہ گئے تھے۔

یہی کیفیت ہم ادیبوں کی ہوتی ہے۔ میں نے اپنا ناول ”جب زمین جاگی،، ۱۹۳۰ء میں لکھنا شروع کیا، ان واقعات کے فوراً بعد جنہوں نے دیہی دنیا کی کایاپلٹ دی تھی: ایک طبقے کی حیثیت سے کولکوں کا صفایا، بڑے پیمانے کی اجتماعیت اور بڑے پیمانے کے اجتماعی فارموں میں متحد ہونے کے لئے کسانوں کی عام تحریک۔

یہ تاثرات ابھی یادداشت میں تازہ تھے کہ میں اپنا ناول لکھنے بیٹھ گیا۔ پہلا حصہ لکھ لینے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں جو کچھ بتا رہا ہوں وہ اب بنیادی مسئلہ نہیں رہ گیا ہے۔ اب میرے قارئین کے ذہن میں دوسرے مسئلوں کو اہمیت حاصل ہو گئی ہے، خصوصاً اجتماعی کاشتکار قارئین کے ذہن میں جن کے متعلق میں یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں۔ واقعات سے ہمقدم رہنے کی کوشش ہی ہمارے فرض کو مشکل کر دیتی ہے۔

اور اب چند الفاظ ادبی تخلیق کی خوبی کے بارے میں۔ کانگرس کے بعد ہم میں سے ہر ایک کو فوری ضرورت کا یہ مسئلہ درپیش تھا: بہتر کتابیں کیسے لکھی جائیں؟ کانگرس میں ادیبوں کے علاوہ ان لوگوں نے بھی شرکت کی تھی جو عام قارئین کے نمائندے، یعنی اجتماعی کاشتکار، صنعتی مزدور اور لال فوج کے لوگ تھے۔ ایک کے بعد ایک وہ منبر پر آئے اور اپنے اپنے مطالبے پیش کئے، اور کل میزان اتنا ہوگیا کہ سچ پوچھئے تو عنقریب مستقبل میں ہم حساب بےباق نہ کر پائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اچھا کام نہیں کر رہے، زبان کے بارے میں ہم زیادہ دقت اٹھانے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے اور یہ کہ مبتدیوں کو جن کی تعداد بہت زیادہ ہے، ہماری کتابوں سے سیکھنے کو اگر کچھ ملتا ہے تو وہ بہت ہی تھوڑا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ نوجوان ادیب ہر فیکٹری سے، ہر اجتماعی فارم سے ابھر کر آتے ہیں اور ہماری آرزو یہ ہے کہ وہ اپنے فن کے ماہر بن جائیں کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو ہماری مدد اور سہارے سے ہماری جگہ لیں گے۔ ان کی نشو و نما اور ترقی کی ذمہ‌داری بڑی حد تک ہم پر آتی ہے۔ اور ہم کیا کرتے ہیں؟ ہم نہ صرف یہ کہ ایسی گھٹیا کتابیں تخلیق کرتے ہیں جن میں ادبی خوبیوں کا فقدان ہوتا ہے اور اس طرح نوجوان ادیبوں کی ترقی کی رفتار سست کر دیتے ہیں بلکہ درحقیقت ہم اپنی نئی پود کی تعلیم پر مضر اثر ڈالتے ہیں۔

قارئین کو بجا طور پر اعتراض ہے کہ ادیب گالیوں کا ضرورت سے زیادہ استعمال کرتے ہیں، جو ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہے کہ اب مزدوروں میں زیادہ مروج نہیں رہ گئی ہیں اور جو درحقیقت ماضی کی شرمناک باقیات میں سے ہیں۔ اکثر و بیشتر ہم ادیبوں کا (جن میں خود میں بھی شامل ہوں) خیال تھا کالیوں سے مکالمہ اصلیت سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے اور یہ بھول جاتے تھے کہ ہماری کتابوں کا مطالعہ صرف بالغ ہی نہیں کرتے جو اس اوچھے پن کو مسکرا کر ٹال جائیں گے، بلکہ تیرہ چودہ برس کے لڑکے لڑکیاں بھی کرتے ہیں جو اس دومعنی گفتگو اور گالیوں کو جو کتاب میں ملتی ہیں اپنی زبان پر بھی چڑھا لیتے ہیں۔ پھر یہ گالیاں نوجوانوں کی زندگی میں، اسکول اور خاندان میں گھس جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہر ادیب کو اس مسئلے پر غور کرنا چاہیئے۔

ہم سب کو سنجیدگی سے اس مسئلے پر بار بار غور کرنا چاہئے کہ ہم مزدور طبقے کی اور اپنی پارٹی کی بہترین خدمت کیسے انجام دے سکتے ہیں اور وہ کونسے ذرائع ہیں جن سے ہم اپنے عظیم دور کی تصویر پیش

کر سکتے ہیں، ہم اپنی کتابوں کے تاثر میں کیسے اضافہ کر سکتے ہیں کہ وہ صرف ہمارے ملک ہی میں نہیں بلکہ غیرممالک میں بھی قارئین کو خطرے سے آگاہی دیں، کہ وہ سوویت قارئین کو مزید کوشش کرنے کا جوش دلائیں اور مغربی یورپ کے پرولتاریوں کو اور نوآبادیاتی اور نیم نوآبادیاتی ملکوں کے مظلوم لوگوں کو مدد دیں کہ وہ سرمایہ‌داری کی غلامی کے جوئے سے اپنے آپ کو آزاد کرلیں۔

یہ نئے فرائض ایک اور مسئلہ پیدا کر دیتے ہیں: مزدور طبقے کا ایک نوجوان ادیب ہم میں سے ابھرتا ہے اور ہم اس سے کہتے ہیں کہ کلاسیکی ادب کا مطالعہ کرے اور سیکھئے لیکن طرز تحریر وہ ہم سے بھی مستعار لیگا۔ اور یہاں، نئی اور بہتر کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے اور خاص طور سے ابھرتے ہوئے نئے ادیبوں کے تعلق سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں: ہم سب کے، نئے اور تجربےکار ادیبوں کے سامنے پہلا مطالبہ یہی ہے کہ اپنے مواد کا اچھی طرح، پوری طرح مطالعہ کریں۔

یہ افضل‌ترین اہمیت کا نکتہ ہے اور میرے خیال سے اس جلسے میں ہمیں اپنی توجہ اس پر مرکوز کرنی چاہئے کیونکہ آپ، ہمارے مزدور قارئین، ادیبوں کو حقائق کے متعلق غلطیوں سے بچنے میں بڑی مدد دے سکتے ہیں۔

پچھلے دنوں میں نے ایک افسانہ پڑھا جو ایک صنعتی مزدور کا لکھا ہوا ہے۔ اور اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ روئی کے پیلے پیلے گالے جیسے بطخ کے چوزے وسط اگست میں پانی میں تیرتے پھر رہے تھے اور اجتماعی کاشتکاروں کو اناج کی شکل میں اجرت اناج بچھوڑنے کا آغاز ہونے سے پہلے ہی مل گئی۔ جس شخص نے یہ لکھا ہے اس کو نہیں معلوم کہ حساب میں اجرت کی ادائیگی اس وقت تک شروع نہیں ہوتی جب تک کہ رئی، جو سب سے پہلے تیار ہونے والا اناج ہے، بچھوڑ نہ لی گئی ہو اور یہ کہ بطخ کے پیلے چوزے اگست میں تیرتے نہیں پھرتے۔ کوئی اجتماعی کاشتکار اس قسم کی کہانیوں کو پڑھ کر تو یہی سوچیگا: "واہ، کیسے کیسے لکھنے والے ہیں! ان کا اعتبار ہی نہیں کیا جاسکتا۔"

ہم جو کتابیں پڑھ چکے ہیں ان کو یاد کریں تو یہاں سب کو ایسی مثالیں یاد آئیں گی جہاں کسی ادیب نے پیداوار کے اور مزدوروں کی دنیا کے بارے میں لکھا ہے جس کے بارے میں اس کو سطحی معلومات تو حاصل تھیں مگر تفصیلی معلومات اور باریکیوں کا علم حاصل کرنے کی اس نے تکلیف ہی گوارا نہیں کی تھی۔ اگر مصنف سب سے پہلے اپنے مواد کا

مکمل مطالعہ نہیں کرتا تو اس کی تصنیف حقیقی ادب پارہ نہیں ہوگی۔

آپ کے ہاں کارخانے میں ایک ادبی گروہ ہے اور خوبی معائنہ کرنے والے انسپکٹروں کے علمی ادارے ہیں جہاں وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے مخصوص ہنر میں کمال حاصل کرچکے ہوتے ہیں اور جن کو اپنے اوزاروں پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔ کسی چیز کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے آپ کے نوجوان ادیبوں کو ان تجربے کار اور نسبتاً معمر لوگوں سے مدد حاصل کرنی چاہئے جو ظاہر ہے کہ شائع ہونے والی کتابوں کی خوبیوں اور خامیوں کا بھی جائزہ ضرور لیتے ہوں گے۔ اپنی جانب سے ہم، مصنف، تجربے کار مزدور سے اپیل کرتے ہیں: برائے مہربانی ہم پر عنایت کیجئے اور اپنے نوجوان مصنفوں کی مدد کیجئے اور ہم بھی اپنی طرف سے ضرور مدد کریں گے۔

مجھے یقین کامل ہے کہ مزدور قارئین اور سوویت ادیبوں کے درمیان جو تعلق قائم ہوا ہے اس کو ضرور تقویت حاصل ہوگی اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر یہ تعلق قائم رہا تو سوویت ادب اور بھی اچھی سے اچھی تصنیفات پیش کر سکیگا۔

۱۹۳۴ء

کروڑوں کے لئے وہ شجاعت کی ایک مثال رہیں گے

سوویت ادیبوں کی صفوں میں سے سب سے زیادہ شجاع اور سب سے زیادہ پر عزم مجاہد کو موت نے جھپٹ لیا۔ بیماری اگرچہ ان کو جسمانی اعتبار سے شکست دے چکی تھی اور ان کو بے حد تکلیف برداشت کرنی پڑرہی تھی، لیکن پھر بھی وہ پارٹی کے اعلی مقاصد کی فتح کے لئے کمیونسٹ ادیب کے ہتھیار سے آخر دم تک لڑتے رہے۔ کروڑوں لوگ اوستروفسکی کی مثال سے سیکھیں گے کہ کس طرح زندگی بسر کی جائے، کس طرح جدوجہد کی جائے، کس طرح فتح حاصل کی جائے اور کس طرح مادروطن سے محبت کی جائے۔

ہمیں اپنے ملک، اپنی پارٹی اور لیننی کومسومول پر فخر ہے کہ اس نے ایسے حیرت انگیز شخص کو پروان چڑھایا۔ انہیں محبت، احسانمندی اور قدر و منزلت کے ساتھ یاد کیا جایا کریگا۔

ہمیں نقصان عظیم اٹھانا پڑا ہے۔

۲۳ دسمبر ۱۹۳۶ء

سوویت ادیب کے بارے میں

ہسپانوی وفد کے ایک رکن کپتان اینجل اینتم نے دریافت کیا کہ سوویت ادیبوں کو ان کے کام کا معاوضہ کس حساب سے دیا جاتا ہے۔

مغربی یورپ کے دوروں پر جب بھی میں گیا مجھے بار بار اس سوال کا جواب دینا پڑا۔ اور ہر بار میں نے اس گہرے بنیادی فرق کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا جو سوویت اور بورژوا ادیبوں کے درمیان ہے۔ ضمیر فروش ادیبوں کی ناز برداریاں کرکے سرمایہ داری ایماندار ادیبوں کو بھی بگاڑ دیتی ہے۔ قدرتی بات ہے کہ میری مراد ان فاشسٹ دشمن ادیبوں سے نہیں ہے جنہوں نے اپنا مقدر جمہوریت اور ترقی کی جدوجہد سے وابستہ کر لیا ہے۔

بورژوا ادیب کے گرد و پیش کے حالات اس میں انفرادیت کے رجحانات پیدا کرتے اور ادبی تخلیق کی سماجی اہمیت کو پس منظر میں دھکیل دیتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے وہ سوویت ادیب کے برعکس ہوتا ہے۔

سوویت وسیلۂ تقویت سے الگ تھلگ کرکے سوویت ادیب کا نقش ذہن میں مرتب نہیں کیا جاسکتا۔ انقلاب سے پہلے کے ہمارے بعض مصنفوں کی آرزوئیں اب ہم کو نہایت سادہ لوحی کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بحیرۂ اسود کے ساحل پر ذاتی مکان ہو، اپنی بڑھیا موٹرکار ہو... واقعی ہمارے خوابوں اور ہمارے مقاصد میں اور اس میں کچھ بھی مشترک نہیں ہے۔

سوویت ادیب اور سوویت عوام کے درمیان تعلقات کا خاکہ میری اپنی زندگی کے حالات سے مرتب کیا جاسکتا ہے۔

میں بالائی ڈان کے ایک گاؤں ویشنسکایا کا باشندہ سوویت حکومت کی فتح کے لئے خانہ جنگی میں لڑا۔ سوویت حکومت اور بالشویک پارٹی نے مجھے جنم دیا، پروان چڑھایا۔ میں سوویت جنتا کا سپوت ہوں۔ اور سوویت حکومت نے جس طرح میری دیکھ بھال کی اس کو اپنے بیٹے کے لئے ماں کی ممتا سے ہی تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔

کپتان اینتم یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ سوویت ادیبوں کی انجمن پین کلب کی ممبر کیوں نہیں ہے۔ جواب سادہ ہے۔ پین کلب کے ممبروں میں فاشسٹ بھی ہیں۔ اور ہم، سوویت ادیب، ایک ایسی ادبی تنظیم میں شامل نہیں ہو سکتے جس میں فاشسٹ آرام سے رہ سکتے ہوں۔

میں اس سلسلے میں فاشزم اور رجعت پسندی کے خلاف ہسپانوی

عوام کی بہادرانہ جدوجہد کے بارے میں سوویت عوام کے رویے کے متعلق چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ دارالعوام میں کسی میمبر نے عدم‌مداخلتی کمیٹی کے بدنام کن رویے کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کے ساتھ کہا تھا کہ اس کمیٹی کی سرگرمی پر اس کو مایوسی ہوئی ہے۔

''مایوسی ہونا،، ایک ایسا فعل ہے جو ہمارے کانوں کو عجیب معلوم ہوتا ہے اور موجودہ سیاق و سباق میں ہمارے ہاں قطعی غیرمستعمل ہے۔

لندن کی کمیٹی کی پالیسی پر ہمیں غم‌وغصہ ہے۔ اس کمیٹی نے عدم‌مداخلت کو درحقیقت جمہوریائی ہسپانیہ کی ناکہ‌بندی کرنے کی آڑ بنا لیا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ''انسان دوستانہ،، قراردادوں کے پردے میں مداخلت‌پسندوں کو بےحساب مراعات دی جارہی ہیں تو ہمارے دلوں میں غم و غصے کا ایک طوفان امڈنے لگتا ہے۔

جمہوریائی ہسپانیہ کی بہادرانہ جدوجہد کو ہم نہایت توجہ سے دیکھ رہے ہیں۔ اور ہم ایسے واقعات سے سخت بےچین ہو جاتے ہیں جیسا کہ پچھلے دنوں کاتالونیا میں ہوا جہاں تروتسکیائی* فاشست عناصر نے بعض نراجی گروہوں کو کارروائیاں کرنے پر اکسا کر جمہوریائی محاذ کے عقب میں غدر کرانے کی کوشش کی جس کا مقصد عوامی محاذ کی جڑیں اکھاڑنا تھا۔

یہاں خود ہمارے انقلاب کے دنوں کی یاد تازہ ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ سوویت حکومت نے محنت کشوں کے دشمنوں کے خلاف غیرمصالحانہ جدوجہد کی اور ہماری جیت اس لئے ہوئی

---

* تروتسکی (برونشٹین) ل۔ د۔ (۱۸۷۹ء—۱۹۴۰ء) ۱۹۱۷ء میں بالشویک پارٹی میں لیا گیا۔ ۱۹۲۳ء سے تروتسکی نے پارٹی کی جنرل لائن کے خلاف سخت گروہ‌بند جدوجہد کی۔ لینن‌ازم کا سخت دشمن ہو گیا۔ ۱۹۲۷ء میں اسے پارٹی سے نکال دیا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں سوویت دشمن سرگرمیوں کے لئے اس کو جلاوطن کردیا گیا اور ۱۹۳۲ء میں سوویت شہریت کے حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ بیرون ملک میں اس نے سوویت ریاست، کمیونسٹ پارٹی اور بین‌الاقوامی کمیونسٹ تحریک کے خلاف جدوجہد جاری رکھی۔ (ایڈیٹر)

کہ مزدور طبقے کے نصب العین سے غداری کرنے والے تمام لوگوں کو ہم نے بلارو رعایت کچل دیا اور جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

سوویت یونین میں اپنے قیام کے دوران میں ہسپانوی عوام کا وفد ملک کے خواہ کسی کونے میں بھی کیوں نہ جائے آپ کے بہادر ساتھیوں کو ہر جگہ ہسپانیہ کے واقعات سے گہری دلچسپی اور جمہوریہ کے مجاہدوں سے حقیقی، پرجوش ہمدردی نظر آئے گی۔ میں ویشنسکایا میں رہتا ہوں اور کاسک مرد اور عورتوں کو اپنے سیدھے سادے پرخلوص انداز میں کہتے سنتا ہوں کہ اپنی خودمختاری کے لئے ہسپانوی عوام کی نیک جدوجہد انہیں دل سے عزیز ہے۔

فاشستوں، عصر حاضرہ کے آدم‌خوروں سے ہمارے عوام بےحد نفرت کرتے ہیں۔

ہمارے عوام کو اپنے ان بھائیوں کی شفقت‌آمیز فکر لگی رہتی ہے جو ہتھیار اٹھا کر فاشست رجعت‌پسندی کے خلاف محاذ جنگ پر لڑ رہے ہیں۔ ساتھیو، ہمیں تمہاری فتح پر گہرا یقین ہے! ہمارے دل اور ہماری ہمدردیاں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں!

۱۹۳۷ء

عوام کا ترجمان

سلیمان استالسکی صحیح معنوں میں عوامی شاعروں کے اس زمرے میں سے تھے جنہیں عوام نے پروان چڑھایا لیکن جنہیں سوویت حکومت کے قائم ہوجانے کے بعد ہی شرف قبولیت حاصل ہوا۔ ان کے ہموطنوں کے خیالات، ان کی خوشیوں اور ان کے غموں کو استالسکی کے گیتوں کی شکل میں نغمگی اور مسحورکن تازگی حاصل ہوئی۔ شاعر کی مہارت اور چابکدستی سے مالامال ہوکر وہ پھر عوام میں واپس پہنچ گئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان میں اپنا مقام بنا لیا۔ مگر استالسکی کی شاعری کی مقبولیت ان کے کوہستانی وطن ہی تک محدود نہیں رہی۔ ان کے اشعار، جن کا حسن ترجمے میں یقیناً کسی نہ کسی حد تک ضرور ماند پڑ گیا ہوگا، جب ہم پڑھا کرتے تو کون تھا جو ان کی حیرت انگیز خوبصورتی اور قادرالکلامی پر محوحیرت نہ رہ جاتا تھا؟ یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات کی خبر اس قدر کربناک ہے۔

باقی تمام سوویت مصنفوں اور سلیمان استالسکی کے بیشمار قارئین کے ساتھ میں بھی اس انتہائی دانشمند شاعر کے، جو عوام کا سچا ترجمان تھا، جسد خاکی کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔

۱۹۳۷ء

بالشویک ادیب

انیسویں جنوری کو ہم الکساندر سیرافیموویچ کی پچھترویں سالگرہ منانے والے ہیں۔ سوچئے تو سیرافیموویچ پچھتر برس کے ہو گئے! کتنی دلکش، جوانمردی کا بڑھاپا ہے یہ! جب ان کے پاس ہوتے ہیں تو کسی طرح کوئی یقین ہی نہیں کر سکتا کہ یہ پچھتر کے کہیں آس پاس بھی ہوں گے، اتنے خوش و خرم، زندہ‌دل اور ملنسار ہیں وہ! ان کی صحبت میں ہمیشہ ایسا لگتا ہے جیسے کہ آپ کی اور ان کی عمر ایک ہی ہو۔

میں ان مرد بزرگ کو بہت چاہتا ہوں۔ وہ حقیقی معنوں میں فنکار اور ایک بڑی شخصیت ہیں جن کی تخلیقات سے ہم سب واقف ہیں اور بہت ہی پسند کرتے ہیں۔ سیرافیموویچ اس نسل کے ادیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن سے ہم نوجوانوں نے سیکھا ہے۔ میں ذاتی طور پر ان کا بڑا ہی مقروض ہوں کیونکہ مجھے ایک مصنف کی حیثیت سے انہوں نے میری ادبی زندگی کے آغاز میں سب سے پہلے سہارا دیا تھا اور سب سے پہلے میری ہمت‌افزائی اور قدرشناسی کی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہمارے تعلقات اس سے اثرانداز ہوتے ہیں۔

میں ۱۹۲۵ء کبھی فراموش نہ کر سکوں گا جبکہ سیرافیموویچ نے میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ پڑھنے کے بعد اس کے لئے نہایت گرمجوشی سے پیش لفظ لکھا تھا اور اس سے زیادہ یہ کہ کہا تھا مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان سے میری سب سے پہلی ملاقات سوویتوں کے پہلے گھر میں ہوئی۔ سیرافیموویچ نے مجھے اطمینان دلایا کہ مجھ میں مصنف بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ انہوں نے مجھے نصیحت کی کہ میں لکھتا رہوں اور جو کچھ لکھوں اس کے ہر حصے پر نہایت سنجیدگی سے کام کرنا سیکھوں اور کبھی عجلت نہ کروں۔

میں نے ان کی نصیحت پر ہمیشہ عمل کرنے کی کوشش کی۔

پانچ برس ہوئے پارٹی، حکومت اور سوویت عوامی تنظیموں نے سیرافیموویچ کی سترویں سالگرہ منائی تھی۔ سیرافیموویچ نے ہم سب کو یہ کہہ کر ٹھنڈا کرنا چاہا کہ جب آدمی بوڑھا ہوتا ہے تو یہ افسوس کی بات ہوتی ہے، بڑھاپا کوئی ایسی چیز نہیں جس کا جشن منایا جائے۔ میرا خیال ہے کہ ہم سوویت ادیبوں کو یہاں سیرافیموویچ سے اختلاف ہو گا خواہ وجہ صرف یہی کیوں نہ ہو کہ ان کا ''آہنی سیلاب،، خانہ‌جنگی کے متعلق پہلا بڑا ناول تھا۔ ان دنوں ہمارے پاس اور کچھ نہ تھا۔ اور ان کا ''آہنی سیلاب،، سوویت ادب کی بہترین تخلیقات میں شامل رہا ہے۔

مگر سیرافیموویچ ہمیں نہ صرف اپنی کلاسکی تصنیف ''آہنی سیلاب،، کے باعث پیارے ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ وہ پرانی نسل کے ان بالشویک ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے رجعت‌پسندی کی تاریکی میں بھی اپنے عقیدے کی پاکیزہ شمع روشن رکھی، اس دشوارترین زمانے میں بھی جبکہ بہت سے لوگ پرولتاریہ کو دغا دے گئے تھے، انقلاب اور مزدور طبقے کے وفادار رہے۔ کیا ان کے ناول ''میدانوں کا ایک قصبہ،، اور بیشمار افسانوں نے پرانے روس کی سچی تصویر ہمارے سامنے پیش نہیں کی؟

سیرافیموویچ نے طویل، بڑی زندگی پائی ہے۔ وہ زارشاہی کے قیدخانوں میں اور جلاوطنی میں رہ چکے ہیں۔ وہ لینن کے برادر بزرگ سے واقف تھے جنہوں نے الکساندر سوئم کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ''پراودا،، کے نامہ‌نگار کی حیثیت سے سیرافیموویچ خانہ‌جنگی کے تمام محاذوں پر گئے۔

اپنے سن کے باوجود وہ اب بھی اتنے ہی پرجوش اور چاق چوبند ہیں جتنے کہ پانچ یا دس برس پہلے تھے۔ کچھ تو ہے ایسی چیز جو اس انتھک بوڑھے آدمی کو نوجوانوں جیسا جوشیلا رکھتی اور وقت کی دستبرد سے محفوظ رکھتی ہے۔

ویشنسکایا میں سیرافیموویچ کی آمد مجھے یاد ہے۔ انہوں نے کئی روز میرے ہاں قیام کیا۔ دریائے ڈان کا پانی خواہ کتنا ہی ٹھنڈا کیوں نہ ہوتا انہوں نے پیراکی کی کبھی ناغہ نہیں کی۔ ان کی انتھک، لازوال توانائی پر میں عش عش کرتا جو خط بنانے اور غسل کرنے کے بعد ہمیشہ تروتازہ نظر آتے۔

کیسی جوان سال روح ہے!

۱۹۳۸ء

(اقتباس)

ساتھیو،

اس منبر پر چڑھتے ہوئے میں کچھ گھبراہٹ سی محسوس کر رہا تھا۔ میری گھبراہٹ کی وجہ یہ ہے کہ میں ضخیم اور، افسوس کہ ناتمام ناولوں کے مصنف کی حیثیت سے بدنام ہوں۔ اور اس لئے میں سوچ رہا تھا کہ جیسے صدرجلسہ نے میرا نام اگلے مقرر کی حیثیت سے پکارا تو آپ نے دل ہی دل میں کہا ہوگا: ''اچھا، تو یہی شولوخوف ہے جو طول طویل کتابیں لکھتا ہے مگر پوری کبھی نہیں کرتا۔ وہ شاید بولتا ہی رہیگا حتی کہ صاحب‌صدر اسکو وقت ختم ہوجانے کی یاددہانی کرائیں۔'' اور یہ سوچتے ہی آپ چپ چاپ ایک ایک کرکے کھسکنے لگیں گے۔ خیر تو اس سے پہلے کہ آپ اپنی نشستیں چھوڑ کر جائیں میں جلدی سے یقین دلانا چاہتا ہوں کہ تقریر مختصر کروں گا اور گھنٹی بجنے سے پہلے ہی ختم کردوں گا۔ اگر میری یہ مختصر تقریر بھی آپ کو طویل معلوم ہو تو برائے مہربانی بس ذرا ہلنا جلنا شروع کیجئے اور میں جلدی سے ختم کردوں گا...

میں ادب کے بارے میں اور کچھ تھوڑا سا کاغذ کے بارے میں یعنی فن اور صنعت کے دو باہم متعلق شعبوں کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

مجھ سے پہلے جو تقریر کر رہے تھے انہیں سن سن کر مجھے رشک ہو رہا تھا۔ خواہ کسی چیز کا ذکر ہو، کوئلے کا یا اناج کا، تیل یا چقندر کا انہوں نے اعداد و شمار اور فی‌صد تناسبات کا حوالہ دیا اور اس سے سب پر بخوبی عیاں ہو جاتا کہ کام کتنا ہوا ہے۔ اس کے برعکس ادب کا معاملہ ایسا ہے کہ اعداد و شمار اور فی‌صد تناسب سے اس کا محض دور پرے کا ہی تعلق ہے۔ اور یہاں میں آپ کے سامنے خالی ہاتھ کھڑا ہوں اور کوئی ایسی چیز نظر بھی نہیں آرہی کہ جس کا سہارا لوں...

ساتھیو، میرا خیال ہے کہ یہاں ہمیں اپنی پیداوار کا — پچھلے پانچ سال کے دوران میں جو کتابیں شائع ہوئیں ان کا — ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ اچھی کتابیں آپ سب پڑھ چکے ہیں اور جو خراب ہیں ان کا ذکر نہ کرنا ہی اچھا ہے۔

ہم اب بھی بہت تھوڑا لکھتے ہیں۔ کانگرس میں کتابوں کی جو دکانیں کھلی ہیں ان میں افسانوی ادب کی تخلیقات کی کمی زبان‌حال سے سب کچھ کہہ رہی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے دوست مصنف بھائی جو اس کانگرس کے ڈیلی گیٹ ہیں، کیا محسوس کرتے ہیں مگر میری حالت تو یہ ہے کہ ان دکانوں سے بچکر دور ہی دور سے نکل جانا چاہتا ہوں اور اگر بچکر نکلنے کی کوئی صورت نہ ہو تو جلدی سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتا ہوں کہ کہیں کوئی ڈیلی گیٹ میرا دامن نہ تھام لے اور یہ نہ پوچھنے لگے: ''یہاں کتابیں کیوں نہیں ہیں؟ کیا ادیبوں کے قلم خشک ہو گئے؟''

آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں سننا کسی مصنف کے لئے کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ ساتھیو، بدقسمتی سے ہمیشہ ہی ایسا نہیں ہوتا کہ ہم اچھا لکھتے ہوں۔ یہ کہنے کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ سوویت ادب کے وجود کے بیس برس کے عرصے میں ہم نے کچھ تو حاصل کر لیا ہے۔ ان کامیابیوں کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے حکومت نے ہمارے بہت سے ادیبوں کو تمغے انعام دئے ہیں۔

ہماری برادر قومی جمہوریاؤں کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات جن کے بارے میں روسی عوام کو اب تک بہت تھوڑی معلومات تھیں، اب ملک گیر مقبولیت حاصل کرچکی ہیں۔ ان ادیبوں کی تازہ دم آوازیں روسی ادب کی آواز میں ہم‌آہنگ ہوکر شامل ہوگئی ہیں، اس کو مالامال کر دیا ہے اور اس کو حقیقی معنوں میں بین‌الاقوامی ادب بنا دیا ہے۔

کیا ہم میں کوئی بھی جمبول کے رزمیہ گیتوں سے جو اپنی سادگی کے باوجود پرکار ہوتے ہیں، متاثر ہوئے بغیر رہ‌سکتا ہے؟ کیا جارجیائی نظموں کی مسحورکن شیریں بیانی نے ہمارے دل نہیں موہ لئے؟ کیا سلیمان استالسکی کے انوکھے، نغمہ‌ریز دلفریب اشعار ہمیں مغلوب نہیں کر لیتے؟ اگرچہ ترجمے میں اصل کے حسن کا ایک حصہ ضرور ضائع ہو جاتا ہے، مگر ان مصنفوں کی تخلیقات نے براہ‌راست ہمارے دل کو متاثر کیا...

ساتھیو، آپ کو معلوم ہی ہے کہ سوویت مصنفین اور قارئین کے درمیان تعلقات ان سے قطعی مختلف ہوتے ہیں جو سرمایہ‌دار ملکوں میں ملتے ہیں۔ اپنے فن سے جن لوگوں کی ہم خدمت کرتے ہیں وہ ہمارے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنے سے کبھی نہیں ہچکچاتے۔

ہماری تنقید کی جاتی ہے، جب ضرورت ہو تو سرزنش کی جاتی ہے، جب ہمیں ناکامی ہوتی ہے تو سہارا دیا جاتا ہے، جب کام قابل تعریف ہو تو تعریف کی جاتی ہے، اور ہم میں سے ہر ایک کو عوام کے رہبرانہ دست شفقت کا ہر وقت احساس رہتا ہے۔ اور اس لئے جب لوگ مصنف سے کہتے ہیں کہ وہ بہت ہی کم لکھتا ہے یا یہ کہ اس کی تخلیقات گھٹیا قسم کی ہیں تو مصنف اپنی صفائی میں بھلا کیا کہہ سکتا ہے؟ وہ تو منہ لٹکا کر کھڑا ہو جاتا ہے، بے ربط باتیں بڑبڑانے لگتا ہے کہ وہ سنبھلنے کی کوشش کرے گا۔ کبھی وہ سنبھل بھی جاتا ہے لیکن ہمیشہ ہی ایسا نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی وہ چاہتا تو ہے کہ بہتر کتاب لکھے مگر ہزار کوشش کے باوجود نہیں لکھ پاتا، اس کے پاس وہ چیز ہی باقی نہیں بچتی جو چاہئے ہوتی ہے، اس کی صلاحیت سلب ہوکر رہ جاتی ہے۔

اس مسئلے کا ایک رخ اور بھی ہے، اور اس کے بارے میں ہمیں صاف اور واضح طور پر بات کرنی ہے — یہ ہے کاغذ کا مسئلہ۔ افسانوی ادب کے لئے جو کاغذ دینا طے پایا ہے اس کا فی صد تناسب بہت تھوڑا ہے، اس قدر تھوڑا کہ دل دکھتا ہے۔ گوس لیتیزدات* والے کہتے ہیں کہ اگر امسال وہ ہر انعام یافتہ مصنف کی، جن کی تعداد ۱۷۲ ہے، صرف ایک کتاب شائع کریں تو ان کے حصے میں جو کاغذ آیا ہے وہ ذرا نہ بچے لیکن بہرحال صرف ان لوگوں کی ہی تصانیف تو نہیں چھپنی چاہئیں جن کو انعام مل چکا ہے، بلکہ ان ادیبوں کی بھی جن کو آئندہ انعام ملنے ہیں۔

اور پھر ان ادیبوں کا زمرہ ہے جنہیں بعید ماضی میں اپنے علم و دانش کا ثمرہ سائبیریا میں قیدبامشقت کی اور جلاوطنی کی شکل میں ملا تھا، ان کو ذلیل اور رسوا کیا گیا تھا، ان کو معمولی فوجی کی طرح فوج میں جبریہ بھرتی کیا گیا، ریاست کے ادارے اور کلیسا کی زبردست طاقت سے ان کو کچل دیا گیا یا ان کو بےمہار افسروں نے نہایت نابعداری کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس ذلت، اس برلے درجے کی بےشرمی کی ذمہ داری اس ملعون حکومت کے سر ہے جس کا ہمارے عوام اور ہماری پارٹی نے ۱۹۱۷ء کے اکتوبر میں ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا۔ وہ حکومت تاریخ کے سامنے اس کی جواب دہ

*ریاستی ادبی اشاعت گھر - (ایڈیٹر)

ہوگی۔ کلاسکی ادب کا ہم احترام کرتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں اور اب، سوویت اقتدار کے تحت ہی اس کی کتابیں عام قارئین کی دسترس میں پہنچی ہیں۔ یہ کتابیں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئی ہیں اور اب بھی وہ کافی نہیں ہیں۔ افسانوی ادب کی اشاعت کے لئے اور بھی کاغذ دینا چاہئے۔ انتظام اس طرح کرنا چاہئے کہ کاغذ ذخیرے میں رہے اور اچھی کتابوں کا منتظر رہے۔ اس کے برعکس صورت نہیں ہونی چاہئے۔ یہ حالت ناقابل برداشت ہے کہ قارئین کے پاس سے پوشکن کے لئے دس لاکھ کی فرمائشیں آئی ہوئی ہیں، شیوچنکو کے لئے پانچ لاکھ کی، مگر ہم امسال صرف چند درجن ہزار جلدیں ہی شائع کریں۔

ایک زمانے میں جب نئی کتابوں کی کمی کے باعث گوس لیتیزدات کو محض پرانی کتابوں کو دوبارہ شائع کرنے پر ہی اکتفا کرنا پڑتا تھا تو مذاق میں مصنفین اس کو طبع ثانی کا ریاستی اشاعت گھر کہتے تھے۔ مجھے خوف ہے کہ کاغذ کی اگر ایسی ہی حالت رہی تو گوس لیتیزدات کو لوگ کہیں ریاستی بےاشاعت گھر نہ کہنے لگ جائیں۔ پھر بھی مصنفین افسانوی ادب کے لئے کاغذ کا کوٹا بڑھانے کے متعلق پرامید ہیں کہ معاملہ انہیں کے حق میں فیصل ہوگا۔

چند الفاظ، ساتھیو، اس جنگ کے متعلق سوویت ادیبوں کے رویے کے بارے میں جو فاشسٹ ہمارے سر منڈھ رہے ہیں۔ یہ توقع کرتے ہوئے کہ آئندہ چل کر ہم پیداوار کی بعض شاخوں پر مقدار اور خوبی دونوں کے اعتبار سے سبقت حاصل کرلیں گے، لیکن ایک شاخ ایسی ہے جس پر ہم مصنفین سبقت حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے — میری مراد دفاعی صنعت سے ہے، اول تو اس لئے کہ کسی طرح سبقت حاصل کرنے کی بہرحال کوئی صورت نہیں ہے، دوسرے اس لئے کہ یہ اتنی اچھی، انتہائی اہم شاخ ہے کہ اس پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرنا صاف ناشائستگی ہوگی۔ ہم سب کی بھلائی اور ہمارے دشمنوں کے خاتمے کے لئے اس کو فروغ حاصل ہو اس کی ترقی ہو۔

سوویت مصنفین مغربی یورپی صلح پسندوں کی جذباتی نسل سے تعلق نہیں رکھتے۔ اگر دشمن ہمارے ملک پر حملہ کرتا ہے تو ہم سوویت ادیب اپنے قلم رکھ دیں گے اور پارٹی اور حکومت کی للکار پر دوسرا ہتھیار اٹھا لیں گے اور جس رائفل رجمنٹ کا کامریڈ

ورونسلوف نے ذکر کیا ہے، اس کی جب گولیاں داغی جائینگی تو ان میں ہمارا سینہ بھی شامل ہوگا، اتنا ہی وزنی اور گرم جتنی فاشزم سے ہماری نفرت، جو دشمن کو مار کاٹ کر ڈھیر کر دیگا۔

لال فوج کی صفوں میں، اس کے شاندار لال جھنڈوں کے زیر سایہ ہم دشمن کو ایسے مار گرائیں گے جیسے پہلے کبھی کسی نے نہ کیا ہوگا، اور میں آپ کو، کامریڈ ڈیلی گیٹو، یقین دلاتا ہوں کہ ہم اپنے نقشوں کے خول چھوڑ کر نہیں بھاگیں گے — یہ جاپانی رواج ہماری شان کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس ہم اوروں کے نقشوں کے خول اٹھا لیں گے کیونکہ ان میں سے ہمیں جو کچھ ملیگا وہ بعد میں ہماری ادبی سرگرمیوں میں کام آئیگا۔ دشمن کا صفایا کرکے ہم کتابیں لکھیں گے اور تفصیل بیان کریں گے کہ کیسے کیا۔ یہ کتابیں ہمارے عوام کے کام آئیں گی اور کوئی حملہ‌آور اگر بچ رہا تو اس کے لئے تنبیہہ کا کام دیں گی۔

ساتھیو، آپ میں سے بہتوں کی طرح میں بھی پارٹی کانگرس میں اپنی زندگی میں پہلی بار شامل ہوا ہوں۔ ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم سوویت دانشوروں کی پہلی کونپلیں ہیں جنہیں پارٹی نے پروان چڑھایا ہے۔ ہمارے بعد کروڑوں لوگ آئیں گے، کلچر جن کی زندگی کا ایک جزو بن چکا ہوگا۔

۱۹۳۹ء

ایک عظیم الشان فن کار

الیکسئی تالستائی ایک ایسے ادیب تھے جن کے سینے میں ایک عظیم روسی روح تھی اور جو متنوع جوہرِ خداداد کے مالک تھے۔ لاکھوں قارئین میں ان کی مقبولیت جو انہوں نے برسہا برس کے انتھک کام سے، اور تحریر کے معاملے میں نہایت سخت گیری سے حاصل کی تھی، حقیقی معنوں میں عظیم تھی اور وہ اس کے مستحق تھے۔

بچوں کی کہانی ہو، تواریخی ناول یا جنگ کی کہانی، ہر چیز تالستائی کے مضبوط اور سخت گیر ہاتھوں میں پہنچکر ایسے رنگ میں رنگ جاتی جس میں زندگی کی آب و تاب ہوتی تھی، اور سنگ تراشی کے ایک شہپارے کا حیرت انگیز تجسیمی لمس جسے پیدا کرنے میں سچا فنکار ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔

حب الوطنی کی جنگ عظیم کے زمانے میں لکھے ہوئے اپنے مضمونوں میں تالستائی، جو اپنی مادرِ وطن سے بے حد پیار کرتے تھے اور فاشزم سے تہ‌دل سے نفرت کرتے تھے، وکیل جمہور کی غضبناک زبان میں بولے اور ان کی بات محاذ جنگ پر فوجی سپاہی بڑی توجہ سے سنتے تھے اور وہ بھی جو عقب میں کام کرکے لال فوج کو اس معرکۂ عظیم میں فتح حاصل کرنے میں مدد دے رہے تھے۔

اس پرآشوب زمانے میں جبکہ جرمن ماسکو پر بڑھے چلے آ رہے تھے، تالستائی نے روس کے سچے بیٹے کی حیثیت سے جسے اپنے ہموطنوں پر بے‌پناہ عقیدہ ہو، سوویت عوام کے روبرو روس کے ماضی کی تاریخی عظمت کے زندہ جاوید پیکر پیش کئے اور ہمارے جلیل القدر بزرگوں کے پند و نصائح ان کو یاد دلائے۔ ان کے مضامین کا بنیادی خیال یہ ہوتا کہ "ہم قدم جمائے کھڑے رہیں گے!" ان کے عنوان بھی للکار تھے: "کارہائے نمایاں کے لئے"، عظمت و شان کے لئے اٹھ کھڑے ہو!"، "ثابت قدمی"، "نذر"، "اعتقاد فتح"، "روس جیسے غصہ دلایا گیا"، "ناقابل تسخیر قلعہ"، "اپنی سوویت مادرِوطن کے لئے!"، "دشمن سے نفرت کرو!"۔

مضمون بعنوان "ہم کس کی مدافعت کر رہے ہیں؟" میں جو ۲۷ جون ۱۹۴۱ء کو لکھا گیا تھا، تالستائی نے سوویت وطن سے اپنی محبت کا اظہار ان الفاظ میں کیا جو سادہ اور بہ اعتبار خلوص ولولہ‌انگیز تھے۔ انہوں نے کہا تھا:

"میرے ملک، میری سرزمین، میری مادرِوطن، کوئی جذبہ زندگی میں اتنا پرجوش، گہرا اور مقدس نہیں جتنا تیرے لئے میرا جذبۂ محبت ہے..."

ایک اور مضمون میں انہوں نے سوویت انسان کے متعلق یہ ولولہ انگیز الفاظ لکھے تھے: "سوویت اور سب سے پہلے روسی انسان کی ذہنیت یہ ہے کہ اس مشروب کے بڑے بڑے گھونٹ پینے کے بعد جس کا نام آزادی ہے، اس کا یہ احساس اجاگر ہو جاتا ہے کہ جرمن سامراجیت کے اعداد مردم کشی کے علاوہ بھی آفتاب حیات بخش کے زیر سایہ اعلیٰ و ارفع انصاف موجود ہے... سوویت یونین، ان کے آبا و اجداد کی سرزمین، ان کے بیٹوں اور پوتوں کے لئے مسرت کی ارض‌موعود، موجود ہے۔"

محبت اور یقین کے یہ الفاظ جو صبرآزما دنوں میں کہے گئے تھے عوام کی احسانمند یادداشت سے کبھی بھی محو نہ ہو سکیں گے۔

تالستائی نے روسی ادب کی بہترین روایات جاری رکھیں اور وہ روسی زبان کی پاکیزگی کے پرجوش محافظ تھے۔ سوویت ادیبوں کی نوجوان نسل جس نے تالستائی کو اپنا سچا دوست پایا، ان کی ممنون احسان ہے۔

جنگ کے زمانے میں تالستائی اپنی انشائیہ تحریروں کے علاوہ اپنے شہپارے ''پیٹر اول'' اور اپنی ڈرامائی کہانی ''ہولناک ایوان'' کی تصنیف کے سلسلے میں بھی سخت محنت سے کام کرتے رہے۔

ہم سب کو اس احساس سے اطمینان بخش سکون رہتا تھا کہ زندگی سے پیار کرنے والے تالستائی جن کی روسی دانائی اور صلاحیتیں ضوفشاں رہتی تھیں، ہمارے پاس ہی رہتے اور کام کیا کرتے ہیں۔ ان کی تخلیقات کا ہم پیار اور امید کے ساتھ مطالعہ کیا کرتے اور یہ دیکھنے کے لئے رسالوں کی ورق گردانی بڑے اشتیاق سے کیا کرتے کہ ان کی کہیں کوئی چیز چھپی ہو۔ اب ان کی کمی ہمارے لئے اسی سبب سے اور بھی زیادہ سخت، اور بھی زیادہ تلخ ہے۔

جنگ کے بالکل شروع کے دنوں میں تالستائی نے لکھا تھا: ''تیسری رائخ'' کی فوجوں کا صفایا کرنے کے لئے تمام ''نازیوں'' کو ان کی تمام وحشیانہ خونی سازشوں سمیت صفحۂ ہستی سے مٹا دو اور ہماری مادر وطن کو امن، سکون، دائمی آزادی، افراط اور افضل ترین انسانی آزادی کی شاہراہ پر مزید پیشقدمی کے لئے ہر موقع فراہم کرو۔ یہ ہے وہ اعلی اور باعزت فریضہ جو ہمیں روسیوں کو اور ہماری یونین کی تمام برادر قوموں کو انجام دینا چاہئے۔''

اور کس قدر رنج ہے اس بات کا کہ وہ ہماری فتح کو جو اس قدر قریب آن پہنچی ہے، دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے۔

۱۹۴۵ء

الیکسئی تالستائی کے جنازے پر تعزیتی تقریر
(اقتباس)

...ہمارے عوام کو صدمۂ عظیم پہنچا ہے۔ سوگ کی تلخی تکلیف دہ ہے۔ ایک بڑے ادیب نے جس نے اپنی پوری زندگی، اپنی پرزور صلاحیت، عوام کے لئے وقف کر دی تھی، وفات پائی ہے۔

الیکسئی تالستائی ایک ایسے ادیب تھے جن میں فیاض روسی روح جاگزیں تھی اور جن کی خداداد صلاحیتیں آشکارا اور متنوع تھیں۔ اپنے سوویت وطن کے لئے، سوویت عوام کے لئے، ہر اس چیز کے لئے جو کسی روسی کو دل سے عزیز ہوتی ہے، اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لئے انہیں سادہ اور برکار الفاظ ملجاتے تھے۔ فاشسٹ درندوں کو جنھوں نے روسی کو، سوویت عوام کو غلامی کے جوئے میں جوتنے کی کوشش کی تھی، داغنے کے لئے انہوں نے چن چن کو زوردار اور غضبناک الفاظ استعمال کئے۔

ان صبر آزما دنوں میں جو ہمارے ملک کو دیکھنے پڑے تھے، تالستائی نے محبت اور یقین کی جو باتیں کی تھیں وہ عوام کی ممنون احسان یادداشت سے کبھی بھی نہ مٹ سکیں گی...

۱۹۴۵ء

ادب کا مربیٔ اعظم

میخائل ایوانووچ کالینن کی وفات سے، جن کا اب کل سوویت عوام دلی سوگ منا رہے ہیں، ہمارا ادب اپنے عظیم ترین مربی، ادیب کی کاوشوں کے ایک قابل اور باریک بیں مبصر سے محروم ہو گیا۔

میخائل ایوانووچ جنھوں نے روسی کلاسکی ادب کی فضا میں پرورش پائی تھی جس پر انہیں عبور حاصل تھا اور جس سے وہ ساری زندگی پاکیزہ اور پرشباب محبت کرتے رہے، ہمعصر ادیبوں کے کام میں نہایت سرگرمی کے ساتھ ہمیشہ دلچسپی لیا کرتے تھے۔

ابھی کوئی دو مہینے سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ میری ان سے گفتگو ہوئی تھی۔ میخائل ایوانووچ نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں کیا لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں اور میرا ناول ''وطن کے مجاہد'' کی کیا پیش رفت ہے، اور پھر کہنے لگے:

''بہت دنوں سے میں چاہتا تھا کہ تم سے ملوں اور تمہاری کتاب کے بارے میں بات چیت کروں۔ سچ پوچھو تو مجھے تشویش تھی کہ حب الوطنی کی جنگ عظیم کے متعلق ناول لکھتے ہوئے ممکن ہے کہ تم یہ بات نظر انداز کر جاؤ جو میرے خیال میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے،'' اور پھر میخائل ایوانووچ نے بتانا شروع کیا کہ میری آئندہ تصنیف میں وہ کن باتوں کی جھلک پانی جانی لازمی تصور کرتے ہیں۔

جب میں نے جواب دیا کہ یہ صورت حال میرے ذہن میں موجود تھی اور یہ کہ میں اس کو پیش کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کروں گا تو میخائل ایوانووچ نے جو اس وقت کاغذ میں تمباکو لپیٹ کر اپنے لئے سگریٹ بنا رہے تھے اپنی چمکدار عینک کے تالوں کے نیچے سے جھانک کر مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور مرد بزرگ کی میٹھی مسکراہٹ سے ان کا پورا چہرہ دمکنے لگا۔

''تو پھر ٹھیک ہے! بہت اچھا۔ پھر مجھے فکرمند نہ ہونا چاہئے تھا،، انہوں نے کہا اور زیادہ سنجیدگی کے ساتھ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولے: ''جانتے ہو، ہم پڑھنےوالے، تم لکھنےوالوں سے صرف یہی نہیں چاہتے کہ محض کتابیں مہیا ہوجائیں، ہم چاہتے ہیں اچھی کتابیں جو ہماری زندگی کی مکمل تصویر پیش کریں۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہارے منصوبوں میں گویا کہ ''دخل اندازی،، کر رہا ہوں۔ اور خاص طور سے جبکہ موضوع ایسا زبردست واقعہ ہو جیساکہ پچھلی جنگ جو ہمارے عوام نے عزت اور فتح عظیم کے ساتھ انجام کو پہنچائی، تو ہم چاہتے ہیں کہ اصل کتابیں پڑھیں، اس قسم کی کتابیں جو زیادہ نہیں تو قرنوں تو زندہ رہیں۔ تم تو جانتے ہو کہ بعض مصنفین کیا کرتے ہیں: وہ پلاٹ کو ذہن میں ٹھیک طرح مرتب ہونے کی مہلت نہیں دیتے، اس پر اپنی راتوں کی نیندیں حرام نہیں کرتے، اور آپ کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ ان کی کتاب شائع ہو جاتی ہے، اور اس سے بھی بدتر یہ کہ سال میں دو کتابیں، جن میں سے ہر ایک کا عرصہ حیات ایک دن سے زیادہ نہیں ہوتا۔ آج پڑھی اور کل آپ اس کے خاص خاص کرداروں، کسی کپتان یا شاید لفٹنٹ اور لڑکی، کا نام تک، اور سارا قصہ کیا تھا یہ بھی بھول جائیں گے۔ اس میں لوگ حقیقی نہیں ہوتے، غیرمادی مٹیالے مٹیالے سے سائے ہوتے ہیں، تو پھر بھلا کسی سے کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ انہیں یاد رکھ سکے؟ اور اگر اس میں مصنف کی خام زبان اور ناول کے دوسرے جھول بھی شامل کر لئے جائیں تو پھر یاد رکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب ضائع ہوتا ہے۔ چھاپنےوالوں کی اور شائع کرنےوالے عملے کی محنت، کاغذ اور روپیہ اور اسی طرح پڑھنےوالے کا وقت بھی۔

''پچھلے دنوں مجھے کسی مصنف کا خط اور ایک موٹی سی کتاب ملی جو کسی علاقائی اشاعت گھر نے شائع کی ہے۔ اپنے خط

میں مصنف نے شکایت کی تھی کہ مصنفین کی انجمن نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی کیونکہ اس نے استالن انعام کے لئے اسکی کتاب نامزد نہیں کی تھی حالانکہ، بقول اس کے، یہ اس لائق تھی کہ نامزد کی جاتی۔ میری نگاہ کمزور ہے مگر پھر بھی میں نے یہ موٹی سی کتاب شروع سے آخر تک پڑھی۔ کتاب تو میں نے پڑھ لی مگر مصنف کو کوئی جواب نہیں دیا۔،، میخائل ایوانووچ نے اشارے سے مایوسی کا اظہار کیا اور مسکرانے لگے۔ ''میں جانتا ہوں یہ میری بےمہری تھی، لیکن بھلا میں کیا کرتا؟ کتاب اس لائق بھی نہ تھی کہ شائع کی جاتی، استالن انعام کا تو ذکر ہی کیا۔ ایسے مصنف کو میں کیا جواب دیتا جس میں صلاحیت نام کو نہیں اور تکبر ڈھیروں! میرا خیال ہے وہ میری بات کا بھی یقین نہ کرتا۔ لیکن میں نے ایک پرانے ذہین ادیب کو جواب دینے میں ذرا پس و پیش نہیں کیا جس نے تھوڑے ہی دن ہوئے اپنی نئی کتاب مجھے بھیجی تھی۔ میں نے جواب دیا تھا کہ یہ کتاب خراب ہے اور دلچسپ نہیں ہے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ کتاب خراب ہے!،،

میخائل ایوانووچ خاموش ہوگئے اور انگلیوں سے میز کو بجاتے ہوئے اپنے ہی کسی خیال پر مسکرانے لگے۔

انہوں نے سلسلۂ کلام جاری کیا: ''کوئی پچاس برس ہوئے جب میں طفلس کے ایک قیدخانے میں تھا تو ایک مشہور مصنف کی کتاب ہاتھ لگ گئی۔ کوٹھری میں میں تنہا تھا اور صرف یہی کتاب میرے پاس تھی۔ میں نے اسے پڑھا اور بےشمار مرتبہ بار بار پڑھا۔ وہ تو مجھے ساری عمر یاد رہنی چاہئے تھی، یا نہیں؟ لیکن جیسے ہی میں رہا ہوا، اس کو قطعی بھول گیا اور تب سے اب تک کبھی جی نہ چاہا کہ اس کو اٹھاکر پھر پڑھ لوں۔ وجہ یہ کہ وہ حقیقی ادب نہیں تھا... جب تالستائی یا چیخوف ہو تو ایک مرتبہ پڑھنے سے ہی ہمیشہ کے لئے یاد ہو جاتا ہے، ذہن کے پردے پر اس کا نقش قائم رہتا ہے۔ اور جب اس کو دوبارہ پڑھنا شروع کرتے ہیں تو وہ اتنی اچھی طرح یاد ہوتا ہے جیسے چالیس سال پہلے نہیں بلکہ کل ہی پڑھا ہو... حقیقت تو یہ ہے کہ ''لافانی،، مصنفوں کی بھی ایسی کتابیں ہوتی ہیں جو اگرچہ ہیئت کے اعتبار سے مکمل ہوتی ہیں مگر اس قدر بےاعتنائی کے ساتھ لکھی گئی ہوتی ہیں کہ ان

سے روح سرد ہوکر رہ جاتی ہے، جیسے سنگ مرمر کی ٹھنڈی سل پر ہاتھ رکھ دیا ہو...‘‘

میخائل ایوانووچ نے اپنا چھوٹا سا دبلا پتلا ہاتھ میز پر رکھ دیا اور اپنے خیال کی وضاحت کچھ اس طرح ہاتھ کے اشارے سے کی جو اتنا واضح اور اتنا دلنشین تھا کہ جو لوگ وہاں موجود تھے ان سب کو بے جان سنگ مرمر کے یخ بستہ تنفس کا سا احساس ہوا۔

’’اچھی کتاب میں اسے کہتا ہوں جسکی جلد کے اندر زندگی کی گویا نبض چل رہی ہو، جیسے آپ کی رگوں میں خون چلتا رہتا ہے، اور جسے آپ اگر ہمیشہ نہیں تو عرصہ دراز تک یاد رکھیں اور آپ کی خواہش ہو کہ کبھی پھر بیٹھ کر پڑھیں۔ تم کو چیخوف کا افسانہ ’’میدان‘‘ یاد ہے؟‘‘ میخائل ایوانووچ نے پوچھا اور پھر بڑے جوش و خروش کے ساتھ چیخوف، تالستائی اور گورکی کے متعلق باتیں شروع کردیں۔

بعد میں انہوں نے ڈان کے اجتماعی کاشتکاروں کی زندگی سے گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے سوالات پوچھے اور خانہ جنگی کے محاذوں پر اپنے دورے کی پرانی یادوں میں کھوتے ہوئے کہا:

’’وہاں لوگ بہت ہی اچھے ہیں، جیسے کہ ملک میں اور ہر جگہ میں۔ ہمارے ہاں جیسے لوگ ہیں ان کو ساتھ لیکر جنگ حفاظت سے لڑی جا سکتی ہے یا تعمیر شروع کی جا سکتی ہے۔ مجھے تمہارے ڈان کے علاقے کی عورتیں خاص طور سے پسند آئیں، وہ جفاکش ہوتی ہیں اور ان کی اپنی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ مجھ سے جب باتیں ہوئیں تو وہ شکایتی لہجے میں بڑبڑانی بھنبھنائی نہیں کہ کپڑا نہیں ہے، صابن نہیں ہے، اور صرف کبھی کبھار ہی، جب قلت بہت وہ واقعی بے حد پریشان ہوتیں تو مجھے یاد ہے کہ بس کوسنے دینے لگتیں... دراصل کوسنے وہ بھی بغیر کے دیتی ہیں...‘‘ دبی دبی ہنسی ہنستے ہوئے اور کسان کی معنے خیز چالاکی سے اپنی آنکھیں چندھیاتے ہوئے انہوں نے کہا: ’’خیر، میرا خیال ہے کہ کوسنوں سے اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کرلینا بڑبڑانے، بھنبھنانے سے زیادہ اچھا ہوتا ہے، ہے نا؟‘‘

ہمارے عوام کی ناقابل تسخیر قوت حیات کا ذکر کرتے ہوئے میخائل ایوانووچ نے مجھ سے یہ کہا:

’’ایک مرتبہ جب میں منہ بیس کی دہانی میں تمہارے ہی علاقے میں تھا تو راستے میں ایک باغ پڑا جہاں شہد کی مکھیاں پالی جاتی تھیں۔ خانہ جنگی ابھی حال ہی میں ختم ہوئی تھی۔ شہد کی مکھیاں پالنے کے اس مرکز کو برباد کر ڈالا گیا تھا کیونکہ وائٹوں اور خود ہمارے لوگوں دونوں کو مٹھاس بہت پسند ہوگی... شہد کی مکھیاں پالنے والا ہنس مکھ بوڑھا مجھ سے ملنے باہر آیا۔ ’کیا حال ہے؟‘ میں نے اس سے پوچھا اور اس نے جواب دیا: ’بہت اچھا ہے، میخائل ایوانووچ!‘ میں نے پوچھا ’بہت اچھے کی کیا بات ہے جنگ نے تم کو کیا تباہ و برباد کرکے نہیں رکھ دیا؟‘ اور اس نے جواب دیا: ’برباد تو کیا مگر بالکل نہیں۔ شہد کی مکھیوں کے چالیس چھتوں میں سے ایک باقی بچ رہا ہے اور اس پر خدا کا شکر ہے۔ اس چھتے میں شہد کی مکھیوں کا کنبہ خاصا طاقتور ہے اور میں اپنے عزیز مہمان کو کچھ شہد ابھی پیش کرسکتا ہوں! تین سال بعد آئیے پھر آپ اس باغ کو پہچان بھی نہ پائیں گے!‘‘‘

رخصت ہوتے وقت میخائل ایوانووچ نے مجھ سے پوچھا کہ میرے خیال میں میرے ناول کا پہلا حصہ کب مکمل ہوجائیگا اور میں نے انہیں اندازاً تاریخ بتا دی۔

’’تو پھر اسے پڑھنے تک میں زندہ رہوں گا‘‘ انہوں نے کہا۔ ’’لیکن تم عجلت سے کام نہ لینا اور ہم پڑھنے والے جو کہتے ہیں اس پر حد سے زیادہ دھیان نہ دینا۔ ہمارا کام تو یہ ہے کہ مصنف کو اکسائیں تاکہ اس کی کتاب جلدی سے نکل آئے اور تمہارا کام یہ ہے کہ ایسی کتاب تیار ہو جو ان لوگوں کی توجہ کے قابل ہو جن کے لئے تم لکھ رہے ہو۔ بہرحال کتاب کے لئے جوابدہ تم ہوگے پڑھنے والا نہیں۔ یہ کبھی ہرگز نہ بھولنا!‘‘

آج سوگواری کی تلخی اور دکھ اپنے دل میں تازہ تازہ لئے میرے دماغ میں کالینن کی وہ آخری گفتگو صاف طور سے گونج رہی ہے۔ شہد کی مکھیاں پالنے والے بڑے میاں سے ان کی ملاقات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا: ہمارا ملک شہد کی مکھیوں کے ایک بہت بڑے چھتے کی طرح ہے پرمسرت، پرامن سرگرمیوں کی گہما گہمی کا گہوارہ، جہاں جنگ کی تباہ کی ہوئی معیشت کو بحال کرنے میں سب مصروف ہیں... برسوں گذر جائیں گے اور ہماری اولاد در اولاد جب لال چوک میں آیا کرے گی اور ہمارے عہد کی عظیم ترین ہستی کے مقبرے

کے سامنے عزت سے سر جھکائیگی تو میخائل ایوانووچ کالینن کی قبر کے سامنے بھی جنہوں نے اپنی پوری زندگی اپنے وطن کی خدمت کے لئے وقف کررکھی تھی اور جو کرۂارض پر لوگوں کی مسرت کے لئے لینن کی جدوجہد میں ان کے باوفا ساتھی تھے، محبت اور احسان مندی کے جذبے کے ساتھ ایک لمحے کے لئے رک جایا کرے گی۔

۱۹۴۶ء

ادبی زندگی کے پچیس سال

(اس تقریب میں منعقدہ جلسے میں تقریر)

سوویت ادب میں دو رجحان ہیں۔ بعض مصنف روز کے واقعات کا بڑی سرعت سے ردعمل ظاہر کر دیتے ہیں، جبکہ کچھ اور ایسے ہیں جو اپنی کتابوں پر نسبتاً زیادہ وقت صرف کرتے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ دیرپا قدروقیمت کی تخلیقات پیش کریں۔

حب الوطنی کی جنگ عظیم کے دوران ہم سب نے واقعات کے ردعمل کا بڑی سرعت سے اظہار کیا۔ زندگی کا ہم سے یہی مطالبہ تھا۔ میں بھی ان دنوں بہت جلدی لکھا کرتا تھا۔ پھر بھی میں قارئین کی توقع سے زیادہ سست رفتاری سے لکھنے کا اپنا حق محفوظ رکھنا چاہوں گا، اس یقین کے ساتھ کہ خوبی میں اضافہ سست رفتاری کی کمی کو پورا کردیگا۔

یہ حقیقت کہ میری کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوتے ہیں ثابت کرتی ہے کہ اہم سماجی عوامل کی عکاسی ''سست رفتار،، کام میں بھی ہو سکتی ہے۔

جلدی جلدی لکھ کر خراب کتابیں پیش ہو سکتی ہیں اور سست رفتاری سے لکھ کر — اچھی۔

سوویت ادب کے بتدریج بڑھتے ہوئے اثر اور مقبولیت کا اندازہ اس ایک مثال سے ہی لگایا جاسکتا ہے: حال ہی میں پولینڈ کے شہر وروکلو میں تہذیبی کارکنوں کی عالمی امن کانگرس منعقد ہوئی تھی۔ اس کے ایک ڈیلی گیٹ نے جو جزائر اینٹی لیس سے آئے تھے مجھ سے کہا کہ ایک مرتبہ ان کے پاس جو آخری دو پاؤنڈ بچے تھے وہ خرچ کرکے انہوں نے میری کتاب ''اور ڈان بہتا رہا...،، کا ترجمہ خرید لیا تھا۔

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا سوویت ادب کرۂارض کے دور دراز ترین گوشوں میں پہنچ گیا ہے۔

بہرحال صرف سوویت یونین ہی تو ایک ایسا ملک ہے جہاں ہم ادیبوں کو تخلیقی کام کے لئے تمام ضروری سہولتیں فراہم ہیں۔ اور اس لئے ہم کو بس اچھا ہی لکھنا چاہئے۔

میں نے ساری عمر سوویت عوام کی خدمت انجام دی ہے اور میں عوام کی خدمت ہمیشہ دل وجان سے کرتا رہوں گا۔

ستمبر ۱۹۴۸ء

ایک نشری تقریر

سوویت مصنفین کو اپنے قارئین کا ایک قرض چکانا ہے۔ مجھے بڑا افسوس ہے اور دل ہی دل میں گھبرایا ہوا ہوں کہ میں بھی دو نامکمل ناولوں کا مصنف — مقروضوں میں سے ہوں، مگر نادہندوں میں نہیں، کسی طرح بھی نہیں۔

ہمارے پاس جو فنکارانہ ذرائع ہیں ان سے ہم زندگی کے ہمقدم نہیں چل پا رہے۔ ہمارا واحد حیلہ اور باعث اطمینان صرف ایک یہ امر ہے کہ کمیونزم کی جانب اپنی پیش رفت میں ہمارے ملک نے وہ حیرت انگیز رفتار پکڑلی ہے اور دیوزادوں جیسے ایسے ڈگ بھر رہا ہے کہ ہم ادیب اپنے پرکوفت اور پرتکلف کام میں پیچھے ہی رہ جاتے ہیں اور کچھ نہیں کرپاتے۔

جس قدر ممکن ہو سکتا ہے ہم جلدی کررہے ہیں، لیکن یہ ہم نہیں کرسکتے کہ حد آخر تک پہنچتے پہنچتے بےدم ہوکر گرپڑیں۔

چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ ادیب ابھی مارچ میں درخت کی بےبرگ ٹہنیوں اور موسم بہار کے لئے بیتاؤ آنے کی کیفیت بیان کرنے میں سر کھپا رہا ہوتا ہے کہ اس وقت تک درخت میں پہلی چچہاتی ہوئی ننھی ننھی پتیاں نکل آئیں گی۔ اس منظر پر حیران اور خود اپنی سست رفتاری پر پریشان ادیب بعجلت کوشش شروع کرتا ہے کہ ان پتیوں کی پربہار کیفیت بیان کرے اور ابھی وہ اپنا بیان ختم بھی نہیں کرپائیگا کہ درخت موسم بہار کے اپنے پھول جھاڑ چکا ہوگا اور ان کی جگہ پھل آنے بھی شروع ہو گئے ہوں گے...

ظاہر ہے کہ یہ حال ہم میں سے ان کا ہوتا ہے جو بڑے بڑے ناول لکھتے ہیں، افسانے نہیں جن میں قدرتی طور پر کم محنت لگتی ہے اور وقت بھی اتنا کم کہ کوئی مقابلہ نہیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں آج کل ''جب زمین جاگی،، کی دوسری اور آخری جلد اور ''وطن کے مجاہد،، کے پہلے حصے پر بیک‌وقت کام کر رہا ہوں۔

آپ کی اجازت سے میں مدت کا کوئی وعدہ نہیں کرونگا۔ مجھے اپنے تلخ تجربے سے بخوبی علم ہے کہ اپنے لئے کوئی حدِ آخر مقرر نہیں کی جاسکتی، بشرطیکہ احساس ذمہ‌داری کہ کیا اور کیسے لکھ رہے ہیں، دغا نہیں دے جاتا۔

ناول لکھنے کے کام کو تعمیر سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ لیکن جہاں تعمیر میں ہر معمار کے کام اور فرائض کی ٹھیک ٹھیک وضاحت کردی جاتی ہے وہاں ادیب کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ اسے صرف خود اپنے اوپر ہی بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ وہی سامانِ تعمیر فراہم کرنےوالا ہوتا ہے، وہی میر تعمیر بھی، راج مزدور اور انجینئر بھی۔ اور بدقسمتی سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تعمیر کے دوران میں کسی نہ کسی وجہ سے میرِ تعمیر کو منصوبے تبدیل کرنے پڑجاتے ہیں اور راج مزدور جو کچھ بنا چکتا ہے اس کو ڈھانا پڑتا ہے۔ تو پھر ایسے کام میں کوئی حدآخر کیسے مقرر کر سکتا ہے؟

ممکن ہے میں غلطی کر رہا ہوں، مگر جب کبھی میں مصنف کی اس محنت کے بارے میں غور کرتا ہوں جو کسی طرح بھی سہل نہیں ہے تو سوچتا ہوں: ''تعمیر،، میں تاخیر ہونے دو بشرطیکہ جو ''عمارت،، تمہارے ذہن اور تمہارے ہاتھوں سے تخلیق ہو قابل اعتماد، ٹھوس اور دیرپا ہو۔

اور اگر ہمارا ذہین قاری تمہاری کتاب پڑھنے کے بعد دوسرے ہی دن اس کو فراموش نہیں کردیتا (ایسا بھی ہوتا ہے کہ فراموش کردے)، اگر بعد میں پھر کبھی اس کتاب کو دوبارہ پڑھنے کو اس کا جی چاہے اور اس کے بارے میں کچھ مزید غور و فکر کے بعد اگر وہ مصنف کے بارے میں کہتا ہے: ''واللہ اس شخص نے تو خوب کام کیا ہے، اچھی کتاب ہے!،، — تو یہ مصنف کے لئے باعث اطمینان ہوگا اور اعلیٰ‌ترین اخلاقی صلہ، کیونکہ اس کے لئے قاری کا فیصلہ افضل ترین اہمیت رکھتا ہے۔

جب ہمارے دور اور نزدیک کے قارئین سوویت ادب اور اس کے ارتقا، پر غور و خوض کریں تو انہیں یہ ہرگز فراموش نہ کرنا چاہئے کہ سوویت مصنفین کے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے: اپنے عظیم عوام اور اپنی عظیم پارٹی کے مفادات کی خدمت کرنا۔

۱۹۵۲ء

یوکرینی عوام، خوش رہو!

قدیم کیئف، اس کی یادگاروں، باغات و چمن، اس کی حسین عمارتوں، خوبصورت سڑکوں کے حسن اور شان و شوکت نے مجھ پر جادو سا کر دیا ہے۔ شہر کی شاہراہ کرشچاتیک جہاں موٹرکاروں اور لوگوں کی آمد و رفت کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رہتا ہے، بےحد حسین ہے۔ نووارد کے دیدۂ حیرت کو دو کیئف نظر آتے ہیں — سلاوی قوموں کا گہوارہ قدیم کیئف اور نیا سوویت شہر، جدید کیئف جو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے شان اعجازی کے ساتھ پھیلتا چلا جا رہا ہے۔

اس شہر کے عشق میں مبتلا ہوئے بغیر کیسے رہا جا سکتا ہے جس کی رعنائی دل کی انتہائی گہرائیوں تک ہیجان پیدا کر دیتی ہے!

دریائے دنیپر پہنچنےوالی ڈھلانوں، دریا کے گھاٹ اور پرلے کنارے دور بہت دور حد نظر پر جنگل کے تاریک سے خدوخال کے حسن کے بھلا کیا کہنے! زورآور دریائے دنیپر مجھے اتنا ہی عزیز ہے جتنا میرا اپنا پرسکون دریائے ڈان۔

خداداد صلاحیتوں کے مالک اور عظیم جفاکش یوکرینی عوام سے، جو تمام سوویت برادر قوموں کے دوستدار کنبے میں اپنے مقدر کی تشکیل کررہے ہیں اور کرۂ‌زمین پر زندگی، امن اور مسرت کی خاطر کام کر رہے ہیں، میرا پیار اب اور بھی زیادہ گہرا ہوگیا ہے۔

یوکرینی لوگ شفیق اور گرمجوش ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ توانا اور جری بھی۔ یوکرین سے میرا لگاؤ اس وجہ سے اور بھی زیادہ مستحکم ہے کیونکہ میری ماں یوکرینی تھیں، چرنی گوف علاقے کی کسان۔

یوکرینی ادب نے جو اپنی وضع کا نرالا اور متنوع ادب ہے، بڑی بڑی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں اور صرف ہمارے ملک میں ہی نہیں بلکہ اس کی سرحدوں سے باہر بھی دور دور تک شہرت اور

ناموری حاصل کرلی ہے۔ یوکرینی مصنفین کی تیسری کانگرس جس میں ایک مہمان کی حیثیت سے میں شرکت کر رہا ہوں اس کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے۔

کیئف میں جن یوکرینی ادیبوں سے میری ملاقات ہوئی ان سے میں بہت ہی متاثر ہوا۔ خاص طور سے نسبتاً نوجوانوں میں بہت سے ہونہار ادیب خداداد صلاحیتوں اور اپنے انوکھے انداز بیان کے مالک ہیں۔ میں بہت سے مصنفین کے نام گنوا سکتا ہوں: اولیس گونچار جو واقعی اچھے ناول نگار ہیں، وادم سوبکو، خداداد صلاحیت رکھنے والے ڈرامہ‌نویس واسیلی منکو، جواں‌سال شاعر دمیتری پاولچکو اور پرزور مزاح‌نگار اوستاپ وشنیا۔

جہاں تک یوکرینی ادبی تنقید کا تعلق ہے، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس میں کوتاہیاں ہیں۔ یوکرینی نقاد انہیں خامیوں میں مبتلا ہیں جن میں ان کے روسی رفقائے کار۔ مجھے اس کا جو سبب نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے نقاد سطحی تبصرہ‌نگاروں کا رویہ اپنا لیتے ہیں اور بس اس سے آگے نہیں جاتے۔

ہونہار نقادوں کا باریک‌بینی کے ساتھ انتخاب کرکے ان کو تربیت دینی چاہئے اور ان کے کام کے لئے تمام لوازمات فراہم ہونے چاہئیں۔ مثلاً سب جانتے ہیں کہ تعمیرات کی ہر سوویت تنظیم کو مختلف کاموں سے متعلق تمام سہولتیں فراہم ہوتی ہیں۔ تو کیوں نہ سوویت ادبی نقادوں کے لئے ایسے حالات فراہم کئے جائیں کہ وہ حقیقی معنوں میں کارآمد، سنجیدہ کام انجام دے سکیں؟ میرا خیال ہے کہ یہ مسئلہ عرصہ دراز سے معرض التوا میں پڑا ہوا ہے اور اس کو حل کرنے میں اب زیادہ دیر نہ کرنی چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ ڈرامہ نگاروں کو جو معاوضہ دیا جاتا ہے اس کو گھٹا دیں اور اس طرح جو رقم بچے اس سے نقادوں کے لئے بڑی رقم اکٹھی کی جائے۔

روسی میں اور سوویت یونین کی قوموں کی دوسری زبانوں میں یوکرینی ادب کے ترجموں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ جو ترجمے ہمیں مہیا ہوتے ہیں ان میں سے یوکرینی گفتگو کی نغمگی غائب ہوچکی ہوتی ہے۔

آپ سب کی طرح مجھے یقین ہے کہ عنقریب یوکرینی مصنفین ہمارے ملک اور کل ترقی‌پسند نوع انسانی کو بہت سی شاندار تصنیفات پیش کرینگے۔

مجھے بڑا افسوس ہے کہ اس سفر میں دوسرے یوکرینی شہروں اور گاؤں کے دورے پر میں نہ جا سکا اور محض کیئف اور مضافات کی سیر کی۔ لیکن کیئف بہرحال، یوکرین کا محور ہے اور اس میں آئینے کی طرح یوکرینی عوام کی خوش‌حال زندگی اور تہذیب و تمدن اور اس شاندار سفر کا عکس نظر آتا ہے جو اکتوبر انقلاب عظیم کی فتح کے بعد سینتیس برس میں انہوں نے طے کیا ہے۔

یوکرین کو میرا سلام‌احترام۔ یوکرینی عوام خوش رہو۔

۱۹۵۴ء

رسالہ ''انوسترانایا لتیراتورا'' کے ایڈیٹر کے نام ایک خط

پیارے ساتھی ایڈیٹر!

میں نے ابھی ابھی آپ کے رسالے کا پہلا شمارہ پڑھا اور میرا خیال ہے کہ اس نے اپنے پیش نظر جو مقاصد رکھے ہیں وہ کارآمد ہیں۔ اس رسالے کے ذمے یہ فرض عائد ہوا ہے کہ وہ سوویت قارئین کو دوسری قوموں کے ادیبوں کے متعلق بہتر معلومات بہم پہنچائے اور ان کو سمجھنے میں مدد دے۔

اس سلسلے میں میں بعض مسئلے اٹھانا چاہتا ہوں جو مجھے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔

میرے ذہن میں ہمارے بین‌الاقوامی تہذیبی تعلقات اور سوویت اور غیرملکی ادیبوں کے درمیان تجربے کا وسیع تبادلہ ہے۔

ہر قوم کی، چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی، خود اپنی تہذیبی قدریں ہوتی ہیں۔ انسان کی عظیم روحانی دولت ان قدروں پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔

ہماری قوم نے عالمی تہذیب کے خزانے میں اپنا خاصا بڑا حصہ جمع کیا ہے۔ ہماری قوم اپنی اس خواہش میں فیاض اور بے لوث رہی ہے کہ اپنی قومی تہذیب کو بحیثیت مجموعی کل نوع انسانی کی دسترس میں پہنچا دے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم نے دوسری قوموں کے تہذیبی کارناموں کی بڑی قدر کی ہے۔ اس کا قائل کن ثبوت ہمارے تہذیبی کارکنوں کے غیرممالک کے متعدد اور بارہا دوروں سے ملتا ہے اور

اس خیرمقدم سے جو ہم اپنے غیرملکی مہمانوں کا ہمیشہ کیا کرتے ہیں۔

میں اعدادوشمار کے حوالہ دینا نہیں چاہتا کیونکہ ان کا سب کو بخوبی علم ہے۔ میں قارئین کو صرف اتنا ہی یاد دلانے کی اجازت چاہتا ہوں کہ صرف پچھلے سال، یعنی ۱۹۵۴ء ہی میں ہم نے دس ہزار کے قریب غیرملکی مہمانوں کی آؤبھگت کی۔

دوسری قوموں کے کلچر کے احترام کا بین ثبوت اس حقیقت سے بھی ملیگا کہ غیرملکی مصنفوں کی جو صرف کلاسکی ادب کے خالقوں تک ہی محدود نہیں ہیں، کتابیں سوویت یونین میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

سوویت عوام اپنے غیرملکی تہذیبی تعلقات کو وسیع ترین پیمانے پر نشوونما دینا چاہتے تھے۔ اس خواہش کے پیش نظر ہی سوویت یونین کی اعلی سوویت نے اپنے دوسرے اجلاس میں امسال ۹ فروری کو اپنا وہ مشہور اعلان منظور کیا جس میں بین الاقوامی صورت حال کو معمول پر لانےوالے ایک اہم عنصر کی حیثیت سے بین الاقوامی تعلقات کو تقویت پہنچانے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

میں بھی اعلی سوویت کے میمبروں میں تھا اور میں نے بخوشی اس اعلان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔

اب جبکہ جنیوا کانفرنس* ایک تاریخی حقیقت بن چکی ہے تو یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں رہ گئی کہ وہ کیا چیز تھی جس نے سوویت عوام کو بیرونی ممالک سے تہذیبی تعلقات کو قابل لحاظ توسیع دینے سے باز رکھا۔

نہ ہی یہ کہنے کی چنداں ضرورت ہے کہ ''سرد جنگ،، تہذیبی تعاون سے لگا نہیں کھاتی۔

ایک زمانہ تھا جب ہمارے تہذیبی تعلقات ریاستہائے متحدہ امریکہ جیسے ملک سے بڑھنے اور مضبوط ہونے شروع ہوئے تھے۔ امریکی اور سوویت عوام کے درمیان فوجی تعاون نے جنگ کے بعد ہمارے دوستانہ تعلقات کی توسیع کے تمام لوازمات فراہم کردئے تھے۔

افسوس جو ہوا وہ یہ نہ تھا۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ سے تہذیبی تعلقات کو فروغ دینے کی

---

*چار ریاستوں کی حکومتوں کے سربراہوں کی کانفرنس جو ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔ (ایڈیٹر)

ہماری کوششیں، اگر قطعی نہیں تو، عملاً ضرور ناکام ہو گئیں۔

یہ درست ہے کہ ہرسال سیاحوں یا مہمانوں کی طرح سوویت یونین آنے والے ہزاروں لوگوں میں امریکی کچھ کم نہیں ہوتے تھے۔ لیکن ابھی تھوڑے ہی دنوں تک جواباً تواضع کی پیش کش نہیں کی جاتی تھی۔

لیکن میں پھر عرض کرتا ہوں کہ آج میں مستقبل کی بات کرنا چاہتا ہوں ماضی کی نہیں۔

میرا یقین محکم ہے کہ اگر ''جذبۂ جنیوا،، بین الاقوامی معاملات کے تمام شعبوں میں کارفرما ہو جائے تو تہذیبی تعلقات کو فروغ دینے کے اچھے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔

دنیا کے مصنفین کی اپنی گول میز کانفرنس ہونی چاہئے۔ ہمارے نظریات چاہے مختلف ہوں لیکن عوام کے لئے کارآمد ہونے کی خواہش ہمکو متحد کرےگی۔

سوویت ادیبوں کی بات یہ ہے کہ ہماری پرخلوص خواہش دنیا کے تمام ادیبوں سے اپنے دوستانہ تعلقات اتنے ہی قریبی اور پرزور کرنے کی ہے جتنے مغرب اور مشرق کے بہت سے ملکوں کے مصنفوں سے سال بسال بڑھتے ہوئے تعلقات ہیں۔

مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوگی کہ میرے امریکی، انگریزی، مغربی جرمن اور جاپانی رفقائے کار کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے۔

ان ادیبوں کا ذکر میں سب سے پہلے تو اس لئے کررہا ہوں کہ ان کے ہی ملکوں سے ہمارے جنگ کے بعد کے تہذیبی تعلقات کے سلسلے میں بہت کچھ کرنا باقی رہ گیا ہے۔

یہ تھی وہ پہلی بات جو میں اپنے اس خط میں کہنی چاہتا تھا۔

دوسری بات بعض ان مشوروں کے متعلق ہے جو آپ کے اس نئے رسالے کی آئندہ سرگرمیوں کے متعلق پیش کرنے کی میں اجازت چاہتا ہوں۔

میں جو سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ کا رسالہ وہ سب کچھ شائع کیا کرےگا جس پر سچی صلاحیت کی چھاپ ہوگی، وہ سب کچھ جس سے لوگوں کو ایسی زندگی بسر کرنے میں مدد ملے جو انسان کے شایان شان ہو۔

مجھے یقین ہے کہ میری طرح دوسروں کو بھی اس بات سے خوشی ہوگی کہ آپ کا رسالہ ایک ایسا منبر بن جائے جہاں سے وہ لوگ جنہیں جدید ادب کے مفادات دل سے عزیز ہوں، ایک دوسرے سے ہم کلام ہو سکیں۔ اگر آپ کا رسالہ سوویت قارئین (نیز مصنفین) اور

ان ناولوں اور افسانوں کے مصنفین کے درمیان جن کی تخلیقات آپ شائع کرتے ہوں، خط و کتابت کا انتظام کردے تو ہم ممنون احسان ہوں گے۔

عین ممکن ہے کہ ان تخلیقات کا مطالعہ کرنے اور ان سے مختلف قوموں کی داخلی دنیا، جدوجہد اور امیدوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد سوویت قارئین کے ذہن میں ایسی باتیں آئیں جو بیرونی ادیبوں کے لئے باعث دلچسپی ہوں۔ دنیا کا کوئی بھی ادیب اپنے قارئین کی رائے سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ مجھے یاد ہے کہ "اور ڈان بہتا رہا..." کے متعلق غیرملکی قارئین کی، جن میں امریکی بھی شامل ہوتے تھے، رائے پوری پڑھ لینے کے لئے میں کتنا بیچین رہا کرتا تھا۔ رائیں متضاد ہوا کرتی تھیں۔ ان کی سب ہی باتیں ایسی نہیں ہوتی تھیں جنھیں میں تسلیم کرلیا کرتا۔ لیکن پھربھی وہ بڑی کارآمد ہوتی تھیں۔

مجھے یقین ہے کہ جس قسم کی خط و کتابت کا میں نے مشورہ دیا ان سے ہماری تہذیبیں مالامال ہو جائیں گی اور ان میں باہمی مفاہمت کو بڑھاوا ملیگا۔

یہ خط میں اس احساس کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ اگر نیک خواہش اور باہمی احترام موجود ہو، تو اب وہ وقت آگیا ہے جبکہ نہایت وسیع پیمانے پر تہذیبی تعلقات بڑھانے کا کام شروع کیا جاسکتا ہے — بشرطیکہ کوششیں باہمی ہوں۔

قدرتاً میں یہ تمام باتیں نہایت عمومی طور پر کر رہا ہوں کیونکہ میری رائے یہ ہے کہ خاص بات اصولی طور پر متفق ہونے کی ہے اور باقی ساری باتیں اپنے آپ طے ہوتی رہینگی۔

اپنے غیرملکی رفقائے کار کی رائے معلوم کرکے مجھے بڑی مسرت ہوگی۔

مجھے پورا پورا یقین ہے کہ ہم ایک مشترک زبان تلاش کر ہی لیں گے۔

۱۹۵۵ء

سوویت کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگرس میں تقریر
(اقتباس)

ڈیلی گیٹ ساتھیو!

جیسا کہ آپ کو ہمارے سیکریٹری کامریڈ سورکوف پہلے ہی مطلع کرچکے ہیں، چھٹے پنجسالہ منصوبے کے لئے سوویت ادب کا

کوئی مقررہ نشانہ نہیں ہے۔ میں اس میں صرف اتنا اضافہ کر سکتا ہوں کہ اگر ہمارا کوئی منصوبہ ہوتا بھی تو وہ کسی صورت سے پورا نہ ہوتا کیونکہ ہمارے کام کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے اور کیونکہ، سچی بات تو یہ ہے کہ ادیب ہمارے ملک میں سب سے زیادہ غیرمنظم لوگ ہیں۔

سوویت انجمن مصنفین کے ۳۲۴۷ ممبر ہیں اور ۵۲۶ امیدوار ممبر یعنی مجموعی طور پر ۳۷۷۳ افراد ایسے ہیں جن کا اوزارقلم ہے اور جن میں کم و بیش ادبی صلاحیت موجود ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں یہ تعداد اچھی خاصی قوت ہے مگر اس تعداد سے آپ کو مرعوب ہونے یا باغ باغ ہو جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بارعب محض معلوم ہوتی ہے، کیونکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ادیبوں کی یہ فہرست بڑی حد تک "مردہ روحوں" پر مشتمل ہے۔

افسوس کہ ہمارے زمانے میں چیچی کوف* کے قبیل کے لوگ موجود نہیں ہیں، ورنہ سورکوف نے تاجرانہ ہوشیاری کے اپنے سارے فقدان کے باوجود صرف ایک ہی بڑے سودے میں سوویت انجمن مصنفین کے لئے وارے نیارے کر دئے ہوتے۔

خود اپنی ہی پارٹی سے براہ‌راست گفتگو کرتے ہوئے مجھے ادب کے متعلق حقیقت بیانی سے کام لینا ہے خواہ وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ میرا پارٹی فرض مجھے مجبور کرتا ہے میں ایسا ہی کروں، اسی طرح ایک ادیب کا میرا ضمیر اور میرا ایمان بھی مجھے مجبور کررہا ہے۔

کامریڈ سورکوف نے، قدرے بےربط انداز میں بتایا ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں سوویت ادب میں کیا کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں، اور صورت حال کی وضاحت کرنے کے لئے کتابوں کی اس بڑھتی ہوئی تعداد کا ذکر کیا ہے جس میں "سوویتسکی پیساتل" نے ۱۹۵۳ء ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۵ء میں کتابیں شائع کی ہیں۔ سیدھی سادی زبان میں اس کو اشک شوئی کہتے ہیں۔

ادب میں ترقی کا پیمانہ یقیناً کتابوں کی وہ تعداد نہیں ہوتی جس میں کتابیں سال بھر میں شائع ہوتی ہیں۔ ان کو کہنا چاہئے

*چیچی کوف — گوگول کے مشہور افسانے "مردہ روحیں" کا مرکزی کردار۔ (ایڈیٹر)

تھا کہ پچھلے بیس برس کے عرصے میں جو اچھی، دانشمندانہ کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے اور جو معمولی درجے کی ہیں وہ ان گنت ہیں۔ ایک ہزار ادیبوں کے قلم سے کوئی دس کتابیں بیس برس کے عرصے میں لکھی گئیں۔ کوئی اچھے کام کا تو مظاہرہ نہیں، کیا خیال ہے آپ کا؟ کامریڈ سورکوف کو یہی کہنا چاہئے تھا، حالانکہ یہ آپ سب کو خود معلوم ہے۔

اگر آج بھی جبکہ سوویت عوام دنیا کے سب سے بڑے پن بجلی گھر تعمیر کررہے ہیں، ہمارے مبلغ ایک ایک سے یہی کہتے پھریں، خواہ کوئی کچھ کہے، ہم نے تو ۱۹۳۲ء میں دنیپر پن بجلی گھر تعمیر کیا تھا، تو یہ حیرت کی بات ہوگی۔

اور ہم ادیبوں نے بالکل یہی کیا ہے: بیس تیس برس ہوئے جو کتابیں لکھی تھیں ان سے اپنے لئے ایک ادبی ''دنیپر پن بجلی گھر،، بند تعمیر کرلیا ہے اور جب بھی کبھی کوئی ہم پر زور ڈالتا ہے تو فوراً اس بند کے پیچھے چھپ جاتے ہیں اور وہیں سے اکڑکر کہتے ہیں: ''کوئی کتابیں نہیں ہیں، چہ معنے؟ ہم لکھتے نہیں، یہ کہنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟ ''کلیم سامگین کی زندگی،، کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اور سیرگیئیف - تسینسکی کے ناول؟ اور سیرافیموویچ کا ''آہنی سیلاب،،؟ اور گلادکوف کا ''سیمنٹ،، اور فادییف کا ''صفایا،،؟ اور لیونوف اور فیدین کے ناول؟ اور فورمانوف کا ''چاپائیف،،؟ اور بانفیروف کا ناول ''بروسکی،،؟،، اور ہم مزید ایک درجن ناولوں کے نام گنوا دیتے ہیں جنہیں قارئین نے پسند کیا اور جو زمانے کی دستبرد سے بچے رہے۔ ہر درد کے درماں اس بند کے سایۂ عاطفت میں ہم اور کتنے عرصے پناہ لیتے رہیں گے؟

سنہ تیس کی دہائیوں کے بعد سے اب تک جو عرصہ گذرا اس میں ہمارے کثیرقومی سوویت ادب کی صفوں میں نثر، نظم اور تمثیل نگاری کے نئے اور حیرت انگیز باکمال فنکار آن کر شامل ہوئے۔ یہ کہنے کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ اپنے وجود کے پورے عرصے میں ہمارے ادب نے متعدد بیش قیمت تخلیقات ضرور پیش کیں جو دنیائے ادب کی بہترین تخلیقات کی صفوں میں شامل ہو گئیں۔ لیکن پوری دیانت کے ساتھ ہمیں یہ ضرور کہنا چاہئے کہ ان کے بہترین ادب میں شمار ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ فنی کمال کی وہ کوئی اچھوتی بلندیوں پر پہنچ گئی ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب نوع انسانی

کی عظیم‌ترین امیدوں کے مرکز یعنی کمیونزم کے فتح باب نصرت کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ یہی ہماری کامیابی کا راز ہے۔ اگر کوئی بھی ادیب آج کے دور میں کمیونزم سے دشمنی کے نظریے سے لکھنے کی کوشش کرے گا تو اس کا نام فوراً ہی حقارت کی گمنامی میں دفن ہوکر رہ جائیگا اور الماریوں میں پڑے پڑے اس کی کتاب کی جلدوں میں پھپھوندی لگ جائیگی، اس کو کوئی اٹھاکر بھی نہ دیکھیگا۔ تو آپ نے دیکھا کہ کامیابی کا سہرا اتنا ان کے سر نہیں جنہوں نے لکھا بلکہ ہماری اپنی کمیونسٹ پارٹی کے سر ہے جو اس کوشش کا سرچشمۂ فیضان ہے۔ اور ہم ادیب، قلبی خلوص کے ساتھ اس پر مسرور و مگن ہیں اور دم واپسیں تک لینن کی پارٹی کے نصب‌العین کی اپنی تحریروں سے خدمت کرنے کو اور زندگی اور ادب دونوں میں اس کے نیک مقاصد کی وفاداری سے علمبرداری کرنے کو تیار ہیں۔

پچھلے چند برسوں سے اگر ہماری نثر میں المناک جمود آیا ہوا ہے تو تمثیل نگاری کی کیفیت بھی کچھ امیدافزا نہیں ہے۔ اچھے ڈرامے بہت ہی کم لکھے گئے ہیں اور کورنئی‌چوک اور چند دوسرے تمثیل نگاروں کی سرفروشانہ کوششیں بھی ہمارے تھیٹروں کو ڈراموں کے قحط سے نہیں بچا سکتیں۔ کورنئی‌چوک جفاکش ہیں، مگر کسی بھی یوکرینی کو یہاں تک کہ خود تاراس بولبا* کو اگر بیس آدمیوں کا کام کرنا پڑتا تو دوہرا ہو جاتا۔

گڑبڑ کیا ہے؟ ہمارا ادب پچھڑ کیوں جاتا ہے؟

سب جانتے ہیں کہ لیو تالستائی روسی کسان کی روح سے اس قدر اچھی طرح واقف تھے کہ ہم زمانہ حال کے مصنفوں میں سے کسی کو اتنی واقفیت نہیں ہے۔ گورکی نے سارے روس کا پاپیادہ سفر کیا ہے۔ لیسکوف نے گھوڑا گاڑی سے اور چیخوف نے، اگرچہ وہ شدید بیماری میں مبتلا تھے، انسان سے محبت اور ادیب کے پیشہ‌ورانہ تجسس کی بنا پر ہمت کرکے ساخالین کا سفر کیا۔ مگر آج کے بہت سے ادیب، خصوصاً وہ جو ماسکو میں رہتے ہیں، ایک طرح کے ساحرانہ مثلث میں مقید ہیں: ماسکو — داچا** — ساحلی صحت گاہ اور پھر اسی ترتیب سے

---

* گوگول کی شہرہ آفاق کہانی ''تاراس بولبا،، کا مرکزی کردار۔ (ایڈیٹر)

** داچا — ماسکو کے مضافات میں بنگلہ۔ (ایڈیٹر)

واپسی: ساحلی صحت گاہ — داچا — ماسکو — کیا ان کو اپنی زندگی
اور اپنا جوہر اس طرح برباد کرنے پر شرم نہیں آتی؟

تقریباً ۱۲۰۰ مصنفین ماسکو میں رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں
یہ قدرتی بات ہے۔ ماسکو راجدھانی ہے، ملک کا سب سے بڑا تہذیبی
اور صنعتی مرکز۔ غیرفطری بات یہ ہے کہ راجدھانی میں رہتے ہوئے
بھی ادیب اپنے آپ کو زندگی سے کسی نہ کسی طرح الگ تھلگ
کرلیتے ہیں۔ اپنی سادہ لوحی کے باعث میرا خیال تھا کہ میرے مصنف
رفقائے کار جو ماسکو میں رہتے ہیں بڑے بڑے صنعتی کارخانوں سے
اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح وابستہ رکھتے ہوں گے، کسی نہ کسی
فیکٹری کی پیداوار میں اور مزدوروں کی ضرورتوں اور منصوبوں سے بھی
عملی دلچسپی لیتے ہوں گے۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں نکلی۔ وہ جنگل
میں تو رہتے ہیں مگر درخت ان کو نہیں دکھائی دیتے۔

کتنے مصنفین ہیں جنہوں نے کسی صنعتی مزدور سے، کسی
انجینئر سے، پیداوار میں کسی جدت پیدا کرنے والے سے یا کسی فیکٹری
کے پارٹی کارکن سے دوستی کی اور اس کے بال بچوں میں گھل مل کر
رہے؟ معدودے چند۔ ورنہ تو ژوربین* کنبے کے افراد کو ماسکو
میں اس سے بہت پہلے تلاش کرلیا گیا ہوتا جبکہ کوچیتوف نے لینن گراد
میں ڈھونڈ نکالا۔ میرے مصنف بھائیوں میں سے ہر ایک اپنے آپ میں
مگن رہتا ہے، غیروں کی طرح، یکا و تنہا بوڑھوں کی طرح۔ مجھے یہ
جان کر افسوس ہوا کہ ماسکو کے بڑے بڑے کارخانوں میں سے
کسی کا کوئی ادیب دوست نہیں ہے — نہ ''سیرپ ی مولوت،، کے
مزدوروں کا، نہ استالن سے موسوم موٹرکار کارخانے کا**، نہ ''دینامو،،
یا ''کراسنی پرولتاری،، کارخانوں کے مزدوروں کا۔ کاش میری بھول
ہو، مگر مجھے اندیشہ ہے کہ یہی بات ''فریزر،، پر، ''تریخگورنایا
منوفکتورا،، ''دالیبر،، بال بیرنگ کارخانے اور ماسکو کے دوسرے
کارخانوں پر بھی صادق آتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ وقتاً فوقتاً مہمانوں کی حیثیت سے یا یوں کہنا
چاہیئے کہ مہمان اداکاروں کی حیثیت سے بڑے بڑے کارخانوں میں

---

*لینن گراد کے مشہور مصنف کوچیتوف کے ناول ''ژوربین کنبے،،
کا حوالہ۔ (ایڈیٹر)

**اب لیخاچیف نامی کارخانہ۔ (ایڈیٹر)

پہنچ جایا کرتے ہیں اور ہمارے لئے بڑی شرم کی بات ہے کہ بعض
عام پیش ہونے کے لئے مزدوروں کے خزانچی سے جاکر اس کا معاوضہ
بھی بےشرمی کے ساتھ وصول کر لیتے ہیں۔ ایسی سرگرمی بالاجرت
کام کب سے ہوگئی؟ بعض ادیب فوجی اکادمیوں میں حاضر ہونے
تک کا معاوضہ لے لیتے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس شرمناک
کیفیت کا خاتمہ کریں۔ وقت آگیا ہے کہ ادب کے تاجروں کو یہ
بات سمجھا دی جائے کہ مصنف اور مغنی میں جو اپنی آواز سے روزی
حاصل کرتا ہے کچھ فرق ہوتا ہے۔ یہ اصولاً ناقابل برداشت ہے
اور اس صورت میں تو اور بھی زیادہ جبکہ کسی کمیونسٹ مصنف کا
ہاتھ کسی فیکٹری یا کسی دوسرے کارخانے سے معاوضہ وصول کرنے
کے لئے پھیلتا ہے۔

تو پھر یہ ۱۲۰۰ مصنف ماسکو میں کیوں رہتے ہیں؟ یہ لوگ
ماسکو سے اتنے کیوں چمٹے رہتے ہیں کہ ٹریکٹر تک ان کو کھینچ
کر الگ نہیں کرسکتے؟ ان سوالوں کا جواب مجھ سے تو بن نہیں
پڑتا۔ شاید آپ خود اس پہیلی کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ میں تو
ایک چیز جانتا ہوں اور وہ یہ کہ تخلیقی قوتوں کی اس قسم کی تقسیم
غلط بھی ہے اور نامناسب بھی۔ افسوس کہ یہی حال لینن گراد، کیف،
مینسک، الماآتا اور تمام بڑے بڑے شہروں کا ہے۔ ہر جگہ مصنفین
شہروں میں رہتے ہیں اور شاید ہی کوئی ایسا ملے جس کا گھر مزدوروں
کی بستی یا کسی گاؤں میں ہو۔

آپ تو کامریڈ نئی کتابوں کی توقع کررہے ہیں مگر میں
پوچھنا چاہتا ہوں کس سے؟ ان مصنفوں سے جو کسی اجتماعی کاشتکار
یا مزدور کو ٹھیک طرح سے نہیں جانتے؟ ان مصنفوں سے جو اپنی
بیٹھوں میں یا اپنے گھونگوں میں دبکے بیٹھے ہیں؟ مگر یہ مقولہ تو
سب کو مدتوں سے معلوم ہے کہ جو کچھ تلاش نہیں کرتا وہ کچھ
نہیں پاتا۔ اگر دنیائے ادب میں صورت حال عنقریب مستقبل میں
بنیادی طور پر تبدیل نہیں ہوتی تو کوئی کام کی، اچھی کتاب شائع
نہیں ہوگی اور یہ تبدیلی صرف پارٹی ہی لا سکتی ہے۔ اس پر میں
بعد میں روشنی ڈالوں گا۔

میں چند الفاظ کامریڈ غفوروف کی تقریر کے یا یوں کہنا چاہیئے
ان کی تقریر کے اس حصے کے جواب میں کہنا چاہونگا جس میں انہوں
نے ادب کا ذکر کیا ہے۔ کامریڈ غفوروف نے بالکل درست کہا ہے

کہ ادب پچھڑ گیا ہے۔ لیکن کامریڈ غفوروف کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اس کی وجہ تخلیقی سرگرمی میں کمی آنا ہے۔ وجہ یہ نہیں ہے۔

ادب کا زندگی سے تھوڑا پچھڑنا لازمی ہوتا ہے کیونکہ سنجیدہ ادب، بقول لیو تالستائی خبرنامہ نہیں ہوتا۔ ایک بڑی تصویر بنانے میں سخت محنت درکار ہوتی ہے اور بہت سارا وقت بھی چاہیئے ہوتا ہے۔

کیا کامریڈ غفوروف کو معلوم ہے کہ الیکسئی تالستائی نے اپنے ناول ''آزمائش،، پر بائیس برس کام کیا تھا اور اپنے ناول ''پیٹر اول،، پر پندرہ برس کام کرتے رہے اور آخر ناتمام چھوڑا؟

ایسی بہت ساری مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں اور ان سب کا، مجھے یقین ہے کہ کامریڈ غفوروف کو علم ہے۔ مگر مجھے یقین ہے انہیں اس دلچسپ یوکرینی کہاوت کا علم نہیں ہے: ''جلدی کا بچہ اندھا پیدا ہوتا ہے،،۔ اس کہاوت کی دانشمندی کی تصدیق متعدد مثالوں سے کی جاسکتی ہے جبکہ عجلت میں لکھی ہوئی کتابیں اندھی یا کانی کیدڑی پیدا ہوئیں اور انہیں قارئین کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔

ہمارے سوویت قارئین سست رفتاری پر تو ہمیں معاف کردیں گے مگر ہماری خراب، بےلطف کتابوں کو ہرگز نہیں بخشیں گے۔

آپ کی طرح، کامریڈ غفوروف، میں بھی بیل گاڑی کی جگہ ہوائی جہاز سے سفر کرنے کو ترجیح دوں گا، یعنی روزمرہ کی زندگی میں۔ لیکن ادب میں، وہ بھاری بھرکم بوجھ لیکر جس کی لوگوں کو بہت ضرورت ہوتی ہے، میں بیل گاڑی سے سفر کرنا پسند کروں گا۔ بہ نسبت اس کے کہ ناخون کاٹنے سنوارنے کی مختلف ریتیوں اور طرح طرح کے چھوٹے چھوٹے برشوں اور سنگھار کے اسی قسم کے سامان کا ہلکا پھلکا سا تھیلا لیکر ہوائی جہاز سے پرواز کروں۔ ابھی جب ہم اسی موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں تو میں یہ بھی کہتا چلوں کہ جب ہم ادبی موضوعات کا ذکر کر رہے ہوں تو بعض اوقات بہتر یہی ہوتا ہے کہ لاابالی تتلی کی طرح اڑتے پھرنے کے بجائے دھیمی چال سے ایک ایک قدم بمشکل اٹھاتے ہوئے آگے بڑھیں۔

پیارے کامریڈ غفوروف، مجھے غلط مت سمجھئیگا اور میری حد سے زیادہ مناظراتی جذباتیت کو معاف کر دیجئیگا۔ مگر میں بھی، آپ ہی کی طرح جنوبی باشندہ ہوں اور میں بھی مخالف کے پیچھے

پیچھے گھسٹنے کا نہیں بلکہ گرماگرم بحث کرنے کا عادی ہوں۔ آپ نے تخلیقی حرارت کا ذکر کیا ہے۔ تو آپ جانتے ہی ہیں یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی تھرمامیٹر سے پیمائش نہیں کی جاسکتی لیکن جب معاملہ بحث کا ہوتا ہے تو آپ کا اور میرا ایک ہی درجۂحرارت ہوجاتا ہے اس کے باوجود کہ آپ ہیں تاجک اور میں روسی۔ آپ قاری ہیں اور میں مصنف اور ہم مظاہرہ کرچکے ہیں کہ آپ کس قدر گرمجوشی سے مجھ سے محبت کرتے ہیں اور کس قدر پرجوش طریقے سے میں آپ کے جذبات کا جواب دیتا ہوں۔ اور آپ پھر بھی کہیں گے کہ ادیب اپنے قارئین کی محبت کا جواب محبت سے دینے میں کوتاہی کرتے ہیں! جی کوتاہی، جبکہ ہمیں بلڈوزر کھینچ کر ایک دوسرے سے علحدہ کریں! تو پھر، میں امید کرتا ہوں کہ اب، کامریڈ غفوروف، ہم برابر سرابر ہو گئے؟ تو پھر ٹھیک ہے۔

پچھلے کچھ عرصے سے کتابیں شائع نہیں ہوئیں، میرا مطلب ہے کہ ایسی کتابیں جو پڑھنےوالے عوام الناس کے دل و دماغ پر چھا جائیں۔ قصور کس کا ہے؟ یقینی بات ہے کہ سب سے پہلے تو خود ادیبوں کا، لیکن تہذیبی مسائل سے متعلق پارٹی تنظیمیں اور قارئین بھی اس کے قصوروار ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ قارئین ایک کنارے تماشائی بنے کھڑے رہیں۔ ادب کی موجودہ صورت حال کے ایک حد تک وہ بھی ذمہ‌دار ہیں، کیونکہ ادب، جیسا کہ سب جانتے ہیں، خود ادیبوں کا ذاتی کاروبار نہیں ہے بلکہ تمام لوگوں کا معاملہ ہے اور سب سے پہلے تو پارٹی کا معاملہ ہے۔

ادبی جدوجہد کے مختلف مرحلوں میں جب نظریاتی غلطیاں کی جارہی تھیں تو پارٹی نے انجمن مصنفین کو بارہا سدھارا اور ہمیں اس کے قوی اور راہبر ہاتھ کا ہمیشہ سہارا رہا ہے جس کے لئے ہمیں پرخلوص اظہار ممنونیت کرنا چاہیئے۔

لیکن جو چیز واقعی میری سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ ہم سب نے اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کر دیا کہ ادیبوں کی خاصی بڑی تعداد عرصہ‌دراز سے زندگی سے الگ تھلگ رہ رہی ہے اور ادب میں اپنا کوئی حصہ ادا نہیں کر رہی! یاد ہے اس وقت کیا ہوا تھا جبکہ ہمارے کچھ اجتماعی فارموں کے صدر اور مشین اور ٹریکٹر اسٹیشنوں کے ڈائریکٹر — ان تیس ہزار میں سے جنہیں پارٹی نے دیہات میں بھیجا تھا — ان شہروں ہی میں جہاں وہ پہلے کام کرتے

تھے اپنے پرانے گھروں میں رہے جانے کی کوشش کی تھی اور کبھی کبھار اجتماعی فارم یا مشین اور ٹریکٹر اسٹیشن میں آکر اپنی صورت دکھا جایا کرتے تھے۔ ملک گیر پیمانے پر پوری ایک تحریک شروع کردی گئی تھی! ''پراودا،، نے اس کے متعلق بار بار لکھا اور تمام اخبارات کو چوکنا کردیا گیا۔ رائے عامہ نے ان لوگوں کی سخت مذمت کی جو ان اداروں سے دور رہنا چاہتے تھے جن کا انہیں انتظام کرنا تھا۔ اور ادھر ہمارے مصنفین ہیں جو برسہا برس سے اپنے ادبی سرچشموں سے دور رہتے ہیں اور انہیں کوئی ایک لفظ تک نہیں کہتا، جیسے یہ بالکل ٹھیک بات ہو، جیسے کہ مجاہدوں کی دوسری صف ایک عارضی مقام نہ ہو بلکہ مستقل جائے رہائش ہو۔

انجمن مصنفین کے سارے کام کو پرعزم طریقے سے دوبارہ منظم کرنا چاہئے۔ کیا آپ پر یہ چیز عیاں نہیں ہے کہ گورکی کی وفات کے بعد سے اب تک ادیبوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو ان کے کندھوں کے برابر بھی پہنچ سکتا ہو؟ ہم میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوا ہے اور نہ غالباً کبھی ہوگا جو اس بے پناہ محبت میں گورکی کی ہمسری کر سکے جو ہمارے ملک کے اندر اور بیرونی ممالک کے مزدور طبقے میں ان کو حاصل تھی، وہ محبت جو ان کو خود اپنی زندگی کی وجہ سے اور اپنی تحریروں کے باعث حاصل ہوئی تھی۔

گورکی کی وفات کے بعد ہم نے کیا کرنے کا فیصلہ کیا تھا؟ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ انجمن مصنفین کی ایک اجتماعی قیادت قائم کی جائے جس کے سربراہ کامریڈ فادیئف ہوں۔ مگر اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس دوران میں یہ ایک تخلیقی انجمن سے جو اس کو دراصل ہونا چاہئے تھا رفتہ رفتہ بدل کر ایک انتظامیہ تنظیم بن گئی اور اس حقیقت کے باوجود کہ سیکریٹریٹ اور نثر، نظم، تمثیل نگاری اور تنقید کے شعبے اپنے جلسے باقاعدہ منظم کرتے رہے، ٹکنیکی عملہ کل وقتی کام انجام دیتا رہا، اور پیغام رساں ادھر سے ادھر دوڑ دھوپ کرتے رہے — کتابیں کوئی بھی نہ نکلیں۔ ہمارے جیسے ملک کے لئے سال بھر میں چند اچھی کتابوں کی اشاعت مایوس کن حد تک قلیل ہے۔

ایسے جملے جو میری سماعت کو قدرے عجیب لگتے ہیں ادیبوں کے زبان زد ہوگئے ہیں مثلاً: ''فلاں فلاں صاحب تخلیقی دورے پر گئے ہیں،،۔ کوئی مصنف ''تخلیقی دورے،، پر کیوں جائے

جبکہ اس کی پوری زندگی ایک تخلیقی سفر ہونی چاہیئے؟ یا اس سے بھی مزیدار یہ کہ: ''انجمن مصنفین کے سیکریٹری کی ایک سال کی تخلیقی رخصت منظور کی گئی ہے۔،، اگر یہ اس بات کا صاف صاف اعتراف نہیں تو کیا ہے کہ ''تخلیقی رخصت،، سے قبل موصوف مصنف نے کچھ لکھا نہیں کیونکہ وہ کسی اور کام میں مصروف تھے! چنانچہ بات سے بات پیدا ہوتی چلی گئی۔ فادیئف خاصے جاہ طلب جنرل سیکریٹری ثابت ہوئے اور اجتماعی قیادت کے اصول کو تسلیم کرنے سے انہوں نے کنی کاٹی۔ دوسرے سیکریٹری ان کے ساتھ مل کر کام نہ کرسکے۔ یہ معاملہ پندرہ برس تک گھسٹتا رہا۔ مشترک کوشش سے ہم نے فادیئف کو اپنی تخلیقی زندگی کے پندرہ بہترین برسوں سے محروم کردیا اور نتیجے میں ہمیں نہ جنرل سیکریٹری ملا اور نہ مصنف۔ کیا ہم وقت رہتے فادیئف کو خبردار کرکے یہ نہ کہہ سکتے تھے: ''تصنیف کے کاروبار میں جاہ طلبی کسی کام کی نہیں۔ انجمن مصنفین فوج کی کوئی ٹکڑی نہیں ہے، اور تادیبی بٹالین تو کسی طرح بھی نہیں ہے اور کامریڈ فادیئف ادیبوں میں سے کوئی بھی آپ کے سامنے آکر اٹینشن کھڑا نہیں ہوگا۔ آپ ذہین اور خداداد صلاحیتوں کے مالک ایک مصنف ہیں، آپ کو صنعتی موضوع سے دلچسپی ہے۔ تو پھر کیوں آپ ماگنی تو گورسک، سویردلوفسک، چیلیابنسک یا زاپوروژیئے میں جا کر تین چار سال نہیں رہتے اور مزدور طبقے کے بارے میں ایک اچھا ناول کیوں نہیں لکھتے؟،،

کیا ہوا جو اس طرح ہم جنرل سیکریٹری فادیئف سے محروم ہوگئے ہوتے، کیونکہ پھر ہمیں ادیب فادیئف تو مل گیا ہوتا اور ہم نے اس کا ایک نئی کتاب کے ساتھ استقبال کیا ہوتا جو ممکن ہے ان کے ناول ''صفایا،، سے برابر ہوتی۔

ان پچھلے پندرہ برسوں میں فادیئف نے کیا کیا؟ کیا انہوں نے نظریاتی اور سیاسی اعتبار سے انجمن مصنفین کی رہبری کی؟ نہیں، ہمارا ہمیشہ عقیدہ رہا ہے اور اس کا معقول جواز موجود ہے کہ ہماری رہبری پارٹی کرتی ہے۔ برسوں تک فادیئف ادبی مباحثوں میں حصہ لینے میں، رپورٹیں پیش کرنے میں، رہائشی مکانات ادیبوں میں تقسیم کرنے میں مصروف رہے اور کبھی ایک لفظ نہیں لکھا۔ ان کے پاس کتابیں تصنیف کرنے جیسی ''مہمل باتوں،، کے لئے وقت ہی نہیں تھا۔ لیکن جب چند برس کے لئے، ١٩٤٤ء کے شروع سے، ان کو

سیکریٹری کے فرائض سے سبکدوشی حاصل ہوگئی تو وہ فوراً ہی کام میں جٹ گئے اور نہایت ہی مختصر عرصے میں ایک بہترین ناول کراسنوڈان کے ''قافلہ شہیدوں کا،، لکھ ڈالا۔ ہم نثرنگاروں میں سے کسی میں نوجوانوں کے متعلق پرجوش انداز میں لکھنے کی وہ خداداد صلاحیت موجود نہیں ہے جو فادیئف میں ہے اور ''قافلہ شہیدوں کا،، میں ان کا یہ جوہر پوری آب و تاب سے کارفرما نظر آتا ہے۔

چند برس گزرے اور ایک بار پھر ادیب فادیئف غائب ہوگئے اور ادب کے منتظم فادیئف پھر نمودار ہو گئے۔ واقعی کبھی کبھی کیسے کیسے تغیرات سے سابقہ پڑا کرتا ہے! اور وہ عجوبۂ روزگار جہاں ایسے تغیرات رونما ہوتے ہیں یہاں سے تھوڑی ہی دور ہے۔ سڑک وروفسکی پر۔

کیا اس انتظامیہ کام کے لئے ہماری پارٹی میں ان سے کچھ کم قابلیت کا آدمی نہیں مل سکتا؟ اور اگر آپ مجھے اس طرح کہنے کی اجازت دیں کہ فادیئف ادیبوں کی ٹولی کے آرٹ ڈائریکٹر ہیں، تو یہ بھی درست نہیں ہے۔ فیدین، گلادکوف، لیونوف یا کوئی اور بڑا ادیب فادیئف کے پاس آکر یہ نہیں پوچھتا ہے کہ ناول کیسے لکھے جائیں۔ ہم میں سے ہر ایک کا اپنا علحدہ انداز بیان ہے، دنیا کا اپنا علحدہ تصور ہے، اپنا طرز ہے اور فنی خوبیوں کے مسائل کے سلسلے میں فادیئف کبھی بھی ہمارے لئے سند نہیں ہو سکتے اور نہ ہی کبھی تھے۔ نثرنگار کبھی بھی فادیئف کے پاس نہیں گئے اسی طرح جس طرح کہ یاکوب کولاس، ریلسکی، تی چینا، تواردوفسکی، تیخونوف، مارشاک، ایساکوفسکی، شیپاچیف اور دوسرے بڑے شعراء میں سے کوئی بھی سورکوف سے اصلاح لینے نہیں آتا۔ سب جانتے ہیں اور سورکوف کو خود بھی بخوبی علم ہے کہ آرکسٹرا میں ڈھول، مجیروں اور اسی طرح کے ضرب لگا کر بجانے جانے والے سازوں کے علاوہ بھی کچھ چیزیں ہوتی ہیں۔ تو سورکوف سے بھلا وہ کیا اصلاح لیں؟ مگر یہ حقیقت ہے کہ کیا شاعر، کیا نثرنگار، کیا نقاد اور کیا تمثیل نگار، سب ہی گورکی کے متلاشی رہتے تھے... اگر فادیئف اور سورکوف جیسے ادبی قائدین کے پاس ان کے رفقائے کار میں سے کوئی بھی اپنے مسائل لیکر نہیں آیا یا کسی کا آنے کا ارادہ نہیں ہے تو سوال کیا جا سکتا ہے، ایسے قائدین کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر، مثلاً شولوخوف یا سیمونوف انجمن

کے سربراہ ہوگئے تو حالات مختلف ہوجائیں گے؟ قطعی نہیں۔ سب کچھ وہ کا ویسی رہیگا۔

نہایت ضروری چیز یہ ہے کہ ادیبوں کو حد سے زیادہ جلسوں، ہر اس چیز کے ہنگاموں اور شوروغوغے سے محفوظ رکھا جائے جو اپنے خاص کام یعنی کتابیں لکھنے سے ان کا دھیان ہٹائے۔ ویسے بھی ہم اس حقیقت کے باعث بہت سی چیزوں سے محروم رہ گئے کہ لیونوف، تیخونوف، فیدین اور انہیں جیسے دوسرے بڑے بڑوں نے اپنا بیش قیمت وقت ہر طرح کی نشستوں پر ضائع کیا جس کے بجائے زندگی کا مطالعہ کرنے اور لکھنے کے لئے ان کے پاس خالی وقت ہونا چاہئے تھا۔ وقت آگیا ہے کہ اس چیز کا خاتمہ کریں۔ قارئین چاہتے ہیں کہ ہم انہیں کتابیں پیش کریں، جلسوں کی تقریریں نہیں۔ انتہائی ضرورت اس بات کی ہے کہ ادیبوں کو زندگی سے براہ راست تعلق میں لایا جائے۔ ان کو زندگی کا پوری طرح سامنا کرنا چاہیئے۔ یہ کرنے کے لئے خاص قراردادیں منظور کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ زیادہ آسان یہ ہوگا کہ انجمن سے یہ کہا جائے کہ وہ انفرادی طور پر ہر ایک سے دریافت کرکے ادیبوں کی خواہش واضح کرے۔ بہرحال یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سب ہی بڑے بڑے شہروں میں رہنا چاہتے ہوں اور تبدیلی کی خاطر باہر جانے کی جرأت ہی نہ کریں۔ کیوں نہ ہم ان مصنفوں کی مدد کریں جو اجتماعی فارم یا ریاستی فارم کے موضوع سے متعلق ناولوں پر سنجیدگی سے کام کرنے کی خاطر اپنی پسند کے کسی دیہی مقام میں رہنے تین چار سال کے لئے جانا چاہتے ہوں؟ ان کے رہنے کو ہم مکان بنا دیں جہاں وہ جی بھر کر بیٹھے لکھتے رہیں۔ یہ کہنے کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ وہ ماسکو، مینسک، کیئف یا جس شہر سے بھی وہ گئے تھے وہاں جب چاہیں آئیں گے لیکن بیشتر وقت وہ اپنے آئندہ ناولوں کے مرکزی کرداروں کے ساتھ گذاریں گے اور یہ کامیابی کی ایک ضمانت ہوگی۔ انجینئروں اور ٹکنیکی ماہروں کے لئے ہم مکان ضرور بناتے ہیں یا نہیں؟ تو کیوں نہ مصنفوں کے لئے بھی ایسا ہی کریں۔ اس کی بات میں اس لئے کر رہا ہوں کہ مصنف کا کام گھریلو دھندے کی طرح کا ہوتا ہے۔ اگر وہ سواد کی تلاش میں باہر گھومتا نہیں پھر رہا تو گھر میں بیٹھا لکھا کرے گا اور اس کے کام کو کام کرنے کے معمولی دن کے گھنٹوں میں ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے، اجتماعی رہائشی

مکان میں مثلاً ریاستی فارم کے ایسے گیہو میں رہنے کا خیال قطعی ناقابل قبول ہے۔ باورچی خانے میں ایک پرائمس اسٹو سنسنا رہا ہو اور گھر میں صرف ایک بیوی ہو — خواہ وہ باتونی ہی کیوں نہ ہو — تو یہ الگ بات ہے۔ پھر شوہر کو ضروری سکون اور اطمینان کے لمحات ملجانے کی قوی امید ہے۔ لیکن اگر باورچی خانے میں آٹھ پرائمس اسٹو سنسنا رہے ہوں اور آٹھ عورتیں بات چیت کرنے میں ایک دوسری پر سبقت لیجانے کی کوشش کر رہی ہوں تو یہ بالکل دوسری بات ہوتی ہے۔ یہاں کام کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جو مصنفین یہ طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کریں انہیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے اور اپنے ساتھ پورے گھربار کو لیجانا چاہئے — بیوی، بچے اور روزمرہ ضرورت کا سارا سامان۔ یہ کوئی ''تخلیقی دورہ'' نہیں ہے۔ اچھا تو یہ ہو کہ انہیں اپنی اپنی کاریں خریدنے میں بھی مدد دی جائے تاکہ وہ اپنے کام کی ضرورت کے مطابق ادھر ادھر گھوم پھر سکیں اور سڑک کے بیچ میں کھڑے ہوکر گزرتی ہوئی کاروں کو روکنے کی زحمت سے بچ جائیں یا انہیں مقامی سرکاری فارم اور مشین اور ٹریکٹر اسٹیشن کے ڈائریکٹر، ضلع پارٹی کمیٹی کے سیکریٹری یا علاقائی سوویت کے صدر کی مرضی کا ہمیشہ تابعدار نہ رہنا پڑے۔

ظاہر ہے کہ سب کے سب ادیبوں کو گاؤں کی راہ نہ لینی چاہئے۔ صرف ان کو ہی جانا چاہئے جو اجتماعی فارم کی زندگی کے بارے میں براہ راست معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ جو مصنف مزدور طبقے کے متعلق یا شہری دانشوروں کے متعلق لکھنا چاہتے ہوں وہ سوویت یونین کے کسی بھی صنعتی مرکز یا شہر میں بخوشی جاکر رہ سکتے ہیں۔

جو مصنف پارٹی کا میمبر ہے وہ اپنے منتخبہ دیہی مکان میں پہنچنے کے بعد مقامی پارٹی تنظیم میں شامل ہو جائیگا اور کسی نہ کسی ایسے کام میں ہاتھ بٹائیگا جو اس کے اپنے خاص کام میں دخل انداز نہ ہو۔ بےپارٹی ادیب خدمت عامہ کا کوئی فرض اپنے ذمہ لینے سے انکار نہیں کرےگا۔ جہاں تک مواد کا تعلق ہے وہ اس کو وہاں بہت مل جائیگا۔ غور سے دیکھئے اور آپ کے چاروں طرف جو کچھ ہو رہا ہے اس پر گرفت حاصل کرنے کی کوشش کیجئے! جب کوئی مصنف حقیقی معنوں میں عوام کی زندگی بسر کرتا ہے، ان پر جو پڑتی ہے وہ خود بھی بھگتتا ہے، ان کی خوشیوں پر خوش ہوتا ہے، اور ان

کی فکرمندیوں اور ضرورتوں میں خود کو ذاتی طور پر ملوث پاتا ہے اور پھر کتاب لکھتا ہے وہی حقیقی کتاب ہوتی ہے، اس قسم کی جو قارئین کے دلوں میں گھر کرلیتی ہے۔

مثلاً کیوں نہ پانفیروف جو وادیٔ والگا کے باشندے ہیں، چند سال جاکر ساحل والگا پر رہیں اور ایسا ناول لکھیں جسے پڑھکر قارئین کو احساس ہو کہ ان کے لئے بھی یہ عظیم الشان دریا ''والگا میا'' ہے کوئی سمیری چچیری خالہ نہیں؟ پاؤستوفسکی کو صحیح روسی زبان پر بےپناہ عبور حاصل ہے اور انہوں نے مشاہدے کی دقیق نظر پائی ہے۔ پابندی کے ساتھ ہر سال وہ میشچیرا کے نشیبی علاقوں میں آتے ہیں جن کی یہاں کامریڈ لاریونوف نے اس قدر حسین منظرکشی کی ہے۔ کیوں نہ پاؤستوفسکی کو دریائے اوکا کے ساحل پر کہیں ہمیشہ کے لئے بس جانے میں مدد دی جائے؟ مجھے یقین ہے کہ جب مچھلی کے شکار کے شوقین پاؤستوفسکی کی بنسی کے کانٹے میں دیر تک کوئی مچھلی منہ نہ ماریگی تو وہ اپنے آس پاس اجتماعی فارم کے منظر کو ایک فنکار کی نظر سے بیٹھے دیکھتے رہیں گے۔ اس مشاہدے اور غوروفکر میں واقعی ایک اچھی کتاب کی توقع مضمر ہے۔ بیرویننسیف بھی چاہیں تو تھوڑے دنوں کے لئے ماسکو کو خیرباد کہہ سکتے ہیں اور اپنی جنم بھومی کوبان میں جاکر پھر بس سکتے ہیں۔ خداداد صلاحیتوں کے شاعر سرگیئی واسیلیئف صرف ایک مختصر عرصے کے لئے علاقۂ کرگان میں اپنی جنم بھومی میں جاکر رہے تھے اور اچھی نظمیں لیکر لوٹے تھے۔ اگر وہ زیادہ عرصے تک وہاں قیام کریں تو نظموں کا ایک سلسلہ تخلیق کرسکتے ہیں یا شاید کوئی طویل نظم۔ پرمیتین کو بھی جو علاقۂ الطائی کے رہنے والے ہیں اپنے وطن واپس پہنچ جانے سے نقصان کی بہ نسبت فائدہ زیادہ ہوگا اور چند برس ہی میں ہمارے پاس ایک کتاب کا اور اضافہ ہوجائیگا۔ باباییوسکی نے بالکل بجا طور پر یہ فیصلہ کرتے ہوئے کہ ان کے ناول ''طلائی ستارہ بردار'' پر چوتھا استالن انعام نہیں ملیگا، تین سال کے لئے چین کی راہ لی ہے، بہرحال افواہ یہی ہے۔ اور ہاں اگر وہ ہمارے دوست چینی کسانوں کے بارے میں ایک اچھا ناول لیکر واپس آئے تو یہ ہم سب کے لئے ایک شاندار تحفہ ہوگا۔

ان تمام ادیبوں کو جو ہمارے وسیع ترین ملک میں کسی بھی جگہ دوبارہ بسنے کا فیصلہ کریں ٹھیک طرح سے امداد فراہم کرنی

جانئے کیونکہ یہ سمجھنا کہ تمام مصنفوں کے پاس روپئے پیسے کی ریل پیل ہے۔ محض خام خیالی ہے۔

یہاں تو ساتھیو، میں آپ سے یہ کہہ رہا ہوں مگر دل میرا اپنی جگہ نہیں ہے: وہ کامریڈ زویریف، ہمارے فولادی وزیر مالیات بیٹھے میرے دوررس منصوبوں کی باتیں سن رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ انہوں نے مجھے اپنے طبقاتی دشمن کے صف میں پہنچا دیا ہوگا۔ ان کے دل کو اطمینان دلانے کے لئے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ میرے منصوبے حقیقت بننے سے پہلے تو بہت سارے اگر، مگر ہیں۔ دوسرے اگر دوبارہ بسائے ہوئے ہر تین میں سے ایک مصنف ایک اچھی کتاب پیش کردے جس کی انتہائی ضرورت ہے تو زرکاری بہت بڑی حد تک حق بجانب ثابت ہوجائے گی۔ اور پیارے کامریڈ زویریف کو واقعی مطمئن کرنے کے لئے میں یہاں اور ابھی نہایت سنجیدگی کے ساتھ حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ اجتماعی کاشتکاروں کی ملکیت کے پھلوں کے درختوں کے موضوع پر "پراودا" کو آئندہ تاحیات کبھی کوئی خط نہیں لکھوں گا۔ بہرحال، اس سے میرا واسطہ بھی کیا ہے؟ اس موضوع پر کامریڈ زویریف کو مجھ سے زیادہ ماہرانہ معلومات حاصل ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ کاشتکاروں کو کب اپنے پھلوں کے درخت کاٹ ڈالنے اور کب نئے پودے لگانے چاہئیں۔ چنانچہ یہ میں ان پر ہی چھوڑتا ہوں۔

میں آپ کی توجہ خاص طور پر نوجوان ادیبوں کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جو انجام کار ہماری جگہ لیں گے۔ پرانی نسل کے ادیبوں کے متعلق اور ان میں سے کچھ کے لئے ماحول کی تبدیلیوں کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا ہے وہ نوجوانوں میں سب سے زیادہ خداداد صلاحیت رکھنےوالوں پر پوری طرح صادق آتا ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ انہیں زیادہ مالی امداد کی ضرورت ہوگی اور ان کے ساتھ زیادہ احتیاط برتنی چاہیئے۔ ان میں سے قریب قریب سب کے سب روزی کمانے کے لئے کام کرتے ہیں اور اگر وہ اپنا پہلا ناول یا افسانوں کا پہلا مجموعہ لکھنے کے لئے اپنا کام چھوڑ دیں تو وہ بڑی مشکل میں پھنس جائیں گے۔ ان میں کچھ کو، مثلاً معلموں کو اسکول لازمی طور پر ہمیشہ کے لئے چھوڑنا پڑے گا کیونکہ بیک وقت معلم اور مصنف ہونا ناممکن ہے۔ یہ بات ہر اس شخص پر بخوبی واضح ہوگی جس کو سرسری طور پر بھی معلوم ہے کہ ہمارے اسکول کے معلموں کا کام کا دن کس قدر زبردست مصروفیت کا ہوا کرتا ہے۔

سوویت ادیبوں کی پہلی کانگرس کے بعد گورکی نے کہا تھا: "ہمیں بہترین مصنفوں کی پوری ایک فوج کی فوج بنانی چاہئے — ضرور بنانی چاہیئے!" گورکی کے ان الفاظ کو، ڈیلی گیٹ ساتھیو ہمیں کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ یاد ہے، جب گورکی کی وفات ہوئی تو سیرگئیف۔ تسینسکی، پرشوین، سیرافیموویچ، یاکوب کولاس، گلادکوف، اولگا فورش، مارئیتا شاگینیان، ویریسائف، الیکسئی تالستائی، نوویکوف۔ پریبوئی، ششکوف وغیرہ جیسے ادیب باقی تھے۔ وہ آزمودہ کار ہیں۔ دوسرے بعد میں آکر شامل ہوئے۔ وہ اب مشہور و معروف ادیب ہیں۔ مگر ان میں سے سب سے کم عمر بھی پچاس برس کی عمر سے تجاوز کر چکے ہیں۔ ہماری جگہ لینے والے سست رفتاری سے آرہے ہیں۔ ۱۹۳۶ء کے یعنی جس سال گورکی کا انتقال ہوا تھا اس کے مقابلے میں آج نوجوان ادیبوں کی تعداد کم ہے۔ مستقبل کے مصنفوں کو تربیت دینے کی ہماری ذمہ داری اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ادیبوں کی نشو و نما سست رفتاری سے ہوتی ہے اور ہمیں ابھی سے سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیئے کہ چھٹے پنجسالہ منصوبے کی مدت ہی میں نہیں بلکہ آج سے بیس یا پچیس برس بعد جبکہ آج کے سربرآوردہ مصنفوں میں سے شاید ہی کوئی باقی ہو، ادب میں کیا ہو رہا ہوگا۔

ہم سب اپنی عظیم کمیونسٹ پارٹی کی اولاد ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک، پارٹی کے بارے میں سوچتے ہوئے نہایت ہی جذباتی انداز میں اپنے آپ سے دل ہی دل میں کہتا ہے: "تم ہماری ماں کی طرح ہو، تم نے ہمیں پروان چڑھایا، تم نے ہمیں آہن پیکر فولاد بدن بنایا، تم ہمیں زندگی کی واحد سچی شاہراہ پر لئے جا رہی ہو۔" اور اب میں آخر میں کہونگا:

میری پارٹی! تمہارا طاقتور اور صاف طور پر سوچنے سمجھنے والا اجتماعی ذہن ہے اور ماں کا ہاتھ ہے جو بیک وقت سخت گیر اور پرشفقت ہو سکتا ہے۔ اپنے مصنفوں کو مدد کرنے کی کوئی نہ کوئی راہ تم نکال ہی لوگی اور جب وہ تمہاری توجہ اور فکرمندی سے جوش و خروش حاصل کرکے اپنی نئی تصنیفات شائع کریں گے جو تمہارے، ہماری پارٹی کے، اور ہمارے ملک کے، شایان شان ہونگی تو ممنون احسان سوویت اور غیرملکی قارئین سب سے پہلے تمہارے ہی شکرگذار ہوں گے۔

۱۹۵۶ء

ہماری مادرِوطن کے ان سپوتوں کے نام سنہری حروف سے لکھے ہوئے ہیں اور ان کو ہمیشہ یاد کیا جاتا رہیگا جن کے دل و دماغ، علم و دانش، فکر و نظر اس قوم کے لئے وقف تھے جس نے ان کو جنم دیا تھا۔ ایسا ہی ایک نام ایوان فرانکو ہے...

ان کی پیدائش کا جشن صدسالہ سوویت یونین کے لوگ، سب سے پہلے میرے ہمقوم یوکرینی منا رہے ہیں۔

لاکھوں کی ہم‌آہنگ آواز میں میں بھی اپنی منحنی آواز ملانا اور اس عظیم ادیب، یوکرین کے سپوت سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

۱۹۵۶ء

ہنگری کے ادیبوں سے خطاب

ہنگری کے واقعات سے میں، ایک سوویت شہری، مصنف اور کمیونسٹ، اپنی روح کی گہرائیوں تک پریشان ہوں۔ یہ واقعات اس لئے اور بھی زیادہ تکلیف‌دہ ہیں کہ ان کے ظہور میں آنے کی بڑی وجہ عوامی ہنگری کے سابقہ حکمرانوں کی جنہیں سوشلزم کی تعمیر اور عوام کے لئے بہتر زندگی کی تخلیق کا فرض سونپا گیا تھا، شدید غلطیاں تھیں۔

ایک اور وجہ جن کے باعث یہ واقعات تکلیف‌دہ ہیں یہ ہے کہ میرے رفقائےکار، ہنگری کے ادیب جنہوں نے ان غلطیوں کے خلاف جرأت کے ساتھ آواز بلند کی تھی، رجعت پسندی کے خلاف عین‌وقت پر، جبکہ یکسر پراگندگی کا دور دورہ تھا، اپنی آوازیں بلند کرنے میں ناکام رہے۔

صورت حال اس وجہ سے ڈرامائی ہو جاتی ہے کہ اس الجھن سے نکلنے کا راستہ بہت سے لوگوں کو نظر نہیں آیا اور بعض لوگوں کو اب بھی صاف نظر نہیں آتا۔ مگر میں تو یہی کہوں گا کہ میں رجائیت پسند ہوں۔ اور اپنی رجائیت کی صفائی میں ہنگری کے واقعات کے اور خانہ‌جنگی کے زمانے میں اپنے ڈان دیس میں رونما ہونےوالے واقعات کے درمیان مماثلت واضح کرنا چاہوں گا۔ کٹر انقلاب‌دشمنوں کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو وائٹ گارڈوں کی تحریک میں آنکھیں موندے

مولدے کھنچ آئے تھے لیکن انجام‌کار ان میں سے بیشتر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ سوشلزم کے سرگرم‌عمل معمار بن گئے۔

مجھے ہنگری کی دلیر اور جفاکش قوم کی واضح دانشمندی پر پرخلوص عقیدہ ہے اور مجھے تہ‌دل سے امید ہے کہ آنےوالے سال میں ہنگری کے محنت‌کش عوام، ہنگری کی مزدوروں کی سوشلسٹ پارٹی کی قیادت میں دنیا کی ترقی اور امن کے کام میں شایان‌شان حصہ ادا کریں گے۔

۱۹۵۶ء

عوام کی حکمت کا مخزن

کسی قوم کی سب سے بڑی دولت اس کی زبان ہوا کرتی ہے۔ انسان کے علم و دانش اور تجربے کے لاانتہا خزانے الفاظ کی شکل میں رہتی دنیا تک باقی رہنے کے لئے ہزارہا برس کے دوران جمع ہوتے رہتے ہیں۔ اور شاید ایسی کوئی اور شکل نہیں ہے جس میں عوام کی دانش اس قدر پرزور اور جامع طریقے سے منعکس ہوتی ہو، اور اس کی قومی تاریخ، سماجی تعلقات، طرزِزندگی اور دنیا کے بارے میں نقطۂنظر بلور کی طرح مصفا اور مجتمع شکل میں تلاش کئے جا سکتے ہوں جیسے کہ کہاوتوں میں۔

مختصر و جامع اور پرتخیل روسی زبان ضرب‌الامثال کی دولت سے خاص طور پر مالامال ہے۔ ان کی تعداد ہزاروں ہزار پہنچتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پر لگا کے پرواز کرتی ہوئی ایک صدی سے دوسری صدی میں، ایک نسل سے دوسری نسل میں داخل ہوتی چلی آئی ہیں اور یہ بےبال‌وپر علم و دانش جس منزل کی جانب محو پرواز ہے وہ نگاہوں سے اوجھل ہے...

کہاوتوں کا جنم مختلف زمانوں میں ہوا تھا اور ان میں رنگ‌رنگ انسانی تعلقات کی تجسیم ہوا کرتی ہے۔ وقت کے نہاں‌خانوں سے وہ ہمارے پاس لوگوں کی مسرتوں اور المیوں، آنسوؤں اور قہقہوں، محبتوں اور دشمنیوں، عقیدوں اور بےعقیدگیوں، سچ اور جھوٹ، دیانتداری اور دغابازی، جفاکشی اور کاہلی، انصاف اور تعصبات کی کہانیاں لیکر آتی ہیں۔

روسی کہاوتوں میں جو چیز بہترین ہے اس سب کو سوویت عوام اپنا لیں گے اور ان میں جو فرسودہ ہو گیا ہے اور نئی دنیا کی تعمیر میں ان کے لئے کارآمد نہیں ہوگا اس کو ترک کردیں گے۔

حب الوطنی کا ہمارا ناز ان جیسی کہاوتوں میں آہنی پیکر اختیار کرچکا ہے: ''جو بھی روسی سرزمین پر قدم رکھے، قدم سنبھال کے چلے''، ''اپنے وطن کی سرزمین پر آخر دم تک جم کر کھڑے رہو''، ''حق کے لئے لڑنے سے کبھی نہ ڈرو''۔

ہم ان کہاوتوں کو بھی دوہرائیں گے: ''بیکار یہی چاہیں گے کہ کوئی دوسرا ان کا کام کردے''، ''بوجھ اٹھانے سے پہلے اپنی طاقت کا اندازہ کرلو''، ''دوسرے کا بوجھ ہلکا معلوم ہوتا ہے''، ''لوگوں کو کام کرتے ہوئے دیکھنے سے ہی تمہارا پیٹ نہ بھرے گا''، ''ایک گھنٹے کی تاخیر پوری کرنے میں ایک سال لگ جاتا ہے''، ''باتیں تیر نہیں ہوتیں، پھر بھی گھائل کر جاتی ہیں''۔

لیکن ایسی کہاوتیں جن پر قومی عناد، زرخرید کسانی ذہنیت، عورتوں کے حقوق سے نفرت اور مذہبی توہمات کی چھاپ ہوتی ہے— مختصر یہ کہ ایسی کہاوتیں جو عوام کی جن پر کلیسائی، طبقاتی اور نسلی بوجھ لدا ہوا تھا، فطری ذہانت و ذکاوت کا اظہار نہیں کرتیں— ہمارے ہمعصروں کے لئے قطعی اجنبی ہیں۔ اس بوجھ کے خلاف احتجاج کا متعدد نہایت موزوں کہاوتوں میں اظہار ہے جن میں کچھ نہایت ہی تیکھے طنزیہ انداز کی ہوتی ہیں اور کچھ میں افسردہ تلخی کی جھلک ہوتی ہے۔ ان میں سے چند ملاحظہ فرمائیے: ''اگر غریب آدمی اناج مہیا نہ کرے تو مالدار کے پاس کھانے کو صرف پیسہ ہو''، ''دھونی زیادہ مت دو ورنہ مقدس تصویریں سیاہ پڑجائینگی''، ''مناجات گانے کو تو گا لی، پر بھلا کسی کا نہ ہوا''، ''اناج کے گن گاؤ جب کٹ جائے، مالک کے گن گاؤ جب مر جائے''۔

صدیوں کی سماجی ناانصافی اور جبرو ریاکاری کی پرستش نے لوگوں میں طرح طرح کے توہمات اور جھوٹی کہاوتیں مشہور کردی تھیں۔ پرانی کہاوتوں میں بہت ساری ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو صحت‌مند احساسات کو صدمہ پہنچاتی ہیں۔ لیکن ہماری برق رفتار زندگی ان سب کو پیچھے چھوڑ آئی ہے اور ہمارا نیا سوشلسٹ تجربہ نئی دنیاوی فہم و فراست کو جنم دیتا ہے۔

اس طرح وقت کی لہریں کہاوتوں کے زریں ذروں کی ریت کو متواتر دھوتی رہتی ہیں اور سونے کے یہ منتشر ذرات بےشمار نسلوں کی زندگی، جدوجہد اور روایتوں کو منعکس کرتے رہتے ہیں۔

روسی ضرب الامثال اور کہاوتوں کی اشاعت، جو پچھلی صدی میں قرنوں کی سعی و کاوش کے بعد ممتاز ماہر محاورات اور مصنف داہل نے مرتب کی تھیں، قومی تہذیب کی لازوال دولت کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ کرے گی اور ہمیں اپنی بےپایاں اور پرزور زبان پر بہتر عبور حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔

۱۹۵۷ء

بحریہ کے نام ایک خط

میرے پیارے ملاح دوستو!

میں آپ کے خط کا اور میرے کام سے آپ نے جس دلچسپی کا اظہار کیا اس کا شکرگذار ہوں۔

آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں نے اپنے داویدوف کو بحیرۂ بالٹک کا ملاح کیوں بنایا۔

داویدوف جیسے لوگ، یوں سمجھئے کہ بہت سارے تھے۔ میں بہت سارے ملاحوں سے ملا، ان سے بات‌چیت کی اور دیکھا کہ پارٹی نے ان کو جو فرائض سونپے تھے وہ انہیں کس طرح انجام دے رہے تھے۔ اور وہ جہاں کہیں بھی ہوتے اپنی شاندار، انقلابی بحری روایات ہمیشہ رائج کر دیتے۔

اکتوبر انقلاب میں ملاحوں کے کارنامے کی ولادیمیر ایلیچ لینن نے بڑی ہی تعریف کی تھی۔ ویسی ہی بہادری سے وہ خانہ‌جنگی میں لڑے اور سوویت حکومت کی تعمیر میں سرگرم عملی حصہ لیا۔

اسی سے مجھے خیال ہوا کہ داویدوف کو ملاح بناؤں۔ اس شخص میں جو گاؤں اس لئے آیا ہو کہ وہاں کے پہلے اجتماعی فارم کا انتظام سنبھالے جرأت، تحمل، خوش مزاجی، لوگوں میں گھل مل جانے کی صلاحیت اور اجتماعی طور پر زندگی بسر کرنے کا تجربہ بھی ہونا چاہئے۔ یہ تمام خوبیاں اور ان کے ساتھ پارٹی سے اور کمیونزم کے نصب العین سے بےپناہ عقیدت مجھے ان ملاحوں میں نظر آتی جنہوں نے سوویت بحریہ میں تربیت حاصل کی تھی۔

آپ کے خط کے جواب میں میرا خیال ہے کہ میں بس یہی کہہ سکتا ہوں۔

ہماری مسلح فوجوں کی چالیسویں سالگرہ کے موقع پر ہمارے ظفرمند ملاحو تمہیں میرا پرجوش سلام۔

۱۹۵۸ء

قارئین آج کل کے بارے میں نئی کتابیں چاہتے ہیں

اس خبر کا کہ رسالہ ''لتیراتورا ای ژیزن،، وقتاًفوقتاً اپنی صفحات اور پورے کے پورے شمارے روسی فیڈریشن کے مختلف علاقوں اور خوداختیار جمہوریاؤں کے مصنفوں کی تخلیقات کے لئے وقف کیا کریگا، خیرمقدم ہی کیا جا سکتا ہے۔

آئیے ہم سوویت روس کے ادبی نقشے کا جائزہ لیں۔ ماسکو اور لینن گراد ہی وہ دو مقامات نہیں ہیں جہاں وہ کتابیں تصنیف ہوتی ہیں جو ملک بھر میں مشہور و معروف ہیں۔ بعض مصنفین مشرق بعید میں، یورال میں، سائبیریا میں، ڈان، کوبان، والگا اور تیریک کے ساحلوں پر رہتے ہیں اور وہ سب اپنے حقیقت بیان قلم سے پارٹی اور سوویت عوام کے نصب‌العین کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ ان کی سکونت وہ پیمانہ ہرگز نہیں ہے جس سے قارئین ادب میں ان کے حصے کی پیمائش کرتے ہوں۔ مصنفوں کو صدرمقامی اور صوبجاتی کے زمروں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

اخبار کو چاہئے کہ روس کے ادبی کشت‌زار کو گاہے گاہے دیکھتا رہے اور کیفیت کی ایک بھی نالی ایسی نہ رہ جائے جسے دیکھ نہ لیا گیا ہو۔ اسے نئی نئی، ہری کونپلوں کو دیکھنا چاہئے اور اس کو اپنی توجہ سے ان ادیبوں کو محروم نہ رکھنا چاہئے جو بےجتے قطعات پر اگ آتے ہیں۔

قدرتی بات ہے کہ میں اس حقیقت کی جانب سے نگاہیں نہیں چرا سکتا کہ آج کا اخبار ڈان کے ادیبوں کے لئے وقف ہے یعنی ان لوگوں کے لئے جو میرے ہموطن ہیں۔ انہوں نے یہ امتیاز واقعی اپنی محنت سے حاصل کیا ہے کیونکہ ان کی کتابوں میں زندگی کا تنفس ہوتا ہے۔ ہمارے ادب میں ڈان کی پلٹن کو اس کے قدموں کی زوردار چاپ سے فوراً پہچانا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ امتیاز ان پر ایک حد تک ذمہ‌داری بھی عائد کرتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں میرے رفیق‌کار مصنفین اس یاد دہانی کے لئے مجھے معاف فرمائیں‌گے کہ قارئین آج‌کل کے بارے میں نئی کتابوں کے منتظر ہیں۔ نہ ہی ان کو اس مشورے کا برا ماننا چاہئے کہ ان کو اپنے ہنر کو کمال کے درجے تک پہنچانے کی جستجو برابر جاری رکھنی چاہئے۔ پرمعنے روسی زبان کے مخزن سے مصنف جو لفظ منتخب کرے اسے ہر بار ایسا ہونا چاہئے کہ جو براہ‌راست قاری کے دل میں گھر کرلے۔

ڈان کے اپنے ساتھی مصنفوں کو میرا دلی پیغام تہنیت پہنچے!

۱۹۶۰ء

''لتیراتورنایا گزیتا،، کے نامہ‌نگار سے انٹرویو

آپ کے مغربی یورپ کے دورے کا کیا مقصد تھا؟

انگلستان، اٹلی اور فرانس کے میرے دورے کا تعلق خاص طور سے تو ''جب زمین جاگی،، کے دوسرے حصے کی اشاعت سے تھا۔ علاوہ ازیں انگلستان میں مجھے جشن تالستائی میں بھی مدعو کیا گیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے میں اس وقت تک لندن نہ پہنچ سکا۔

''جب زمین جاگی،، کا پہلا حصہ، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، قریب قریب تیس برس قبل شائع ہوا—جو تقریباً پورا ایک عرصۂحیات ہے۔ دوسرے حصے کا اب ترجمہ ہوگیا ہے اور وہ انگلستان اور اٹلی میں شائع ہوگیا ہے۔ پیرس میں مجھے بتایا گیا کہ فرانسیسی ترجمہ جلد ہی یعنی موسم بہار تک شائع ہو جائیگا۔

یہ کتاب کن اشاعت گھروں نے شائع کی اور یورپ کے قارئین نے اس کا کیسا استقبال کیا؟

انگلستان میں مشہور و معروف ''پٹنام،، اشاعت گھر نے۔ میں نے اٹلی میں ''ایدیتوری ریئونیتی،، کو اپنی تمام کتابوں کو عالمی منڈی کے لئے شائع کرنے کے حقوق دے رکھے ہیں۔ اور فرانس میں ''جب زمین جاگی،، کی اشاعت کا اہتمام پیرس کے سب سے بڑے ناشرین ''گالیمارد،، کر رہے ہیں۔ قابل‌ذکر بات یہ ہے کہ جنگ سے بہت عرصہ قبل

۱۹۳۰ء کی دہائی میں ''گالیمارد'' نے فرانسیسی قارئین کو میری تصنیفات سے متعارف کردیا تھا اور ۱۹۴۰ء میں انہوں نے ہی ''اور ڈان بہتا رہا...'' کا آخری حصہ شائع کیا تھا۔

میرے ناشرین نے مجھے بتایا ہے کہ ''جب زمین جاگی'' کا دوسرا حصہ جس تیز رفتاری سے فروخت ہوا وہ قارئین میں اس کی مقبولیت کی توثیق کرتی ہے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس ناول پر اخباروں نے بہت کچھ لکھا اور مجھے نہایت مختلف الخیال اخبارات کے تبصرے دکھائے جن میں لندن کا ''ٹائمز'' بھی تھا جس کے ''ادبی ضمیمے'' میں میری کتاب پر تبصرہ شائع ہوا تھا۔

دوسرے اور کونسے ممالک آپ کی یہ کتاب شائع کرنے والے ہیں؟

''ایدیتوری ریونیتی'' نے ''جب زمین جاگی'' کی اشاعت پر ریاستہائے متحدہ امریکہ، کناڈا، جرمنی کی وفاقی جمہوریہ، ہالینڈ، اسپین، پرتگال، ارجنٹائن، چلی، برازیل اور دوسرے ملکوں کے مختلف ناشروں سے معاہدے کر لئے ہیں۔ آج کل یونان اور اسرائیل کے ناشروں سے گفت و شنید ہو رہی ہے۔ انگلستان کے اشاعت گھر ''پٹنام اینڈ کمپنی'' نے میرے ناول کے اپنے قدرے بڑے ایڈیشن کے خاصے حصے کو آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور بعض افریقی ملکوں میں فروخت کیا ہے۔

آپ کے اور کونسے ناول پچھلے دنوں مغرب میں شائع ہوئے ہیں؟

مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں۔ لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ فرانس کے مشہور ژولیارد اشاعت گھر نے ''اور ڈان بہتا رہا...'' کی چاروں جلدیں پچھلے سال شائع کی تھیں اور اٹلی میں — یہ بھی پچھلے سال کی بات ہے — ''جب زمین جاگی'' کے علاوہ ''وطن کے مجاہد'' کے ابواب بھی شائع ہوئے اور میرے ''ڈان کے افسانوں'' کی ایک کتاب بھی شائع کی گئی جس میں افسانہ ''مقدر انسان کا'' بھی شامل ہے۔

کیا آپ مختلف مقامات اور لوگوں کے بارے میں اپنے تاثرات بھی ہمیں بتائیں گے؟

انگلستان میں کرسمس کی شب کو پہنچا، اور اس لئے مجھے انگریزوں کے تہوار دیکھنے کا موقع بھی مل گیا — یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جبکہ شہر قریب قریب اجاڑ ہو جاتے ہیں۔ میں لندن اور ایڈنبرگ گیا اور تھوڑا سا سفر اسکاٹلینڈ کا بھی کیا۔ نو روز کی شب کو میں اٹلی پہنچا جہاں مقامی روایات کے بموجب تہوار بہت دھوم دھام سے منائے جاتے ہیں۔

میں روم، نیپلز، سلیرنو اور پالیرمو گیا۔ مجھے سانتور انجولیتی سے ملنا تھا جو مصنفوں کی یورپی کمیٹی کے صدر ہیں مگر ان کی علالت کے باعث ملاقات نہ ہو سکی۔ سسلی کا میرا سفر ایک یادگار تجربہ تھا۔ پالیرمو میں خداداد صلاحیتوں کے مصنف دانیلو دولچی سے جنہیں بین الاقوامی لینن انعام مل چکا ہے اور ان کے دوستوں اور اہل خاندان سے ملاقات ہوئی۔ میں امید کر رہا ہوں کہ سانتور اور سانتورا دولچی اور ایک جمہوریت پسند اخبار ''لااورا'' کے مدیراعلی ویتوریو نیستیکو کی مہمان نوازی ویشنسکایا میں کرنے کا مجھے موقع ملیگا جہاں میں نے اب کی خزاں میں انہیں مدعو کیا ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ سفر دلچسپ رہا۔ میرے مجموعۂ تصانیف کی (میری مراد ہے ''اور ڈان بہتا رہا...''، ''جب زمین جاگی''، ''مقدر انسان کا''، ''وطن کے مجاہد'' غرضیکہ فرانسیسی ناشروں نے میری جو چیزیں شائع کی ہیں ان کی) اشاعت کے سلسلے میں ۱۹۶۲ء کی بہار میں لوئی اراگاں نے مجھے فرانس آنے کی دعوت دی ہے۔ یہ دعوت نامہ میں نے قبول کرلیا ہے۔

۱۹۶۱ء

سیمیون داویدوف کے متعلق

(لینن گراد میں کیروف کارخانے کے
مزدوروں سے خطاب سے اقتباس)

پیارے دوستو،

لوگ اکثر مجھ سے پوچھا کرتے ہیں کہ ''جب زمین جاگی'' کا مرکزی کردار سیمیون داویدوف کیروف کارخانے کا مزدور کیوں ہے، اور اس سے پہلے وہ بالٹک کے بیڑے کا ملاح کیوں تھا۔

تیس برس سے زیادہ عرصہ ہوا جبکہ میں نہایت ہی نوجوان مصنف تھا، تو اس طرح میں پیتروگراد کے ترقی پسند مزدور طبقے کو اور اس کے شاندار انقلابی کارناموں اور روایات کو بصد احترام وعقیدت پیش کرنا چاہتا تھا۔ یہ لینن گراد کے مزدوروں، خصوصاً کیروف کارخانے کے مزدوروں کو میرا خراج تحسین تھا۔

میرا دوسرا خراج تحسین بالٹک کے بیڑے کے بانکے ملاحوں کو پہنچتا ہے۔ کیونکہ ان کے کارناموں اور انقلابی روایتوں کی بھی میرے دل میں بڑی عزت ہے۔

مجھے فخر ہے کہ سیمیون داویدوف، ''جب زمین جاگی،، کا ہیرو، اس اجتماعی فارم کا صدر جو اس نے ہمارے ڈان دیس میں منظم کیا تھا، آپ میں سے آیا تھا، یعنی یہ کہ وہ آپ میں سے تھا...

مزدوروں کی اس نئی پود کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے جن کا تجربہ اور تربیت سیمیون داویدوف کا اور اس کے ہمعصر لوگوں کا مرہون منت ہے، جن کی بہترین روایات ان کو ورثے میں ملی ہیں اور جن کو انہوں نے جاری رکھا ہے۔

ہم ڈان سے یہاں آپ سے صرف اتنا ہی کہنے نہیں آئے ہیں، بلکہ آپ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ آئیے اور دیکھئے کہ سیمیون داویدوف کے خون پسینے سے سینچی ہوئی زمین پر زندگی کس شان سے پھل پھول رہی ہے۔

۱۹۶۱ء

استحکام اور پھر استحکام!

ہمارے پرآشوب زمانے میں امن کے مجاہدوں کا استحکام اور پھر استحکام وقت کا اہم ترین مطالبہ ہے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ آج کل دانشوروں کو — ان لوگوں کو جو تہذیب کے میدان میں سرگرم عمل ہیں — ذمے داری کا خاص طور پر بڑا حصہ قبول کرنا چاہئے۔

ایٹم بم ایجاد کرنے والے ہی کو وہ پہلا شخص ہونا چاہئے جو اس کو ممنوع قرار دے۔ تہذیب کے سچے علمبرداروں نے کبھی بھی اس بات کی وکالت نہیں کی اور نہ ہی کریں گے کہ ایٹم کو بنی نوع انسان کے خلاف تباہ کن مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔

ہمیں اس بات کا قائل ہوجانے کے بارہا مواقع ملے ہیں کہ غضبناک احتجاج نے ان لوگوں کے منصوبے خاک میں ملا دئے جو نیوکلیائی جنگ چھیڑنا چاہتے ہیں۔

تو آئیے ہم دوچند زور شور سے اپنا احتجاج دوہرائیں اور اپنی کانگریس میں کہیں ہم ''نہیں چلیگا،،۔

۱۹۶۲ء

کمیونزم کے تصورات سے وفاداری

غالباً علم وفن کے کسی اور شعبے میں نظریاتی تصادم اتنا شدید نہیں ہوتا جتنا کہ ادب میں۔ ایک ناول میں جہاں کرداروں کی اندرونی دنیا اور سیاسی رویے کو واضح کیا جاتا ہے، مصنف اپنی ہمدردیوں اور بیزاریوں کو چھپا نہیں پاتا یہاں تک کہ ان کو مبہم بھی نہیں کرسکتا۔ وہ قارئین سے اپنے نظریاتی عقیدے کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔

مصنفین کے بارے میں علیحدہ گفتگو کرنے کے معنے ادب کے بارے میں گفتگو کرنا ہے کیونکہ فنی فکر اور ادبی روایات کے تسلسل سے ہم قریبی طور پر باہم وابستہ ہوتے ہیں۔ ہم، مصنف، درحقیقت واحد زنجیر کی مانند ہوتے ہیں جو الگ الگ کڑیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

دورحاضرہ کی زندگی نے ثابت کردیا ہے کہ صرف وہی آرٹ جو عوام کے مفادات کی خدمت کرتا ہے عوام الناس میں زندہ رہیگا اور آئندہ وجود کا مستحق ہوگا۔ اور یہ قدرتی بات ہی ہے کہ اس آرٹ کا مقدر گمنامی اور موت ہے جو صرف ایک طبقے، غلام بنانے والوں کے طبقے، طفیلی طبقے کی جو تواریخی منظر سے غائب ہو رہا ہے، روحانی ضرورتوں کی تسکین کرتا ہے۔

جدید ادب کی تاریخ سے یہ بات قطعی واضح ہوسکتی ہے۔ بونین کو نثر اور نظم دونوں میں خواہ کتنا ہی ملکہ کیوں نہ حاصل تھا اسے قریب قریب فراموش کر دیا گیا ہے اور ہمارے قارئین میں، خصوصاً نوجوانوں میں اسے کوئی جانتا تک نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بونین کی تصانیف سوویت یونین میں پھر سے شائع نہیں ہوئیں۔ شائع ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس گورکی اور سیرافیموویچ فراموش نہیں کئے جائیں گے۔ حالانکہ وہ بونین کے ہمعصر تھے، ادبی منظر میں وہ ساتھ ساتھ نمودار ہوئے تھے لیکن انہوں نے عوام کی خدمت جن طریقوں سے کی وہ مختلف تھے۔ اور ان کی تخلیقات کی قدر مختلف انداز میں کی جاتی ہے۔ بونین کو ان کے ناول ''آرسینیف کی زندگی،، پر نوبل انعام دیا گیا تھا لیکن گورکی کو سویڈن کی اکادمی نے ان کے ناول ''کلیم سامگین کی زندگی،، پر اس انعام سے نہیں نوازا تھا حالانکہ یہ تخلیق اپنے طور پر کامل تھی اور انقلاب سے عین پہلے زارشاہی روس کے سماج کے تمام طبقات اور پرتوں کا اس میں حقیقی طور پر انسائکلوپیڈیائی احاطہ کیا گیا تھا۔

اسی طرح سویڈن کے ادبی نکتہ‌دانوں نے گورکی کے بہترین ناول ''ارتامونوف کنبہ،، کو توجہ کے قابل نہ سمجھا۔ یہی حشر سیرافیمووچ کے ناول ''آهنی سیلاب،، اور سوویت نثرنگاری کی بہت سی دوسری اہم تخلیقات کا ہوا۔

جیسا کہ آپ دیکھیں‌گے بین‌الاقوامی میدان‌عمل میں فنی تخلیقات کو طبقاتی مفادات پیش نظر رکھتے ہوئے پرکھا جاتا ہے۔ اور اس سے بورژوا نظریہ‌دانوں کے ان بیانات کی تردید ہوجاتی ہے کہ خود اپنی نوعیت کے اعتبار سے آرٹ بےطبقاتی ہوتا ہے...

پورے ملک میں سوویت عوام الکساندر سیرافیمووچ کا صدسالہ یوم پیدائش منا رہے ہیں جو ایک ممتاز ادیب تھے اور جن کی تخلیقات گورکی، مایاکوفسکی، الیکسئی تالستائی، یسینین اور سیرگیئیف — تسینسکی کی تخلیقات کی طرح ہمارے ملک میں اور دنیا میں کبھی بھی گوشہ گمنامی میں نہیں پہنچینگی اور آئندہ نسلوں کو یہ تہذیبی خزانہ ورثے میں ملتا رہیگا۔

''آهنی سیلاب،، سوویت ادب کا ہمیشہ ایک اثاثہ رہیگا۔ سیرافیمووچ کی تصانیف میں یہ ناول ہمارے لئے خاص طور پر بیش‌بہا ہے کیونکہ یہ ان دو اولین تخلیقات میں سے تھا — دوسرا فورمانوف کا ناول ''بغاوت،، تھا — جنہوں نے ان سورماؤں کے مؤثر خدوخال پیش کئے تھے جو سوویت اقتدار قائم کرنےوالے مجاہدوں کی، کمیونزم کے عظیم‌الشان نصب‌العین کے حامیوں کی صف اول میں تھے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ان کے نقوش ایک ایسے انداز میں ابھارے گئے تھے جس میں انقلاب کے ان اولین سپاہیوں سے محبت اور احسان‌مندی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

الکساندر سیرافیمووچ کی پوری زندگی، ان کی تخلیقات کی طرح اصلیت میں انقلابی تھی۔ آخر دم تک وہ ترقی، انقلاب اور ہماری کمیونسٹ پارٹی کی دیانتداری سے خدمت کرتے رہے۔

ہم وادی ڈان کے لوگ سیرافیمووچ کے خاص طور پر ممنون ہیں اور دل سے محبت کرتے ہیں، صرف اس لئے نہیں کہ وہ ہماری سرزمین میں پیدا ہوئے اور پرورش پائی بلکہ اس لئے کہ انہوں نے یہاں رہنےوالے تمام لوگوں سے یکساں شفقت کا اظہار کیا — خواہ وہ ڈان کے کاسک ہوں یا نووارد یا کوبان کے کاسک یا علاقۂ استاوروپول کے کسان جنہوں نے جنوبی روس میں سوویت اقتدار قائم کرنے اور اس کو مستحکم کرنے کے لئے ہتھیار اٹھائے، اپنے خون سے آبیاری کرکے اس کو تقویت پہنچائی۔

تیس برس سے بھی زیادہ عرصہ ہوا کہ مجھے ذمہ‌دار سیرافیمووچ سے قریبی طور پر واقفیت حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں، ناشرین ''ماسکووسکی رابوچی،، نے میرے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا اور سیرافیمووچ کو گیلی‌پروف دکھائے جنہوں نے انہیں پڑھنے کے بعد کہا کہ وہ نوجوان مصنف سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری ملاقاتیں اکثر ہوتی رہیں۔ ویشنسکایا میں سیرافیمووچ میرے ہاں ٹھہرنے آتے اور جب کبھی میں ماسکو جاتا تو ان سے ملنے ان کے ہاں ضرور جاتا۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے ویشنسکایا میں کوئی دس روز ہمارے ہاں قیام کیا۔ دریائےڈان میں مچھلی کا شکار کھیلنے اور کشتی‌رانی کرنے ہم ساتھ جایا کرتے اور ان دنوں ڈان دیس میں جو کچھ ہو رہا تھا اس سے سیرافیمووچ ہمیشہ انتہائی جوش و خروش سے دلچسپی لیا کرتے تھے۔

ہماری ملاقات رفتہ رفتہ قریبی دوستی میں بدل گئی حالانکہ ہماری عمروں میں بڑا فرق تھا۔ میری روح کی گہرائیوں میں، اس پیارے، سادہ مزاج انسان کی سورتی براجمان ہے، جس کی آنکھوں میں مخصوص کاسکی قسم کی چمک تھی — ایک عظیم ادیب جو نوآموزوں کو جن میں خود میں بھی شامل تھا، مدد دینے کو ہر وقت تیار رہتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ ہمارے ڈان دیس میں آج کل جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے حیرت‌انگیز، ممتاز مصنف اور ہمارے ہموطن کی بہترین یادگار ہے۔

ایک بار ویشنسکایا میں انہوں نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی دخانی کشتی جو دھار کے خلاف پانی کو چیرتی چھپچھپاتی ہوئی جارہی تھی اور اشارہ کررہی تھی کہ کشتیوں کا پل کھول دیا جائے، تب انہوں نے کہا تھا: ''یہ حیرت‌انگیز چھوٹا سا جہاز پرسکون ڈان کے خواب گیں کناروں کو بیدار کر رہا ہے، کیوں نہ؟،،

اگر آج ''پرسکون ڈان،، کے ساحل پر زندگی موجزن دیکھتے تو وہ مرد بزرگ، مجھے یقین ہے کہ بےانتہا خوش ہوتے۔ ہم، قارئین اس عظیم دلنواز شخصیت کو ہمیشہ اپنے دل میں جگہ دیں‌گے اور ان کی تصانیف کو اپنی دولت سمجھ کر رکھیں‌گے جو کمیونزم کے نصب‌العین کی خدمت انجام دیتی ہیں۔

۱۹۶۳ء



سوویت مصنفوں کی چوتھی کل یونینی کانگرس میں شرکت کے لئے ماسکو میں۔

چارلس پرسی اسنو کے نام ایک خط

اپنے پیارے دوست کو میں روستوف کی ریاستی یونی‌ورسٹی سے لسانیات میں ڈاکٹری کی اعزازی سند ملنے پر پرخلوص مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

سوویت عوامی تنظیمیں، جن میں علاقہ روستوف کی تنظیمیں بھی شامل ہیں روس کی ایک قدیم‌ترین ریاستی روستوف یونی‌ورسٹی کی لسانیات کی ڈاکٹری کی اعزازی سند ملنے پر آپ کو جو انگریزی کے ممتاز مصنف ہیں، ان کے اور برطانیہ اور سوویت یونین کے درمیان دوستانہ تعلقات کے سرگرم مجاہد ہیں، پرخلوص مبارکباد پیش کرتی ہیں۔

ہم آپ کو، آپ کی اہلیہ پامیلا ہینسفورڈ جانسن کو اور آپ کے اہل خاندان کو دعوت دیتے ہیں کہ اگر آپ کو سہولت ہو تو امسال مئی میں روستوف بر ساحل ڈان تشریف‌لائیں اور سند قبول فرمائیں۔

عالمی ریکارڈ مات کرنے کے اپنے خروش میں ہم یہاں ساحل ڈان پر توقع کرتے ہیں کہ سینٹ اینڈروس میں میری جو شاندار اور پرخلوص مہمان‌نوازی ہوئی تھی اس پر سبقت حاصل کر پائیں گے۔

آپ کا مخلص

میخائل شولوخوف

۱۹۶۳ء

مصنفوں کی کل یوروپی کمیٹی کے اجلاس میں تقریر

سوویت انجمن مصنفین کی جانب سے میں آپ کو تہنیت پیش کرنے اور اس موجودہ کانفرنس کی کامیابی کی خواہش کا اظہار کرنے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

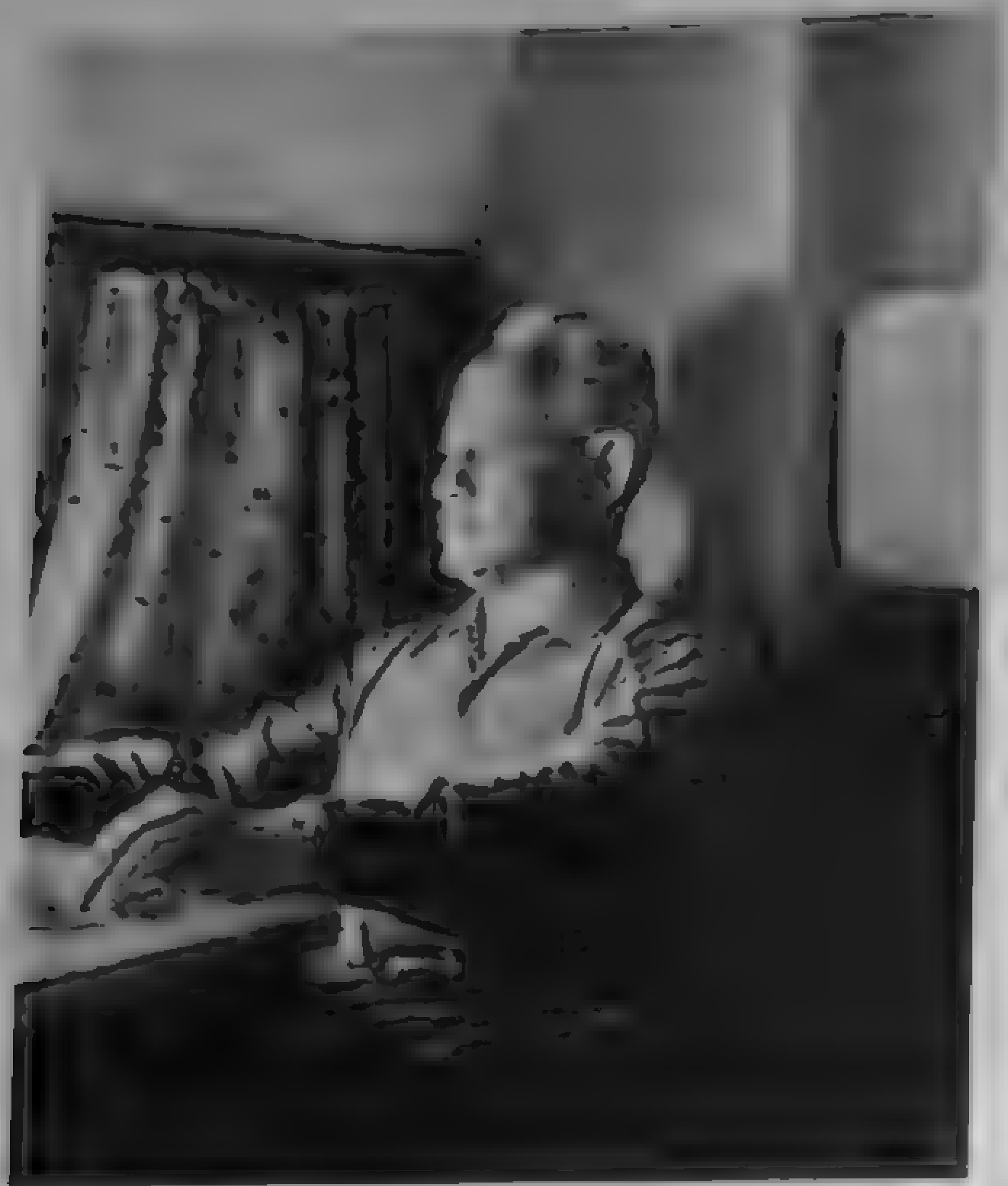
مجھے اپنے سامنے جو حضرات نظر آ رہے ہیں — یقیناً میری مراد خواتین سے نہیں ہے — ان میں سے بیشتر اپنی جوانی کی منزل سے گزر چکے ہیں: وہ ایسے مصنف اور نقاد ہیں جن کے شانوں پر عمر اور تجربے کا بار بلاشبہ لدا ہوا ہے۔ اس لئے ہمیں سادہ لوحی سے کام نہ لینا چاہئے: میرے سفیدبالوں کا احترام کرتے ہوئے مجھے سب سے پہلے آپ سے خطاب کرنے کا اعزاز نہیں بخشا گیا تھا، بلکہ محض اس وجہ سے کہ میرے اچھے دوست الیوشا سورکوف اور سوویت انجمن مصنفین کے بورڈ کے دوسرے اراکین جانتے ہیں کہ میں بحث زوردار کیا کرتا ہوں، چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا: "سوویت مصنفوں میں سب سے پہلے شولوخوف کو بولنے دو۔ اپنی



سوویت مصنفوں کی یونین کی کانگرس کی صدارتی مجلس میں شولوخوف ۔

سوشلسٹ محنت کے ہیرو کا خطاب ملنے پر نکولائی پودگورنی مصنف کو مبارکباد دے رہے ہیں ۔





یورت کو روانگی ۔

یانوش کادر کے مہمان شولوخوف ۔





نوسول کی ادبی خدمات کا اعزاز والٹر البریخت شولوخوف کو پیش کر رہے ہیں -



ڈریسڈین - شولوخوف ولی بریڈل سے باتیں کر رہے ہیں -



جرمن جمہوری ری پبلک - مصنفہ آنا سیگھرس اپنے مہمان کا خیرمقدم کر رہی ہیں -



ترمذ کے ادیب منزل لاری سوبوطوف کو ساٹھویں سالگرہ کی مبارکباد پیش کر رہے ہیں۔



"پراودا" کے عملے کے مہمان۔

ویشنسکیا۔ پروفیسر ایرہارڈ ہروننگ مصنف کو لائپزگ یونیورسٹی کی فلسفے کی اعزازی سند پیش کر رہے ہیں۔





جارجیہ۔ ''دروزبا'' (دوستی) باغ میں درخت لگا رہے ہیں۔



شولوخوف جارجیہ کے چائے کے باغ میں۔

یہاں، قزاخستانی کیہاس کے میدانی علاقے میں شولوخوف کو پہلی بار یہ خبر ملی کہ انہیں نوبل انعام ملا ہے۔





اسٹاک ہام کے سوویت سفارتخانے میں۔ شولوخوف اپنی اہلیہ، دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کے ساتھ۔
بائیں سے دائیں: الکساندر، سویتلانا، مصنف اور ان کی اہلیہ ماریا پیتروونا، ماریا اور میخائل۔



جہاز ''سوویا یدرل،، تورکو سے اسٹاک ہام کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔

نوبل انعام کی سند۔





شاہ سویڈن شولوخوف کو مبارکباد دے رہے ہیں۔



سویڈن کے ایک
اخبار کا تراشہ۔



خباروسک۔ وسیوولود سیسوئیف جو اس علاقے کے میوزیم کے ڈائریکٹر، سائنسداں اور نثر کے مشہور تنداری ہیں میخائل شولوخوف کو گنسنگ کی جڑ بطور تحفہ پیش کر رہے ہیں۔

خلیج نخودنہ کے قریب جنگل میں۔





جہاز ''بائیدل،، ہونشو کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔

ایک جاپانی قاری کے لئے شولوخوف آٹوگراف دے رہے ہیں۔



ابتدائی تحریر کے بعد دوسرے شروں پر تنقید کرنے میں وہ تنس و تنج میں پڑ جائیگا...،،

یہ ہے حکمت، اس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا! لیکن جو میرے دوست محسوس کر رہے ہیں وہی میں بھی محسوس کر رہا ہوں: خوشگوار باتیں کرنا ناخوشگوار باتیں کہنے سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔

لیکن پھر بھی اگر کوئی تختوں پر رندہ کرنا اور انہیں جوڑ کر تابوت بنانا شروع کردے تاکہ اس میں ناول کو رکھ کر دفن کردیا جائے تو میں پھر تقریر کرنے کا اپنا حق محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔

ناول کے سلسلے میں میرے لئے ”ہو یا نہ ہو،، کا سوال ہی نہیں اٹھتا، ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ بوئے یا نہ بوئے کا سوال کسان کے لئے نہیں اٹھتا۔

کسان کے معاملے میں سوال اس طرح کیا جاسکتا ہے: ”کھیت بونے کا وہ کونسا بہترین طریقہ ہے کہ عمدہ فصل کاٹی جا سکے؟،،

ٹھیک یہی میرے معاملے میں ہے اور سوال یہ ہے: اپنے ناول کو اتنا اچھا کیسے بناؤں کہ وہ میرے عوام کی اور میرے قارئین کی حقیقی معنوں میں باوقار خدمت انجام دے؟

بہرحال اس کے متعلق باتیں ہم اس وقت کریں گے جب ہمارے اجتماع کا کاروباری سلسلہ شروع ہوگا۔

ہم اپنی کانفرنس کا افتتاح ایک یادگار دن کو کر رہے ہیں۔ نیوکلیائی آزمائش کے امتناع کے سمجھوتے پر آج ماسکو میں دستخط ہوجائیں گے۔ اگر بڑے سیاسی رہنماؤں اور سیاستدانوں میں سمجھوتہ ہو سکتا ہے تو یقیناً ہم مصنف بھی اس بات پر ضرور متفق ہو جائیں گے کہ اپنے فن کے ذریعے عوام کی اور امن کی سب سے اچھی طرح کیسے خدمت کریں۔ اگر ہم متفق نہیں ہوں گے تو اپنے قارئین کو ہرگز منہ نہ دکھا پائیں گے۔ ہمیں مشترک زبان تلاش کرنی ہے، کرنی ہی پڑے گی!

ہم، سوویت مصنفین، پیارے مہمانو آپ کا خیر مقدم کھلے دل سے، سچی روسی مہمان‌نوازی سے کرتے ہیں۔

اس کانفرنس کے کام کے لئے بہترین حالات پیدا کر دئے گئے ہیں۔ اچھی بات ہے کہ یہ لینن گراد میں منعقد ہو رہی ہے کیونکہ یہاں اتنی گرمی نہیں جتنی کہ ماسکو میں ہے۔ لیکن اگر ہماری بحثیں حد سے زیادہ گرما گرم ہوجائیں تو ہم اپنی کانفرنس آرخنگلسک یا مثلاً مورمانسک میں ہر وقت منتقل کر سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ کی پسندیدہ کسی



...کیو میں۔

بھی جگہ، بشرطیکہ ناول پر ہماری بحث پروقار، معقول طریقے سے ہو اور اس کے اچھے نتائج کے برآمد ہوں۔

ہم یقین کرتے ہیں کہ یہ کانفرنس کارآمد ثابت ہوگی اور ہمیں امید ہے کہ ہمارے ملک میں آپ کا قیام ایک خوشگوار تجربہ ہوگا۔

۱۹۶۳ء

جب مصنف اپنے ہیروؤں کے دوست بن جاتے ہیں

سنئے کہ مزدور طبقہ کیا کہتا ہے۔ چونتیس برس ہوئے، یا ٹھیک ٹھیک کہیں تو پینتیس برس ہوئے ''جب زمین جاگی،، کا سیمیون داویدوف ان پچیس ہزار لوگوں میں سے محض ایک فرد نہیں تھا جنہیں پارٹی نے کاشتکاری کو اجتماعی کرنے کے کام کی تکمیل کے لئے دیہات بھیجا تھا وہ پوتیلوف (اب کیروف) کارخانے کا ایک مزدور بھی تھا۔

ہمارا روحانی رشتہ جو عرصہ‌دراز قبل قائم ہوا تھا اب مادی توثیق حاصل کرتا جارہا ہے۔ لوگوں نے یہاں دوستی کے بارے میں، مصنفوں اور ان کے ہیروؤں کے درمیان دوستی کے بارے میں اچھی باتیں بتائی ہیں۔ واقعی خوب ہوتا ہے جب مصنف ان مزدوروں کے کنبے کا، گویا، ایک فرد بن جاتا ہے اور اس کا خیالی ہیرو، گوشت پوست کی صورت اختیار کرکے اس کے پاس واپس آجاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں ایسی ملاقاتیں انتہائی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔

یہ سارے قابل تعریف لڑکے، میرا پیارا ساوچ اور لیونوف جو کچھ کم عزیز نہیں ہے، روستوف کے زراعتی مشین سازی کے کارخانے گئے۔ انہوں نے اپنے کام کے طریقوں کا مظاہرہ کیا اور وضاحت کی کہ انہوں نے خود اپنی ایجادوں، خود اپنی ریتائی کی مشینوں پر کیسے کام کیا اور پورے روستوف میں نہایت اعلی قابلیت رکھنےوالے ریتائی کی مشینوں کے آپریٹروں کو محظوظ کیا اور دادتحسین وصول کی۔ اگر ہم اس طرز عمل پر کاربند رہیں اور کیروف کے مزدور مثلاً ایلیا کوسونوژکین اور ہمارے کچھ اور مزدوروں کو اپنے کارخانے میں مدعو کریں تو اس طرح شہر اور گاؤں کے ہنرمند لوگوں میں سچے معنوں میں تجربے کا تبادلہ ہوجائیگا۔ کیروف‌والوں سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے اپنے ڈان دیس میں آپ کا خیرمقدم کرکے ہمیں ہمیشہ مسرت ہوگی۔

۱۹۶۳ء

مزدور طبقے کی عظمت و شان کے متعلق کتابوں کی ضرورت ہے

لینن گراد کے کیروف کارخانے کے مزدوروں اور انجینئروں کے ایک جتھے کی ویشنسکایا میں آمد ایک یادگار واقعہ تھی۔ ادب کے متعلق ہم نے کچھ نہایت کارآمد باتیں کیں جو اس لئے اور بھی زیادہ دلچسپ تھیں کہ خود ہمارے مہمان ادبی کاموں میں مصروف ہیں، اپنے کارخانے کی تاریخ لکھ رہے ہیں جس کی اشاعت سوویت اقتدار کی پچاسویں سالگرہ پر عمل میں آئیگی۔ انہوں نے مجھ سے اپنی کتاب کا پیش لفظ لکھنے کو کہا ہے جو میں بخوشی لکھ رہا ہوں۔

پوتیلوف (کیروف) کارخانے کی تاریخ ان لوگوں نے بنائی ہے جیسے کہ میخائل گوریلووچ الکسیئف جو وہاں کے سب سے معمر توپساز ہیں جنہوں نے اس کارخانے کی کارگاہوں میں ساٹھ برس کام کیا ہے، جیسے نکولائی واسیلیوچ اسکوورتسوف جو پہلے تو بالٹک بیڑے کے ملاح تھے اور پھر ان پچیس ہزار میں سے ایک ہوئے جو اجتماعی‌فارم کے صدر بنے اور اس کے بعد پھر سے صنعتی مزدور بن گئے، جیسے ریتائی کی مشین کے آپریٹر یوگینی ساوچ اور ایوان لیونوف جنہوں نے اپنی اپنی وضع کے کاموں میں جدتیں کی ہیں، جیسے سوویت یونین کے ہیرو فیودور دیاچینکو جو پچھلی جنگ میں ایک مشاق نشانہ‌باز تھے، اور ان جیسے سینکڑوں، ہزاروں لوگ۔ اس کارخانے کی تاریخ مزدور طبقے کی نسلوں کی تاریخ ہے جنہوں نے انقلاب کی تکمیل کی، جنگ میں اپنے ملک کی عزت اور آزادی کی حفاظت کی اور اب کمیونزم کی تعمیر کر رہے ہیں۔

سوویت عہد حکومت کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر فیکٹریوں اور کارخانوں کے متعلق صرف یہی کتاب نہیں جو چار سرکاری تمغوں سے سرفراز کیروف کارخانے کے متعلق لکھی گئی ہے بلکہ اس طرز پر لکھی ہوئی اور کتابیں بھی نظر آنی چاہئیں۔

میں ''پراودا،، اور مزدوروں کے اخبار ''ترود،، کے ذریعے تمام مزدور نامہ‌نگاروں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنے اپنے کارخانوں کی تاریخ مرتب کریں۔ مزدور طبقے کی عظمت و شان کے متعلق کتابوں کی سخت ضرورت ہے۔ مصنف اور صحافی جتنی ہو سکیگی ان کی مدد کرینگے۔

۱۹۶۳ء

محنت اور آرٹ کے درمیان
زیادہ مضبوط اتحاد عمل کے لئے

پیارے ویشنسکایا والو، پیارے کیروف والو، ہمارے اچھے دوستو اور ہمارے خوش آئند مہمانو!

ویشنسکایا میں آپ کے قیام کا یہ آخری دن ہے، ڈان کی سرزمین پر آپ کا آخری دن۔ کل آپ وسطی ڈان کے لئے روانہ ہوجائیں گے اور وہاں سے دریا کے دہانے پر۔ مجھے معلوم ہے کہ ہر جگہ آپ کا خیرمقدم پیارے اور معزز مہمانوں کی طرح کیا جائیگا کیونکہ آپ کی ذات میں ڈان لینن کے عظیم شہر اور مشہور کیروف کارخانے کے نمائندوں کو اعزاز بخش رہا ہوگا۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ ساحل ڈان کا کوئی گاؤں اور کوئی شہر اپنے خیرمقدم کی پرخلوص گرمجوشی میں ہمیں مات نہ کر سکیگا۔ یہ دعوی کرنے کے میرے پاس خاص اسباب موجود ہیں۔ سب سے پہلے تو ویشنسکایا کے لوگوں کا ایک جتھہ ۱۹۶۱ء کے شروع میں آپ کا مہمان ہوکر لینن گراد گیا تھا اور مہمانداری میں ہم آپ کے مقروض تھے۔ اور دوسرے، ہماری دوستی تین یا چار سال پہلے نہیں بلکہ قریب چونتیس سال ہوئے شروع ہوئی تھی جب آپ کا مزدور ساتھی سیمیون ڈاویدوف میری کتاب کے صفحات سے زندگی کے بیچ منجدھار آیا تھا تاکہ کھیتی باڑی اجتماعی کرنے کو عملی جامہ پہنانے میں پارٹی کی مدد کرے۔

اس کا ذکر میں شاید بہت زیادہ مرتبہ کر رہا ہوں مگر اس لئے نہیں کہ اپنی ادبی انانیت کی تسکین کروں بلکہ محض اس بات پر زور دینے کے لئے کہ آپ کی دوستی میں ہم سبقت کے دعویدار ہیں۔ اور ہم نے آپ کی ۱۹۶۱ء کی پرجوش مہمان‌نوازی کا دو چند جوش و خروش سے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

پچھلے چند برسوں میں میرے گھر بہت سارے مہمان آئے ہیں۔ غیرملکی بھی۔ کون ہے جس کے قدم ہمارے ویشنسکایا کی سرزمین پر نہ آئے ہوں! جرمن، انگریز، ناروے کے باشندے، سویڈن، ڈینمارک، فنلینڈ اور بہت سے دوسرے ملکوں کے لوگ۔ میرے پیشے کا تقاضا ہے کہ دنیا کے بہت سے ملکوں کے ادیبوں اور ناشروں کی مہمانداری کروں۔ ان حضرات سے جن کے سیاسی نظریات میرے خیالات سے ہم‌آہنگ ہیں میری واقعی اچھی دوستی ہو گئی ہے۔ لیکن خوش اخلاقی سے خیرمقدم کرنا ایک چیز ہوتی ہے اور اپنے دل کی گہرائیوں سے استقبال کرنا دوسری۔ پیارے کیروف والو، ہم نے تمہارا اسی طرح خیرمقدم کیا ہے — اپنے دل کی گہرائیوں سے۔

دیکھئے، کیروف کارخانے کے مزدور طبقے نے ہمارے پاس اپنا کیسا شاندار دستہ بھیجا ہے۔ یہاں تین نسلوں کے لوگ آئے ہیں اور ان سب سے ایک ایک کرکے سب ممتاز شخصیت ہیں۔ اگرچہ تعارف ہو چکے ہیں مگر میرے گاؤں والوں کو ممکن ہے ان کے سارے نام یاد نہ ہوں۔ نکولائی واسیلیوچ اسکوورتسوف کو لیجئے۔ کیا وہ داویدوف کی وضع کے نہیں ہیں؟ ان کے حالات زندگی تک ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں: اسکوورتسوف بھی بالٹک کے بیڑے کے ملاح تھے، اور ۱۹۳۰ء میں وہ بھی پچیس ہزار میں سے ایک تھے اور وہ بھی اجتماعی فارم کے صدر مقرر ہوئے تھے، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ فارم علاقۂ کالینن میں تھا یہاں نہیں۔

یہ ضرور ہے کہ ان چونتیس برسوں نے کتاب کے مصنف اور داویدوف ثانی دونوں کو کچھ معمر کردیا ہے، ان کے بالوں میں سفیدی کی تحریر آگئی ہے۔ لیکن اگر ہمارے ملک کو ضرورت ہوئی تو ہم صفوں میں آن کر کام کرنے کو یا دفاع میں حصہ لینے کو تیار ہیں۔ اور محنت اور آرٹ میں اتحادعمل سے ہماری یہی مراد ہے۔ ایک اور پیارے مہمان کے متعلق میں کچھ کہنا چاہوں گا — وہ ہیں میخائل گوریلووچ الکسیئف۔ جیسا کہ آپ خود دیکھ سکتے ہیں اب وہ نوجوان نہیں ہیں۔ لیکن دیکھئے صنعت میں ساٹھ سال کام کرنے کے بعد انسان کیا کچھ ہو جاتا ہے! مجھے رازداری میں کسی نے بتایا ہے کہ اب بھی وہ جہاں جاتے ہیں خواتین کا جمگھٹ لگا لیتے ہیں۔

کیروف والوں کے ساتھ ہی ساتھ ماسکو اور روستوف سے کچھ مصنف دوست بھی میرے ہاں ٹھیرے ہوئے تھے۔ مچھلی کا شکار کھیلنے، دریا میں نہانے اور جام صحت پینے کے ساتھ ساتھ ہم نے اہم معاملوں پر تبادلۂخیالات بھی کیا۔ کیروف والوں نے ہم پر اپنے قطعی قانونی حق جتانے اور الزام عائد کیا کہ ہم نے آج کل کے حالات کے متعلق اور مزدور طبقے کے متعلق بہت کم کتابیں لکھی ہیں۔

شروع شروع میں تو مصنفوں نے ہر طرح سے اپنے بچاؤ کی تابڑتوڑ کوششیں کیں اور اپنے مورچے پر ڈٹے رہے۔ لیکن پھر کیروف والوں کی کثیر فوج کے مقابلے کی تاب نہ لاکر، جیسے کہ جنگی مراسلوں میں کہا جاتا ہے، یا یوں کہنا چاہئے کہ ان کے معقول دعووں کے دباؤ کے تحت، مصنفین مجبور ہوئے کہ پسپا ہوجائیں۔ واقعی ہم مزدور طبقے کے بارے میں بہت تھوڑا لکھتے ہیں۔ مگر یہ اتنی سادہ بات نہیں ہے جتنی کہ کسی ناآشنا کو معلوم ہو۔ مجھے یقین ہے کہ مزدوروں اور ادیبوں کی اس

سٹینیٹر سے ہمیں بےحساب فائدہ پہنچیگا۔ میں نہایت غوروفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایسی دوستانہ ملاقاتیں جن کے دوران ہم مزدوروں سے آرٹ کے متعلق اپنے نظریات پر مبنی تبادلۂخیالات کرسکیں اور اس امر پر بھی کہ دیرپا قدروقیمت کی، سیاسی اعتبار سے پختہ اور فنی خوبیوں کے اعتبار سے ممتاز اور معیاری کتابیں کیسے تصنیف کی جائیں — ایسی دوستانہ ملاقاتیں انتہائی ضروری اور اہم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہماری پیشقدمی کی نہ صرف ہمارے روستوف کے مصنفین بلکہ ماسکو، لینن گراد اور غالباً ملک میں ہر جگہ کے ادیب تقلید کریں گے۔ میں حد سے زیادہ خوداعتمادی کا تو اظہار نہیں کرنا چاہتا لیکن ہم نے ایک اچھی چیز کی ابتدا کی ہے اور ہماری باہمی خواہش اور مزدور طبقے سے ہمارے تخلیقی تعاون کے نتیجے میں اچھی کتابیں منظر عام پر آسکیں گی۔ عوام کا، خواہ وہ آرٹ کے میدان عمل میں کام کر رہے ہوں یا صنعت میں ہمارا عام اتحاد، ہمارا سیاسی اتحاد، اور ہمارا اخلاقی اور روحانی اتحاد اس کی ضمانت کرےگا۔ اور اس لئے میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیروف کارخانے کے مزدوروں کو یقین دلا دیں کہ اس قسم کی کتابیں واقعی ضرور لکھی جائیں گی۔

کیروف والے میرے مہمانوں نے مجھے جو تحفے دئے ہیں ان میں سب سے بیش بہا یقینی طور پر کمیونسٹ کارگر کانگار کا خطاب اور کیروف کارخانے کا پاس ہے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ کیروف والے بڑے ہی سیانے ہیں اور یہ پاس جو تحفے میں دیا ہے اس میں بھی بڑا راز ہے۔ ان کے جی میں کیا ہے یہ مجھے قریب قریب معلوم ہوگیا ہے: آپ جس وقت، جس دن جی چاہے ہمارے کارخانے میں آئیے ہمیں اور ہمارے کام کو اچھی طرح سمجھئے اور قدرتی بات ہے کہ یہ سب کچھ اتنا سحرکن ہوگا کہ آپ چاہیں گے کہ فوراً بیٹھ جائیں اور اس کے متعلق لکھ ڈالیں۔ میرے پیارے ساتھیو، میں نے کبھی بھی یہ حلف نہیں لیا کہ صرف زراعت یا جنگ کے موضوعات پر ہی قلم اٹھاؤں گا! پرانے زمانے کی سہانی یادیں میں نے فراموش نہیں کی ہیں اور ممکن ہے اب بھی میں دوسرے موضوعات پر لکھنے بیٹھ جاؤں۔

اچھا تو پھر آئیے ہم اپنے مہمانوں کے لئے بخیر و عافیت سفر کی دعا کریں اور انہیں یقین دلائیں کہ یہاں ویشنسکایا میں اور یوں تو ڈان دیس میں ہر جگہ ان کا ہمیشہ پرجوش خیرمقدم ہوگا۔

۱۹۶۴ء

روسی فیڈریشن کے مصنفوں کی دوسری کانگرس میں افتتاحی تقریر

ساتھیو!

روسی مصنفوں کی دوسری کانگرس کا آغاز کرنے کا اعزاز اور نہایت ذمہ‌داری کا فرض مجھے سونپا گیا ہے۔

یہ جانتے ہوئے کہ سوویت یونین اور غیرممالک کے کروڑوں لوگوں کی توجہ ہمارے عظیم روسی ادب کی اور روس کی وسیع و بسیط سرزمین پر نشو و نما حاصل کرنےوالے بہت سے شاندار ادیبوں کی نمائندگی کرنےوالے مصنفوں کے اس اجتماع پر مرکوز ہے، مجھے خوشی بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ قدرے پریشانی بھی۔

مجھے قوی یقین ہے کہ ہماری کانگرس کی کارروائی دنیا کی رائے عامہ اور خصوصاً اخبارات کی نظروں میں ضرور آئیگی۔ ظاہر ہے کہ ہمیں تیار رہنا اور محسوس کرنا چاہئے کہ صرف ہمارے دوست ہی نہیں، جو خلوص کے ساتھ ہماری کامیابیوں پر خوش ہوتے اور ہماری ناکامیوں پر اظہار ہمدردی کرتے ہیں، اس واقعہ سے متاثر ہوں گے بلکہ ہمارے دشمن بھی جو یقینی طور پر ہمارے کام پر حاشیہ‌آرائی کریں گے۔ میرے ذہن میں وہ حضرات ہیں جن کا ہمارے معاملات کے بارے میں افواہیں پھیلانا محبوب مشغلہ ہے۔

خیر چھوڑیئے، ان کی پرواہ مت کیجئے۔ ہمارے سامنے بےشمار مسئلے ہیں جنہیں ہمیں اس کانگرس میں صاف صاف زیربحث لانا اور کاروباری انداز میں جن پر غور کرنا چاہیئے۔ یہ بات میں اس چیز کا پہلے سے اندازہ لگا کر کہہ رہا ہوں کہ جو ممکن ہے اس طرح ہمارے لوگوں، کروڑوں قارئین کے ذہن میں آئے: ہمارے مصنفین بیٹھ کر لکھنے کے بجائے خواہ مخواہ جلسے کیوں کرتے ہیں جبکہ انہیں اتنا سارا کچھ کرنا پڑا ہے اور ویسے بھی ہمارے ہاں بےشمار تو جلسے ہوا کرتے ہیں؟

عوام کی رائے ایک ایسی چیز ہے جس کی ہم مصنفوں کو سب سے زیادہ قدر کرنی چاہئے۔ ہم میں سے ہر ایک کی زندگی اور کوششوں کو اگر عوام کا اعتماد اور اس حقیقت کا تسلیم کیا جانا نہیں تو پھر اور کیا حق بجانب قرار دے سکتا ہے کہ ہم اپنی ساری قوتیں اور صلاحیتیں عوام پر، پارٹی پر، اپنے ملک پر نچھاور کر دیتے ہیں؟

میرا عقیدہ ہے کہ اپنے سماج کی زندگی میں فنکار دانشور کے مسئلے کی،

اگر اس قسم کا مسئلہ واقعی موجود ہے تو اس کی، کنجی ہمیں یہیں تلاش کرنی چاہیئے... سچ پوچھئے تو میں بعض اوقات سوچتا ہوں کہ اس مسئلے کو ہم نے حد سے زیادہ بڑھا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑی ہی اچھی بات ہے کہ فکر کے ساتھ برتاؤ کیا جائے، بڑھنے میں مدد دی جائے، ڈھارس بندھا کر دل بڑھایا جائے، لیکن کیا ہم سوویت دانشوروں میں سے ہر ایک پر جنہیں پارٹی اور عوام نے پروان چڑھایا، یہ لازم نہیں آتا کہ اپنی باری میں ہر اس چیز کی بڑی احتیاط اور فرزندانہ محبت سے نگہداشت کریں جو ہمارے عوام نے، ہماری پارٹی نے اور ہماری اپنی سوویت حکومت نے نصف صدی کی دشوار جدوجہد کے بعد حاصل کیا ہے؟

اگر کوئی میری ذاتی رائے پوچھئے تو میں یہی کہوں کہ ہمارے ملک میں دانشوروں کا مسئلہ بڑی سادگی سے حل ہو جاتا ہے: بس لینن کی پارٹی کے وفادار سپاہی رہو، اور چاہے کمیونسٹ ہو یا بے پارٹی، اپنی تمام تر قوت، اپنی روح تک عوام پر وقف کردو، عوام کی زندگی میں، اس کی تمام تر مسرتوں اور مشکلوں کے ساتھ، حصہ بٹاؤ اور بس ''مسئلہ،، ختم ہو گیا۔

ہمیں یہاں ماسکو میں چند روز ایک ساتھ گذارنے ہوں گے۔ ہمیں سر جوڑ کر بیٹھنا اور کام کرنا ہوگا، اور کام بھی بڑی محنت کے ساتھ۔ اور سوویت ادب کے مفاد کے لئے ان چند دنوں میں زیادہ سے زیادہ کچھ حاصل کرنے کی غرض سے ہمیں پہلے ہی سے اس بات پر متفق ہو جانا چاہئے کہ ہم نیک ارادوں کے ساتھ، فوجی بھائیوں کی طرح کام کریں گے اور چھوٹی چھوٹی تکلیفوں اور غلطفہمیوں کو بھول جانے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں اپنے ذہن میں اس خیال کو سب پر سبقت دینی چاہئے جو ہم سب کو متحد کرتا ہے — اپنے عظیم سوویت ادب کی مزید ترقی کی فکر۔ پارٹی اور پورا ملک ہم سے یہی آس لگائے ہوئے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میری مراد کیا ہے: میں آپ سے یہ نہیں کہہ رہا کہ ایک دوسرے کو گلے لگالیں اور تمام غلطیوں کو معاف کر دیں۔ دوست بنکر رہنا سب ٹھیک ہے مگر ہمارے ادبی، نظریاتی معاملے اصولی ہوتے ہیں جن سے احتراز اپنے عزیزترین دوست کا بھی معاف نہ کرنا چاہئے۔ ہمارا اتحاد حقیقی معنوں میں اسی وقت ٹھوس ہوگا جب کہ ہم ایک دوسرے کی غلطیوں کو نظرانداز کرنا ترک کردیں اور لگی لپٹی کچھ نہ رکھیں۔ اگر اب بھی کوئی چیز ایسی ہو جو معمول کے مطابق کام کرنے اور معمول کے مطابق ادب کی

نشوونما کے راستے میں حائل ہوتی ہو تو ہمیں چاہئے کہ اس کو سمیٹ کر اپنے راستے سے ہٹا دیں۔ اگر ہم میں اب بھی کچھ ایسے لوگ ہیں جو کبھی کبھار اعتدال‌پسندی کو منہ لگا لیتے ہوں اور نظریاتی جدوجہد میں موقع‌پرستوں کا کھیل کھیلتے ہوں تو ہمیں صاف صاف، ان کے منہ پر کہدینا چاہئے ان کے متعلق ہماری کیا رائے ہے۔

سخت تنقید کرنے سے پہلو بچانے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے کیونکہ ہماری ذمہ‌داری اتنی بڑی ہے اور ہمیں جس نصب‌العین کا ذمہ‌دار ٹھہرایا گیا ہے وہ اتنا اہم ہے کہ ہم اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

قدرتی بات ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے کچھ شدید مسئلے ہیں اور تقریر کرنےوالوں میں سے ہر ایک یقیناً انہیں چھیڑنا چاہیگا اور خود اپنی ادبی تنظیم کے معاملات اور پریشانیوں کے بارے میں حاضرین جلسہ کو بتانا چاہیگا۔ لیکن میں آپ سے اس نکتے پر خاص طور سے زور دینے کی اجازت چاہتا ہوں — سب سے اہم چیز یہ ہے کہ اپنی خاص سمت کو، اپنے خاص موضوع کو آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیں یعنی ادب اور عوام کی زندگی، ادب اور کمیونزم کی تعمیر۔ اگر آپ اور ہم اس اونچے سر کو برقرار رکھ پائیں تو گیت کی دھن بہت خوب رہیگی اور ہماری کانگرس وقتی ادبی واقعہ بن کر نہ رہ جائیگی بلکہ ان لوگوں کا ایک کارآمد اجتماع ہوگی جو زندگی اور ہمارے فن پر سنجیدگی سے غوروفکر کرتے ہیں۔

غیر ممالک میں ہم سے اکثر دریافت کیا جاتا ہے — بعض بدباطنی کے ساتھ پوچھتے ہیں اور کچھ واقعی سمجھنے کی غرض سے کہ — سوشلسٹ حقیقت‌پسندی اصل میں ہے کیا؟ میں یہ جرأت تو نہیں کرونگا کہ اپنے شان کے نظریات‌دانوں کو ان کی روزی سے محروم کردوں اور اس کے علاوہ علمی نکات مرتب کرنے میں مجھے ویسے بھی کوئی ملکہ حاصل نہیں ہے۔ لیکن اس کے جواب میں جو کچھ میں کہا کرتا ہوں وہ یہ ہے: سوشلسٹ حقیقت‌پسندی زندگی کی سچائی منعکس کرنے کے طریقے کو، لیننی جانبداری کے نقطۂ نظر سے فن‌کار سچائی کو جس طرح سمجھتا اور جس طرح وہ اس کی ترجمانی کرتا ہے اس طرح اس کو پیش کرنے کے طریقے کو کہتے ہیں۔ اور بھی سیدھے سادے الفاظ میں کہیں تو یہ ایک ایسا طریقہ ہے جو ایک نئی دنیا کی تعمیر میں لوگوں کی عملاً مدد کرتا ہے۔

جو لوگ یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ سوشلسٹ حقیقت‌پسندی کیا ہے، ان کو سوویت ادب کی تقریباً نصف صدی کی تاریخ پر تفصیل سے غور

کرنا چاہیئے۔ اس ادب کی تاریخ وہی سوشلسٹ حقیقت پسندی ہے جس کا اظہار ہیروؤں کے جیتے جاگتے کرداروں اور عوامی جد و جہد کی بین تصویروں میں ملتا ہے۔

آج جب ہم مستقبل پر غوروفکر کررہے ہیں تو ہمیں اپنے دماغ کی کھڑکیاں کھول لینی چاہئیں تاکہ وہ شاندار راستہ صاف نظر آنے لگے جس پر سے ۵۰ برس کے دوران سوویت ادب کا اور خاص طور سے روسی ادب کا جو اس کا ایک خاص دستہ ہے، پورا قافلہ ہو کر گزرا ہے۔ ہم نے جو دولت اکٹھی کرلی ہے وہ بے پناہ ہے۔ ہمارے پاس جو ذخیرہ ہے وہ قابل فخر ہے، اور جس کو ہم بےنتیجہ پرشور تجریدیت کے مقابلے میں پیش کرسکتے ہیں۔ اور اگرچہ ہم غور کر سکتے ہیں کہ عوام کے اعتماد کو حق بجانب قرار دینے کے لئے ہمیں اب بھی کتنا کچھ کرنا باقی ہے، اور اگرچہ ممکن ہے کہ ہم اب بھی اپنے کام سے غیرمطمئن ہوں، لیکن نوع انسانی کی روحانی قدروں کے خزانے میں ہمارے ادب نے جو اضافہ کیا ہے اس کو اور دنیا میں ہر جگہ اسے قطعی سند کا جو درجہ حاصل ہے اسکو کبھی ہرگز فراموش نہ کرنا چاہئے۔

پیارے ساتھیو!

روسی فیڈریشن کے ادیب ہی سوویت یونین میں سب سے پہلے خود اپنی کانگرس منعقد کر رہے ہیں۔ جمہوریائی سطح پر ایسی دوسری کانگرسیں بعد میں ضرور ہوں گی۔ بڑی ہی اچھی بات ہوگی کہ ہم، روسی، ادب کے مسائل کا سنجیدہ، کاروباری قسم کا مباحثہ بنائیں۔ مجھے اعتماد ہے کہ ہم ایسا ہی کریں گے۔

اس امید کے ساتھ میں روسی فیڈریشن کے مصنفوں کی دوسری کانگرس کے آغاز کا اعلان کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

۱۹۶۵ء

اظہار شکریہ

باوجودیکہ مجھے خوشامد سے سخت چڑ ہے، مگر میں مغلوب ہو کر رہ گیا ہوں، اور ان تین دنوں میں مجھے ایسا لگنے لگا ہے کہ جیسے دس سال اور بوڑھا ہوگیا ہوں۔ چنانچہ اسے میری ساٹھویں نہیں بلکہ سترویں سالگرہ بھی کہا جا سکتا تھا...

لیکن سنجیدگی کے ساتھ عرض کروں تو میں ان تمام حضرات کا

جنہوں نے میری سالگرہ کے اجتماع میں شرکت کرکے میری عزت‌افزائی فرمائی اور اپنے ان بہت سارے قارئین کا جو یہاں موجود نہیں ہیں، شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

میں ہر اس فرد بشر کا شکرگذار ہوں جس نے اس طویل ساٹھ سالہ سفر میں اپنی دلی گرمجوشی سے میری مدد کی۔ مجھے جو اعلی انعام ملا ہے اس کے لئے میں اپنی سوویت حکومت کا تہ‌دل سے احسان‌مند ہوں۔

آپ سب کا شکریہ!

۱۹۶۵ء

"پراودا" کے نامہ‌نگار سے انٹرویو

نوبل انعام جیتنے پر آپ کو کیسا لگا؟

قدرتی طور پر خوشی ہوئی کہ مجھے نوبل انعام دیا گیا ہے مگر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے احساسات کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کیجئے: مجھے ایک فرد کا، پیشہ‌ور مصنف کا جس کے کام کی بین‌الاقوامی قدر شناسی ہوئی ہو، اطمینان قلب نہیں ہے۔ میرے جذبات پر اس پرمسرت احساس کا غلبہ ہے کہ میں نے اپنے ملک، اس پارٹی کی جس کی صفوں میں شامل ہوئے مجھے اپنی زندگی کے آدھے حصے سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور یقیناً اپنے سوویت ادب کی شان میں اضافہ کرنے کے لئے کچھ کیا ہے، چاہے تھوڑا ہی سا کچھ کیا ہے۔ اپنے ذاتی جذبات کی بہ‌نسبت یہ میرے لئے زیادہ اہم ہے۔

یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ ناول کی صنف نے، جس کی بعض ادبی ہستیوں نے جدید دنیا میں وجود کے جائز ہونے پر ہی شبہات کا اظہار کیا ہے، اپنے وجود کے حق بجانب ہونے کو منوالیا ہے۔ سلیقے سے لکھی ہوئی کتاب کی زندگی طویل ہوتی ہے اور کسی زندہ ہستی کے وجود سے بلاسبب انکار نہیں کیا جاسکتا۔

آپ کو یہ خبر کیسے ملی؟

سویڈن کے صحافیوں کے بھیجے ہوئے ایک تار سے۔ لیکن یہ اطلاع مجھے دیر میں ملی۔ یہ تار فورمانوف ضلع پارٹی کمیٹی کے سیکریٹری کامریڈ میندالیئف نے مجھے پہنچایا جنہوں نے اطلاعی مرکز سے ۱۴۰ کلومیٹر دور جا کر مجھے ڈھونڈ نکالا۔ سویڈن کی شاہی اکاڈمی کو بذریعہ

تار جواب دینے کے لئے مجھے قدرے مخدوش موسم میں یورالسک تک پرواز کرنی پڑی۔ لیکن بحیثیت مجموعی ۱۵ اکتوبر میرے لئے بڑا ہی مبارک دن تھا۔ میں صبح تڑکے ہی سے بیدار ہوگیا اور اپنے ناول کے پہلے حصے کے اس باب کو لکھ لیا جس کی نشست میں کسی طرح چستی آ ہی نہیں رہی تھی (یہ وہ باب ہے جس میں نکولائی استریلتسوف سے اس کا بھائی ملنے آتا ہے جو ایک جرنیل ہے جس کا نمونہ میں نے جرنیل لوکین کی شخصیت کو بنایا ہے)۔ تیسرے پہر مجھے نوبل انعام کے بارے میں معلوم ہوا اور شام کو میں نے دو نہایت نفیس مرغابیاں ماریں دو گولیاں چلا کر (اور یہی دو فائر کئے تھے)۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ بندوق کی مار کی آخری حد کے فاصلے پر۔ جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں ایسا نشانہ شاذ و نادر ہی ٹھیک بیٹھتا ہے۔

اور اس انعام نے آپ کی زندگی کے موجودہ مقررہ نظام پر کیا اثر ڈالا ہے؟

اب تک آپ کو معلوم ہو جانا چاہئے تھا کہ مجھے اپنی نشست سے اکھاڑنا چنداں آسان نہیں۔ حسب معمول میں کام کرتا، آرام کرتا، لزیز قزاخی کومس* پیتا اور کبھی کبھی جب میں مرغابی کے شکار کو جاتا ہوں اور مارے سردی کے جب خون تک جم جاتا ہے تو قزاخستانی ”اراکا“ کا ایک گلاس پینے کی جسارت بھی کرلیتا ہوں۔ اسٹاک ہام سے واپسی کے بعد میں ”وطن کے مجاھد“ کا پہلا حصہ مکمل کرلوں گا۔ مجھے پکا یقین ہے کہ کرلوں گا۔ تو سب کچھ ٹھیک ہے!

قزاخستانی میدان ممکن ہے سنسان نظر آتے ہوں مگر یہاں، جیسے کہ سارے ملک کی کیفیت ہے، زندگی پوری آب و تاب سے موجزن ہے۔ خزاں کی ہلائی کے لئے زمین کے آخری ہیکٹر — منصوبے سے تجاوز کرنے کے بعد — توڑے جا رہے ہیں، دشوار سرما کے لئے گڈرئیے تیاریاں کر رہے ہیں، کاشتکاری کی مشینیں چلانے والے — علاقے کے بہترین مشینیں چلانے والے — اپنے تجربے سے ایک دوسرے کو مستفید کرنے جمع ہو رہے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی لوگ ملک کی معاشی اور تہذیبی ترقی کے لئے پارٹی کی فکرمندی سے جوش و خروش حاصل کرکے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ کمیونزم کی تعمیر کرنے والی اس طاقتور جمعیت کا خود کو ایک ننھا ذرہ محسوس کرکے میں مگن ہو جاتا ہوں۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۶۵ء

---

* کومس گھوڑی کے دودھ کو کہتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

حقیقت پسندی کی جاندار قوت

اس اہم موقع پر میں ایک بار پھر سویڈن کی شاہی اکیڈمی کا شکریہ ادا کرنا اپنا خوشگوار فرض تصور کرتا ہوں کہ اس نے مجھے نوبل انعام دیا۔

میں پہلے ہی برسر عام بیان کرچکا ہوں کہ اس اعزاز سے مجھے محض اس لئے ہی مسرت حاصل نہیں ہوئی کہ یہ میری پیشہ ورانہ خوبیوں یا مصنف کی حیثیت سے جو خوبیاں مجھ سے مخصوص ہیں ان کی بین الاقوامی قدرشناسی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ یہ انعام ایک روسی، ایک سوویت مصنف کو ملا ہے۔ میرے ملک میں بہت سارے مصنف ہیں اور یہاں میں ان کی نمائندگی کر رہا ہوں۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، میں اس لئے بھی خوش ہوں کہ یہ انعام چاہے بالواسطہ ہی سہی، ناول کی صنف کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ پچھلے دنوں مجھے اکثر ایسے دعوے پڑھنے اور سننے کا موقع ملا ہے، جن سے سچ تو یہ ہے کہ میں حیران رہ گیا، کہ ناول کی صنف فرسودہ ہوگئی ہے اور اب اس میں جدید تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ناول ہی مصنف کو اس بات کا موقع فراہم کرتا ہے کہ دنیا کی نہایت ہی جامع تصویر پیش کر سکے اور اس حقیقت کی اور اس کے اہم مسئلوں کی جانب خود اپنے رویے کا اور اپنے ہمخیال لوگوں کے رویے کا بھی اظہار کر سکے۔

کسی اور صنف سے زیادہ ناول ہی مصنف کے لئے اس بات کی گنجائش پیدا کر سکتا ہے کہ وہ کائنات کے مرکز کی حیثیت سے خود اپنے مختصر سے وجود کو پیش کرنے کے بجائے، ہمارے اطراف و جوانب کی زندگی کی وسعتوں کی چھان بین کر سکے۔ اپنی خود نوعیت کے اعتبار سے یہ صنف حقیقت پسند مصنف کو عمل کا وسیع ترین میدان فراہم کرتی ہے۔

آرٹ میں بہت سے جدید رجحانات حقیقت پسندی کو اس وجہ سے مسترد کر دیتے ہیں کہ گویا وہ اپنا وقت پورا کر چکی ہو۔ میں قدامت پسندی کا تصوروار ٹھیرائے جانے کے خوف سے بے نیاز ہوکر دعوی کرتا ہوں کہ میری رائے اس کے بالکل برعکس ہے اور میں حقیقت پسند آرٹ کا قائل اور علمبردار ہوں۔

جدیدی ادب کے متعلق بہت باتیں ہوتی ہیں، اور لوگوں کے ذہن میں خاص طور پر ہیئت کے دائرے میں تجربات کرنے کی بات ہوتی ہے۔

میری رائے میں حقیقی جدیدی وہ ادیب ہوتے ہیں جو اپنی تصانیف میں ہمارے دور کی زندگی سے مخصوص لئے خدوخال، تعلقات اور رویے پیش کریں۔

حقیقت‌پسندی کی اور بطور خود حقیقت‌پسند ناول کی بنیاد ماضی کے باکمالوں کے تجربے پر استوار ہوتی ہے۔ لیکن ارتقاء کے دوران میں اس کے نقوش بنیادی طور پر نئے اور نمایاں طور پر جدید ہو جاتے ہیں۔ میں اس حقیقت‌پسندی کا ذکر کر رہا ہوں جس میں زندگی کو نیا کرنے اور اس کو انسان کے فائدے کے لئے از سر نو منظم کرنا مضمر ہوا کرتا ہے۔ میں یقیناً اس چیز کا تذکرہ کر رہا ہوں جسے ہم سوشلسٹ حقیقت‌پسندی کہتے ہیں۔ اس میں انوکھاپن یہ ہے کہ یہ ایک ایسے عالمی نقطۂنظر کا اظہار کرتی ہے جو نہ تو گیان‌دھیان پر ایمان رکھتا ہے، نہ حقیقت سے فرار پر بلکہ جو لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ نوع انسانی ترقی کےلئے جدوجہد کریں، انہیں ان مقاصد کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جن کی کروڑوں لوگ حمایت کرتے ہیں اور جو ان کے لئے اس جدوجہد کی راہیں روشن کرتا ہے۔

نوع انسانی ان بےشمار افراد میں منقسم نہیں ہے جو بےوزنی کی حالت میں ارضی کشش جرثقل سے باہر نکل جانےوالے خلابازوں کی طرح تیرتے پھر رہے ہوں۔ ہم کرۂارض پر رہتے ہیں، ہم ارضی قوانین کے تابع ہوتے ہیں۔ کرۂارض کی آبادی کے ایک بڑے طبقے کے مفادات مشترک ہوتے ہیں اور وہ ایک ہی منزل پر پہنچنا چاہتے ہیں اور اس کی تگ‌ودو انہیں منتشر کرنے کے بجائے متحد کرتی ہے۔

یہ طبقے محنت‌کش عوام کے ہیں جو اپنے ہاتھوں اور اپنے ذہن رسا سے سب کچھ پیدا کرتے ہیں۔ میں ان مصنفوں میں سے ہوں جو محنت‌کش عوام کی بلاتامل خدمت کرنے کے قابل ہونے کو اپنےلئے اعلیٰ‌ترین اعزاز اور افضل‌ترین آزادی تصور کرتے ہیں۔

ہر چیز یہیں سے عود کرتی ہے۔ یہیں سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جدید دنیا میں آرٹسٹ کے مقام کی تصویر میرے یعنی ایک سوویت ادیب کے ذہن میں کیا ہے۔

ہم ایک متلاطم عہد میں رہتے ہیں۔ لیکن دنیا کی کوئی بھی قوم ایسی نہیں ہے جو جنگ چاہتی ہو۔ ایسی قوتیں ضرور موجود ہیں جو پوری کی پوری قوموں کو جنگ کے شعلوں میں جھونک دیتی ہیں۔ کیا کسی مصنف کا دل جلتے ہوئے ان کھنڈرات کی آہ‌وبکا کی طرف سے کان

بہرے کر سکتا ہے جن میں دوسری عالمی جنگ نے وسیع و بسیط علاقوں کو تبدیل کردیا تھا؟ کیا کوئی بھی دیانتدار ادیب ان لوگوں کے خلاف آواز اٹھائے بغیر رہ سکتا ہے جو نوع انسانی کو اپنی تباہی آپ ہی لانے کی ڈگر پر لگا دینا چاہتے ہیں؟

تو پھر ایک ادیب کا جو اپنے آپ کو ایک طرح سے دیوتاؤں میں شمار کرنے نہیں لگ جاتا اور متصادم قوتوں کے معرکے سے بلند اولیمپانی بلندیوں پر نہیں پہنچ جاتا اور جو انسانی مصائب وآلام کے معاملے میں غیرجانبدار نہیں رہتا بلکہ اپنی قوم کا سپوت اور نوع انسانی کا ایک ننھا سا ریزہ تصور کرتا ہے، اس کا فریضہ کیا ہے؟

اس کا فرض ہے کہ وہ پڑھنے والے سے ایمان کی بات کہے، لوگوں کو حقیقت سے، ممکن ہے تلخ حقیقت لیکن ہمیشہ جرأت آزما حقیقت سے آشنا کرے۔ عوام کے دلوں میں مستقبل اور اس مستقبل کی تعمیر کی صلاحیت میں یقین کو تقویت پہنچائے۔ دنیا میں امن کےلئے جہاد کرے اور ہرجگہ، جہاں تک اس کی آواز پہنچ سکے ایسے مجاہدوں کی ہمت‌افزائی کرے۔ عوام کو ترقی کےلئے اپنی فطری اور باعزت جستجو میں متحد کرے۔

آرٹ میں لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کرنے کی قوت ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ فنکار کہلانے کا حق ان مصنفوں کو پہنچتا ہے جو اس تاثر کو نوع انسانی کی بھلائی کےلئے، اور لوگوں کی روح میں حسن کی ایک دنیا تخلیق کرنے کےلئے استعمال کرتے ہیں۔

میری اپنی قوم نے اپنی تواریخی پیشقدمی میں پیش پاافتادہ راہ اختیار نہیں کی۔ ہم نے نئی راہیں روشن کیں، ہم پیش رو تھے۔ ایک مصنف کی حیثیت سے میرا فرض، جیسا کہ میں نے اسے ہمیشہ سمجھا ہے یہ ہے کہ اب تک جو میں نے لکھا ہے اور آئندہ جو کچھ لکھوں گا اس سے اپنے سوویت عوام کو — جفاکش، خلاق، جانباز عوام کو جنہوں نے کبھی بھی کسی پر فوج کشی نہیں کی، لیکن جو کچھ تخلیق کیا ہے اس کی ہمیشہ حفاظت کی ہے، آزادی اور عزت اور اپنے لئے اپنی پسند کا مستقبل تعمیر کرنے کے اپنے حق کا تحفظ کیا ہے — بصد احترام خراج عقیدت پیش کروں۔

میں چاہوں گا کہ میری تصانیف لوگوں کو بہتر اور پاک باطن کر دیں، میں چاہوں گا کہ میری تصانیف ان میں اپنے ہم‌جلیسوں سے محبت اور انسانیت اور ترقی کے مقاصد کےلئے جدوجہد کرنے کی آرزو پیدا کردیں۔

اگر میں نے اس میں ذرا بھی کامیابی حاصل کرلی ہو تو یہی میرے لئے باعث مسرت ہے۔

میں تمام حاضرین کا اور ان تمام لوگوں کا جنہوں نے نوبل انعام ملنے پر مجھے مبارکبادی کے پیغامات بھیجے ہیں، شکریہ ادا کرتا ہوں۔

۱۹۶۵ء

لائپزیگ کی کارل مارکس یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی اعزازی سند لینے کے بعد تقریر

پیارے کامریڈ بروننگ!

پیارے کامریڈ ہوکسلشنیدر!

میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ لائپزیگ یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کی علمی مجلس کو میرا دلی شکریہ پہنچا دیں۔

میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی بورژوا ملک مجھے اعزازی علمی سند دے اور ایسی ہی سند مجھے کسی برادر سوشلسٹ ریاست کی جانب سے ملے تو میرا ان کے متعلق تاثر مختلف ہوا کرتا ہے۔ اول الذکر صورت میں یہ میرے ادبی ہنر اور ادب کے شعبے میں میری کارگذاریوں کا ایک صداقت نامہ ہوتا ہے۔ موخرالذکر صورت میں معاملہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ علمی سند مجھے ان لوگوں نے عطا کی ہوتی ہے جن کے سیاسی نظریات وہی ہوتے ہیں جو میرے ہیں اور جو ان منزلوں کی جانب پہنچنے کے لئے ہی کوشاں ہوتے ہیں اور وہ انہیں نظریات کے حامل ہوتے ہیں جو ہمارے سوویت عوام کے ہیں۔ ان کا شرف قبولیت بخشنا میرے لئے بے پناہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔

اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں کامریڈ بروننگ اور کامریڈ ہوکسلشنیدر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ لائپزیگ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء کو میرا دلی پیغام تہنیت پہنچا دیں۔

میں ایک بار پھر اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگلی بار جب بھی کبھی میرا جرمن جمہوری ری پبلک میں آنا ہوا تو آپ کی یونیورسٹی میں حاضر ہونا میں اپنے لئے باعث عزت اور اپنا خوشگوار فریضہ تصور کروں گا۔

لائپزیگ سے ویشنسکایا تک کے طویل سفر کی تکلیف اٹھانے پر میں

13—35

بذات خود آپ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بھی خاص ایک کارنامہ ہے کیونکہ سفر چنداں آسان نہیں۔

کامریڈ شلیم، میں آپ کا بھی، جمہوری جرمنی کے محنت کش عوام کے نمائندے کی حیثیت سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

میں آپ سب کا جنہوں نے میری زندگی کے اس اہم موقع پر یہاں تشریف لا کر میری عزت‌افزائی فرمائی ہے، شکریہ ادا کرتا ہوں۔

۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء

سوویت کمیونسٹ پارٹی کی تیئسویں کانگرس میں تقریر

ساتھیو!

جس طرح دریائے والگا کی مست خرامی کے حسن فسوں‌خیز کا اندازہ اس کے معاون دریاؤں سے نہیں لگایا جا سکتا، حالانکہ روسی حسن و دل‌آویزی کی ان کی اپنی نرالی شان ہے، اسی طرح ہمارے روزمرہ کے کاموں اور الگ الگ کامیابیوں کے بارے میں غیر مربوط اخباری اطلاعات سے تعبیر کے پیمانے اور ہمارے ملک کی ہوشربا کارگذاریوں کی مکمل تصویر سامنے نہیں آسکتی۔

لیکن جب ہم اپنی پارٹی کی کانگرس کے لئے جمع ہوتے ہیں، خاص رپورٹ سنتے ہیں اور زیرتبصرہ مدت میں پارٹی اور عوام نے جو کچھ کیا ہے اس کا خلاصہ پیش کرنےوالے اعداد و شمار ہمیں معلوم ہوتے ہیں تو ہمیں واقعی زبردست کوششوں کے نتائج کا پتہ چلتا ہے اور مستقبل کی خاطر عوام جو کچھ تخلیق کر رہے ہیں اس کی عظمت کا واقعی احساس ہوتا ہے۔

اگر اس شاعرانہ تعارف کے بعد میں اچانک نثر کی طرف واپس آجاؤں تو پوری پوری ایمانداری کے ساتھ عرض کروں‌گا کہ مجھے ان لوگوں پر رشک ہوتا ہے جو اس بلند منبر پر آکر کانگرس کو ان کامیابیوں کی تفصیل بتاتے ہیں جو صنعت، سائنس یا تعلیم کے کسی نہ کسی شعبے میں انہوں نے حاصل کی ہوتی ہیں۔ یہاں میں سوویت ادب کے ایک نمائندے کی حیثیت سے تقریر کرنے کھڑا ہوا ہوں اور مجھے یہ تلخ حقیقت تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ ہماری کامیابیاں اتنی بڑی نہیں ہیں جتنی کہ ہم خود اور آپ، ہمارے قارئین چاہتے ہیں کہ ہوں۔

تولا کے مصنفین کی تنظیم کے سیکریٹری کے متعلق ایک لطیفہ ہے جس سے جب پوچھا گیا کہ تمہارے ہاں کیا حال ہے تو اس نے بہت خوشی خوشی جواب دیا تھا: ''حال بہت ہی اچھا ہے! پرانے زمانے میں تولا کے ضلع میں صرف ایک ہی ادیب تھے — لیو تالستائی — مگر اس کے مقابلے میں آج انجمن مصنفین کی تولا کی شاخ کے ممبروں کی تعداد تیئیس تک پہنچ گئی ہے۔''

میں اس کی طرح پرامید نہیں ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے ممبروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن جیسے کہ امداد باہمی کی انجمن کے ممبر کہا کرتے ہیں: ''ہمیشہ ہی ایسا نہیں ہوتا کہ پیداوار مطلوبہ معیاروں کے مطابق ہوتی ہو۔''

یہ ضرور ہے کہ پچھلے چند برسوں کے دوران میں نظم اور نثر دونوں کی کچھ اچھی کتابیں نکلی ہیں لیکن قریب قریب ناکافی۔ اس کا کافی حد تک قطعی ثبوت ان کتابوں کی فہرست سے ملتا ہے جو لینن انعام کے لئے تجویز کی گئی ہیں۔ دو یا تین کے علاوہ یہ کتابیں ابتدائی بحث تک کے جائزے سے آگے مشکل ہی سے بڑھ سکیں گی۔ یہ کوئی رنج کی کیفیت نہیں ہے۔ مصنفین سخت محنت کر رہے ہیں۔ لیکن معرکۃالآرا کتابیں شائع ہونا کوئی سال کے سال کی بات نہیں ہوتی اور ان کے اکثر و بیشتر شائع ہونے کی توقع کرنا درست بھی نہ ہوگا۔ کراسنودار کے خوش نصیب علاقے ہی کو لیجئے۔ وہاں بھی خراب سال ہوتے اور بری فصلیں حاصل ہوا کرتی ہیں۔ تو پھر ادب سے آپ کیا توقع کر سکتے ہیں؟

مثلاً اگر آپ جنگ کے متعلق ادب ہی کو لیں تو اس کی سست رفتار پیش رفت کا باعث خود موضوع کی پیچیدگی ہے۔ پچھلے چند برس ہی سے جنگ کے بارے میں یادداشتیں خاصی بڑی تعداد میں شائع ہونی شروع ہوئی ہیں۔ اور ہمارے بہت سے معزز و ممتاز کمانڈروں اور فوجی شخصیتوں کو تو اب بھی اپنی داستان سنانی باقی ہے حالانکہ ایک بڑے ناول کی بہ نسبت خود اپنے حالات و واقعات لکھنا نسبتاً زیادہ آسان ہوتا ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ میں اپنے لئے جواز تلاش کر رہا ہوں: بہرحال میں جنگ کے متعلق لکھنے والوں میں ایک اکیلا ہی تو نہیں ہوں اور ہمارے بعد بھی اس کے متعلق دوسرے بہت سے لکھیں گے۔ میں تو صرف احوال واقعی بیان کر رہا ہوں۔

ہمارے جو ادبی معاملات ہیں ان کا تفصیلی تجزیہ کرکے میں آپ کو دق کرنا نہیں چاہتا اور ویسے بھی یہ ایک آدمی کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔ اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کی ہم مصنفوں کی کانگرس میں کوشش کریں گے جو اسی سال بعد میں منعقد ہوگی۔

چند الفاظ اس کے بارے میں جسے عام رواج کے مطابق سماج کی زندگی میں ادب کا مقام کہتے ہیں۔ وہ کونسے مظاہر ہیں جو ہمارے عصر سماج کی زندگی کی کرداری خصوصیات واضح کرتے ہیں اور ان مظاہر کے تعلق سے مصنف کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟

مجھے یقین ہے کہ ہر غیرمتعصب شخص پر یہ حقیقت بخوبی روشن ہے کہ آج کی دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کسی بھی دیانتدار مصنف یا فنکار کے لئے غیرجانبدار مشاہد کا رویہ اختیار کرنا غیر ممکن کر دیتے ہیں۔ شاید کوئی یہ سوچے کہ یہ تو سیدھی سادی حقیقت ہے، پھر بھی اس کے متعلق لوگوں کو یاد دہانی کرانی پڑتی ہے۔ عصرحاضرہ کی نوع انسانی کی زندگی کے واقعات نے جو راستہ اختیار کیا ہے اسے کسی طرح بھی ہموار نہیں کہہ سکتے... رجعت‌پسند بورژوا آرٹ ہر ممکن کوشش کرکے لوگوں کے انتہائی وحشیانہ جذبات مشتعل کرنے کی کوشش کرتا ہے، بہت کچھ بدی کی ان قوتوں کی طرح جو تمام قوموں اور ملکوں کے قدیم قصوں کہانیوں میں بیان کی جاتی ہیں انسان کو انسانی پیکر اور انسانی روح سے محروم کر کے حیوان میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ان کے اظہار کی علامتیں مختلف ہوتی ہیں مگر وہ ایک ہی زمرے کے مظاہر کی نشاندہی کرتی ہیں۔

ہمارا ملک اور دوسرے سوشلسٹ ممالک مختلف قومیتوں، مختلف سیاسی نظریوں کے حامل اور مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے کروڑوں محنت کشوں کے لئے تابناک اور منصفانہ مستقبل کی امید اور یقین کے ایک قلعے کی علامت بن گئے ہیں۔ ہر وہ چیز جو ہم تعمیر کر رہے ہیں، ہر وہ چیز جس کی تخلیق کے لئے ہمارے مزدور، کاشتکار، سائنسداں اور فن کار کام کر رہے ہیں، ہر وہ چیز جس کی تخلیق کے لئے ہماری پارٹی ہمیں جوش‌وخروش دلاتی ہے وہ دنیا میں امن کے لئے، آزادانہ محنت کا بول بالا ہونے کے لئے، جمہوریت، سوشلزم، قوموں کی برادرانہ دوستی اور تعاون کے لئے، انسان کے لئے، نوع انسانی کے لئے کیا جاتا ہے۔

اور وہ سوال جو گورکی نے پوچھا تھا کہ: ''تہذیب کے معمارو، تم کس کی طرف ہو؟'' آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ تیس برس پہلے

تھا۔ سوویت مصنفوں کی غالب اکثریت اور دوسرے ملکوں کے ترقی پسند مصنفین اپنی اپنی تصانیف میں اس سوال کا دوٹوک جواب دیتے ہیں۔

بڑے بڑے، نمائندہ اجتماعات میں مصنفوں، صحافیوں اور اخبار نویسوں سے مجھے بارہا تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع ملا ہے کہ سماج کی زندگی میں مصنف کا کیا کردار ہوتا ہے۔ پچھلے سال نوبل انعام کی تقسیم کی رسم کے دوران میں اسٹاک ہوم کے ٹاؤن ہال میں جو تقریر میں نے کی تھی اس کا بڑا حصہ اسی موضوع پر مشتمل تھا۔ سامعین موجودہ اجتماع سے بنیادی طور پر مختلف تھے۔ اور اسی لئے اپنے خیالات کو جن الفاظ کا میں نے روپ دیا تھا وہ بھی اسی مطابقت سے مختلف تھے۔ خیال رہے، ہیئت میں، ماہیت میں نہیں۔

کمیونسٹ کہیں بھی، خواہ کسی زبان میں کیوں نہ بولے وہ ہمیشہ کمیونسٹ ہی کی حیثیت سے بولتا ہے۔ بعضے ایسے بھی ہیں جنہیں ممکن ہے یہ پسند نہ ہو مگر حلق سے انہیں اتارنا ہی پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں یہی وہ خوبی ہے جس کا ہر جگہ احترام کیا جاتا ہے۔ جہاں کہیں بھی جلسہ عام میں کوئی سوویت فرد تقریر کرے اس کو سوویت محب وطن کی حیثیت سے بولنا چاہیئے۔ سماج کی زندگی میں مصنف کے کردار کی تعریف بیان کرتے ہوئے ہم کمیونسٹوں کی حیثیت سے، اپنی عظیم مادر وطن کے بیٹوں کی حیثیت سے، ایک ایسے ملک کے باشندوں کی حیثیت سے جو کمیونسٹ سماج کی تعمیر کر رہا ہے، اپنی پارٹی کے اور اپنے عوام کے انقلابی انسان دوست نظریات کے ترجمانوں کی حیثیت سے بات کرتے ہیں۔

وہ معاملہ بالکل مختلف ہوتا ہے جبکہ کوئی مصنف سوویت یونین میں ایک چیز لکھتا ہے اور غیر ممالک میں کوئی بالکل مختلف چیز شائع کراتا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ ایک ہی سی روسی زبان لکھتا ہے۔ لیکن پہلی صورت میں اصلیت پر اچھی طرح پردہ ڈالنے کے لئے اور دوسری صورت میں ہر اس چیز کے خلاف جو سوویت ہے، ہر اس چیز کے خلاف جو ہمارے لئے بیش بہا اور مقدس ہے اپنی نفرت اور عداوت سے اس زبان کو ناپاک کرنے کے لئے۔

میں ان مصنفوں میں سے ہوں جنہیں عظیم اور نیک سوویت عوام کا ایک ننھا سا ذرہ ہونے پر فخر ہے۔ ہمیں اپنے خوبصورت اور طاقتور ملک کا سپوت ہونے پر فخر ہے۔ ہمارے ملک نے ہمیں تخلیق کیا اور وہ جو کچھ دے سکتا تھا ہمکو دیا۔ ہم ہر چیز کے لئے اپنے ملک کے مرہون منت ہیں۔ ہمارا سوویت وطن درحقیقت ہمارے لئے ایک ماں ہے۔

ہم سب ایک بڑے کنبے کے افراد ہیں۔ تو پھر ہمارا رویہ ان غداروں کی جانب کیا ہو سکتا ہے جو اس چیز کو ناپاک کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے لئے سب سے زیادہ مقدس ہے۔ ایک پرانی کہاوت ہے کہ ''ہر گلے میں ایک کالی بھیڑ ہوتی ہے''۔ لیکن گلے اور گلے میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس بات سے سب متفق ہوں گے کہ خود اپنی ماں کو بدنام کرنے، کینہ پروری کے ساتھ اس کی توہین کرنے اور اس پر ہاتھ اٹھانے سے زیادہ ذلیل اور کمینی حرکت کوئی نہیں ہو سکتی!

مجھے شرم ان مصنفوں پر نہیں آ رہی جنہوں نے ہمارے ملک کو بدنام کیا ہے اور جو چیز ہمیں عزیزترین ہے اس پر کیچڑ اچھالی ہے۔ وہ تو بدچلن ہیں۔ مگر مجھے ان لوگوں کی وجہ سے ضرور شرم آتی ہے جو ان مصنفوں کی صفائی پیش کرتے ہیں، خواہ وہ کسی وجہ سے ہی کیوں نہ کرتے ہوں۔

اور ان لوگوں پر مجھے دو چند ندامت ہوتی ہے جو ان سزا یافتہ مرتدوں کو ضمانت پر رہا کرانے کی اجازت حاصل کرنے کی درخواستیں داخل کرتے پھر رہے ہیں۔

ہم نے جو کچھ پایا ہے اس کے بہت مہنگے دام چکائے ہیں۔ ہم اپنی سوویت حکومت کی بےحد قدر کرتے ہیں اور اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتے کہ کوئی اس کو بلاخوف سزا بدنام کرتا پھرے۔

کچھ لوگ ہیں جو انسانی ہمدردی کی دہائی دے رہے ہیں 'سزا کی سختی پر واویلا مچا رہے ہیں۔ یہاں مجھے ہماری سوویت فوج کی پارٹی تنظیم کے ڈیلی گیٹوں کا ایک جتھہ نظر آ رہا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ اگر انہیں اپنی کسی ٹکڑی میں کہیں غدار مل جاتے تو وہ ان سے کیا سلوک کرتے؟ ہمارے فوجی اور کسی سے زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسانی ہمدردی اور بدمست شرابیوں کے دلاز میں کیا فرق ہوتا ہے۔

ایک چیز اور بھی ہے جس کے متعلق میں سوچ رہا ہوں۔ اگر کہیں یہ من بیس کی یادگار دہائی میں ہوا ہوتا جبکہ مقدمات قانون تعزیرات کی الگ الگ دفعات کے بجائے ''انقلابی انصاف کی بنیاد پر فیصل ہو رہے تھے''، تو ان نمک حراموں کو سزا بہت مختلف، اف نہایت ہی مختلف ملی ہوتی! اور یہاں بھلا ملاحظہ فرمائیے کچھ لوگ ہیں جو سزا کے ''سخت ہونے'' کی باتیں کر رہے ہیں!

افترا پردازوں کی صفائی پیش کرنے والے بورژواؤں سے میں کہنا چاہتا

ہوں: ہمارے ملک میں تنقید کے تحفظ کے بارے میں آپ فکر مت کیجئے۔ تنقید کی ہم حمایت کر رہے ہیں، اس کو نشوونما دے رہے ہیں۔ اور موجودہ کانگرس میں بھی کہیں زیادہ سخت تنقید ہوئی ہے۔ لیکن بدنام کرنے کو تنقید نہیں کہتے اور گدھے کی کیچڑ مصور کی تختی پر سے لیا ہوا روغن نہیں ہوتی۔

ساتھیو، ادب کے بارے میں مسائل کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرائے اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ یہ سوچنے لگیں کہ ہم مصنفوں کے لئے ادبی امور ہی تمام چیزوں کا آغاز اور انجام ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ہماری دلچسپیوں کی بہت سی چیزیں ہیں۔ مثلاً مصنف لیونڈ لیونوف نے اپنی زندگی کے کئی سال جنگلات کو — روسی دیہات کے حسن و دولت کو برقرار رکھنے کی جدوجہد کے لئے وقف کئے۔ دوسرے مسئلے بھی ہمارے ذہن پر چھائے رہتے ہیں۔ جس چیز کے بارے میں اب میں بولنے والا ہوں اس کا ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمیں جھیل بائیکال کے مسئلے کو حل کرنا چاہئے۔ اور میں آپ سے اپنے ہاں کی منصوبہ بندی کے بارے میں چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

پانچویں مارچ کو ”پراودا“ میں و۔ تیتوف کا ایک مضمون بعنوان ”انتظامیہ کی غزل سرائیاں“ شائع ہوا۔ اس مضمون میں جو کچھ واضح کیا گیا تھا وہ مختصراً یوں ہے: کسی زمانے میں روسی فیڈریشن کی غذائی صنعت کی وزارت نے فیصلہ کیا تھا کہ شہر کیازین میں ترکاریاں خشک کرنے کی ایک فیکٹری تعمیر کی جائے۔ یہ فیکٹری درحقیقت تعمیر بھی ہو گئی مگر پتہ یہ چلا کہ اس کو جتنے خام مال کی ضرورت ہوتی ہے وہ فراہم نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ اس کو سویابین کی چٹنیاں بنانے کی فیکٹری میں تبدیل کر دیا جائے۔ جب یہ کام بھی ہو گیا تو پتہ چلا کہ ماسکو اور سربوخوف کی فیکٹریاں ماسکو اور علاقۂ ماسکو کے لوگوں کی ضرورت بھر کی چٹنی فراہم کر رہی تھیں۔ پھر بیش قیمت درآمدشدہ مشینیں لائی گئیں تاکہ اس جگہ کو دودھ کی فیکٹری میں تبدیل کر دیا جائے لیکن اس سے پہلے کہ مشینیں پوری طرح نصب کی جاتیں فیصلہ یہ کر لیا گیا کہ مرغیوں کا مذبح قائم کرنا بہتر رہیگا۔ بینک نے بہت بڑا قرضہ منظور کیا۔ مگر ایک بار پھر پتہ یہ چلا کہ اس کارخانے کی گنجائش خام مال فراہم کرنے کی موجودہ صلاحیت سے کئی گنی زیادہ ہوگی۔ فیکٹری کو وجود میں آئے دس برس ہو چکے ہیں اور مختلف تبدیلیاں کرنے پر قریب دس لاکھ روبل صرف کئے جا چکے ہیں۔ غالباً یہ کوئی

بہت بڑی بات نہیں ہے مگر یہ پوچھنے کو تو جی چاہتا ہی ہے: یہ بھلا کس قسم کی منصوبہ‌بندی ہوئی؟

پچھلے سال والگاگراد میں کسی فیکٹری کے گندے پانی کو صاف کئے بغیر دریائے والگا میں آنے دیا گیا تھا یا تو غفلت کے سبب سے یا تحفظی تنصیبات کی منصوبہ بندی میں لاپروائی کے باعث۔ جس جگہ سے پانی گندہ ہوا تھا وہاں سے چار سو کلومیٹر کے فاصلے تک مردہ مچھلیاں تیرتی پھر رہی تھیں۔ جانچ پڑتال کی چوکیوں نے نقصان کا جو میزان لگایا تو وہ یہ تھا: ۸۳۲۰۰۰ اسٹرجن (اسٹرجن مچھلیوں کی دوسری قسمیں)، ۲۳۵۰۰۰ فلس‌دار مچھلیاں اور بیشمار چھوٹی مچھلیاں اور انڈے۔ ہماری قومی معیشت کو جو نقصان ہوا اس کا کوئی ایک کروڑ دس لاکھ روبل کا اندازہ لگایا گیا۔ اور اس امر کے پیش نظر کہ جب اسٹرجن مچھلیاں مر جاتی ہیں تو آدھی سے زیادہ بجائے سطح پر آنے کے تہ میں بیٹھ جاتی ہیں، نقصان کو اس سے بہ‌آسانی دوگنا شمار کیا جا سکتا ہے۔

آئیے ہم لوٹ کر پھر جھیل بائیکال کی طرف آئیں۔ اس کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اخبارات کی سخت تنبیہوں پر ایسا نہیں ہے کہ ہمیشہ ہی کان دھرے جاتے ہوں اور کیا معلوم والگا میں جو کچھ ہوا وہی بائیکال میں بھی نہ ہو؟ کیوں نہ ہم کوشش کریں اور ہمت کر کے جھیل بائیکال کے اطراف کے جنگلات کاٹنے اور وہاں لگدی اور کاغذ کے کارخانے تعمیر کرنے کا ارادہ ترک کر دیں اور ان کے بجائے اس قسم کی فیکٹریاں بنائیں جن سے روسی قدرتی مناظر کے اس مخزن کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو؟ بہرحال بائیکال کو بچانے کے لئے تمام ضروری کارروائیاں کرنی چاہئیں۔ اگر ہم ”روس کے تابناک سمندر، مقدس بائیکال“ کو محفوظ رکھنے میں ناکام رہے تو آنے والی نسلیں ہمیں ہرگز معاف نہ کریں گی۔

ساتھیو، مجھے آپ کے سامنے ایک ذاتی مسئلہ بھی پیش کرنا ہے۔ پرسکون ڈان پر تباہی نازل ہو رہی ہے۔ ماہروں کا کہنا ہے کہ صنعتی کارخانے ہر سال اس میں ستر لاکھ مکعب میٹر گندہ پانی چھوڑتے ہیں۔ بحیرۂ‌آزوف کو حقیقی خطرہ لاحق ہے — آئندہ چندہی برسوں میں اس کے مچھلیوں کے محفوظ ذخیرے نہایت ہی قلیل ہو کر رہ جائیں گے۔ پہلے صرف بیش قیمت مچھلیاں ہی سال بھر میں ۱۵۰۰۰۰ ٹن سے زیادہ پکڑی جاتی تھیں۔ اب بمشکل ۱۵۰۰۰ ٹن پکڑی جاتی ہیں یا بہ الفاظ دیگر دسواں حصہ۔

صنعتی غلاظت چھوڑے جانے، تسمیانسکیا بند سے ڈان کے پانی کے کنٹرول اور ان سب باتوں کے علاوہ سوویت یونین کی ماہی گیری صنعت کے وزیر کامریڈ ایشکوف کے نظم و نسق میں زیادہ دوراندیشی سے کام نہ لئے جانے کے باعث بحیرۂ آزوف کا علاقہ تباہی و بربادی سے ہمکنار ہو گیا ہے۔ "لتیراتورنایا گزیتا" اور "کومسومولسکایا پراودا" نے جو جائزے چھاپے گئے تھے ان کے جواب میں ضوابط خاموشی کو توڑتے ہوئے کامریڈ ایشکوف نے آخر کار ایک بودا سا مضمون "بحیرۂ آزوف آج اور کل" لکھا ہے۔ اگر کامریڈ ایشکوف آج بحیرۂ آزوف کا انتظام اسی طرح کرتے رہے تو اس کا "کل" نہیں ہو سکتا۔ ان کی اجازت سے ہی گرمیوں کے دو مہینوں کے علاوہ سارے سال قریب قریب دو سو جہاز بلہیڈ اور سارڈیل مچھلیاں پکڑنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کی ہدایات سے ہی کیچڑ چوسنے کی مشینیں ہی ایک کروڑ سے زیادہ چھوٹی چھوٹی پانکبرج مچھلیاں سالانہ ہلاک کر ڈالتی ہیں اور اس طرح بحیرۂ آزوف کے ان اداروں کی تمام کوششوں کو ناکارہ کر دیتی ہیں جو مچھلیوں کی افزائش نسل اور ان کے انڈوں کی دیکھ بھال کا کام کرتے ہیں۔

ماہی گیری اور تحقیق کی تنظیموں کی کانفرنس کا تصدیق کے لئے حوالہ دیتے ہوئے کامریڈ ایشکوف دعوی کرتے ہیں کہ اب بھی ہر سال چالیس سے پچاس ہزار ٹن تک سارڈیل مچھلیاں پکڑی جا سکتی ہیں۔ جس چیز کا وہ تذکرہ نہیں کرتے وہ یہ ہے کہ سارڈیل مچھلیوں کے ساتھ ساتھ بیش قیمت مچھلیوں کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی پکڑ لئے جایا کرتے ہیں۔

میں اقرار کرتا ہوں کہ کل تک میرا ارادہ یہ تھا کہ کامریڈ ایشکوف کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کروں، لیکن شام کو میری ملاقات محاذ جنگ کے اپنے کچھ دوستوں، اپنے اچھے پرانے ساتھیوں سے ہوئی اور شیطان نے آ کر مجھے بہکایا تو میں نے ان کو اپنی وہ تقریر دکھا دی جو تیار کی تھی۔ انہوں نے مجھ پر سخت کلامی کا الزام لگایا اور کہا کہ کامریڈ ایشکوف کچھ بڑے آدمی اور بڑے کارکن نہیں ہیں اور مجھ سے وعدہ لے لیا کہ اپنی تقریر کو نرم کر دوں۔ محاذ جنگ کے اپنے دوستوں کے لئے کوئی بھلا کیا کچھ نہیں کرتا! میں تو اسٹرجن کی یعنی وزیر کی تنقید کرنا چاہتا تھا۔ اور سارڈیل کی — ماہی گیری کے روستوف کے یا کمبیر اور کے بورڈ کی تنقید سے بھلا کیا حاصل؟ خیر چھوڑیے، وعدہ تو وعدہ ہوتا ہے اور اس لئے میں کچھ اور نہیں کہوں گا۔ چنانچہ

کامریڈ ایشکوف کے لئے میری یہی دعا ہے: "وہ جیتے رہیں اور سارڈیل چرتے رہیں!"

مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ مچھلیوں کے غم کے ہمارے ماہروں کا حصہ بھی نہایت ہی قیمتی ہے اور ہماری قومی معیشت کی ضرورتوں کے مقابلے میں بہت ہی اونچا پڑتا ہے۔ جاپان، رومانیہ اور دوسرے ملکوں میں تالاب کے فی ہیکٹر سے پکڑی جانے والی مچھلیوں کا جو وزن پڑتا ہے وہ ہمارے ہاں کی بہ نسبت کئی گنا ہوتا ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ موازنہ ہمارے حق میں نہیں ہے اور اس پر ان لوگوں کو سوچ بچار کرنا چاہئے جن کا کام معیشت کی اس خاص شاخ کے متعلق غور و فکر کرنا ہے۔ ان کو جلد ہی سوچ بچار کرنا ہے کیونکہ ہمارے دریاؤں میں سے پانی کے تیزی سے اخراج کے باعث جلد ہی تالابوں میں ماہی گیری کا مسئلہ پوری شدت کے ساتھ ہمیں درپیش ہوگا۔

میں نے اپنی تقریر میں ماہی گیری پر اتنی ہی توجہ دی ہے جتنی ادب پر۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ اس میں کوئی بھید نہیں؟ جی نہیں۔ میں مچھلیوں کی افراط چاہتا ہوں — روچ، وبا وبا اور ہیرنگ — سمندری کیل نہیں۔ جنہیں سمندری کیلی لذیذ معلوم ہوتی ہو وہ وہی کھائیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں تو مچھلیوں کو محفوظ رکھنے کا حامی ہوں، کیونکہ اس میں فاسفورس بہت ہوتا ہے، جس کے متعلق دعوی کیا جاتا ہے کہ دماغ کے لئے مفید ہے، اور اس کو زوردار طریقے سے کام کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ اور، بہرحال، جس چیز کو دماغ کہتے ہیں اس کی ضرورت صرف مصنفوں کو ہی نہیں ہوتی!

اگر آپ اجازت دیں تو منصوبہ بندی کے متعلق چند باتیں اور۔ اپنی بات کے ثبوت میں ایک مثال پیش کروں گا۔ عام طور پر میں منصوبہ بندی کے حق میں ہوں، لیکن میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ افراط ہو۔ علاقۂ روستوف کے اجتماعی فارموں اور ریاستی فارموں کے پاس ٹریکٹر ان کی ضرورتوں سے دو ہزار کم ہیں۔ جس قسم کی منصوبہ بندی کا میں حامی ہوں وہ ایسی ہونی چاہئے کہ وزیر زراعت کامریڈ مسکیبنکو فارموں کو یہ ٹریکٹر خود پیش کریں تاکہ ہمیں اپنے علاقائی عہدیداروں کو ماسکو نہ بھیجنا پڑے تاکہ جائز یا ناجائز کسی طرح سے بھی نہ حاصل کریں۔ اب ہوتا کیا ہے؟ ان لوگوں کو ماسکو جانے اور کچھ نہ کچھ چیزیں حاصل کر کے آتے دیکھ کر میں بھی اپنے بس کی طرح ایک نیا پڑتا ہوں۔ قدرتی بات ہے کہ میرا پیمانہ چھوٹا ہوتا ہے: میں

اسکول کھلوانا چاہتا ہوں، یا پھر میں اجتماعی فارم کے لئے چھت چھانے کا سلیٹ پتھر حاصل کرنا چاہتا ہوں یا کچھ عمارتی لکڑی - تو پھر میں وزیر کے پاس پہنچتا ہوں اور عرض کرتا ہوں: ''کامریڈ وزیر، اجتماعی فارم کے مویشیوں کے باڑے پر چھت ڈالنے کے لئے تین ہزار ٹکڑے سلیٹ پتھر کے ہمیں دلوا دیجئے -'' اور جناب وزیر جواب دیتے ہیں: ''لیکن ہماری معیشت تو بامنصوبہ ہے، آپ کو تو خود سمجھنا چاہئے! منصوبے کے تحت آپ کو جو کچھ ملنا تھا وہ سب آپ کو پہنچایا جا چکا ہے -'' اور میں انہیں جواب دیتا ہوں: ''میں تو سمجھتا ہوں مگر گائیں اور خاص طور سے بچھڑے بالکل نہیں سمجھیں گے کہ وہ خزاں کی بارش میں بھیگ کر چوڑا کیوں ہوں اور سردیوں میں کیوں ٹھٹھریں۔'' چھتوں پر سلیٹ پتھر کی تختیاں اس لئے نہیں چھائی جاتیں کہ وہ خوش نما یا حسین ہوتی ہیں بلکہ محض اس لئے کہ اس میں بچت ہوتی ہے - اس کے علاوہ اگر مویشیوں کے باڑوں کی چھتیں بھوسے سے چھائی جائیں تو کسانوں کی ہمت افزائی نہیں ہوگی کہ وہ چارہ بہت سارا جمع کریں: کمی پڑ جانے کی صورت میں وہ گایوں کو جب چاہیں، چھپر کھلا سکتے ہیں لیکن چھت اگر سلیٹ کی ہو تو وہ جوں کی توں رہیگی۔

اور جب آپ کچھ نہ کچھ مانگنے مستقل جاتے رہتے ہیں تو اپنی خصلت میں ناگوار تبدیلی آتی معلوم ہوتی ہے، یہاں تک کہ ڈیل ڈول میں بھی۔ مصنف کی پروقار چال ڈھال کو اور پرانے فوجی کے چاق چوبند انداز کو کیا ہو گیا؟ آپ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ منت سماجت کرتے کرتے کمر جھک گئی ہے اور یہ کہ آپ وزیر کو ''کامریڈ وزیر،'' کہہ کر رسمی انداز میں مخاطب نہیں کرتے بلکہ دلجوئی کے انداز میں ''پیارے ایوان ایوانووچ،'' کہتے ہیں - رفتہ رفتہ منصوبہ بندی میں ہماری تصحیح جس کے لئے خود زندگی ہمیں مجبور کرتی ہے آپ میں حرص و ہوا کے بعض رجحانات پیدا کر دیتی ہے - یہاں اس کانگرس میں بھی جب آپ مختصر التوا کے دوران میں برآمدے میں ٹہلتے ہوتے ہیں تو شکرے کی سی نگاہوں سے کسی وزیر یا اور کسی کی تلاش میں رہتے ہیں اور اس دوران میں نہایت سرگرمی سے یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ''اس سے میں کیا حاصل کر سکتا ہوں؟'' اور جب آپ کسی وزیر کو ملاقات کا وقت حاصل کرنے کے لئے ٹیلیفون کرتے ہیں تو یہ کبھی نہیں کہتے کہ آپ اعلی سوویت کے ممبر ہیں بلکہ کہتے ہیں کہ آپ مصنف ہیں - وزرا مصنفوں کی بات زیادہ آسانی سے مان لیتے ہیں - مختصر یہ کہ جس

طرح بن پڑتی ہے آپ کچھ حاصل کر لیتے ہیں - چنانچہ آپ نے دیکھا مصنفوں کی زندگی کچھ ہنسی کھیل نہیں -

اس اعلی منبر سے تقریر کرتے ہوئے میں نے جس طرح مسکرا مسکرا کر باتیں کی اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں - سنجیدگی سے عرض کروں تو ہم سب اپنی پارٹی کی دانشمندی پر، پارٹی ہمیں جن فرائض کی تکمیل کی ذمہ داری دیتی ہے انہیں مکمل کرنے پر پورا پورا عقیدہ رکھتے ہیں۔

اور آپ، پیارے کامریڈ ڈیلی گیٹو، مطمئن رہیں کہ ہزارہا مصنفوں کی فوج کی فوج، جو ملک کی اور عوام کی خدمت کے لئے سچے دل سے اپنے آپ کو وقف کر چکے ہیں، آرٹ اور ادب کے متعلق ان خیالات سے پوری طرح متفق ہیں جو ہماری مرکزی کمیٹی کی رپورٹ میں واضح کئے گئے ہیں اور اپنی لیننی پارٹی کی پالیسی کی تہ دل سے حمایت کرتے ہیں -

۱۹۶۶ء

انسان دوست وہ شخص ہے جو جہاد کرتا ہے
(ایک خط سے اقتباس)

پیارے دوستو اور مصنف بھائیو!

سب سے پہلے میں اس نیک مقصد میں جس کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں اس اجتماع کی کامیابی کا دعا گو ہوں -

دوسرے ملکوں کے ہمارے مہمانوں، ہمارے شرکائے کار کو جنہوں نے ہمارا دعوت نامہ قبول فرمایا اور اس جلسے میں شرکت کرنے اور اس کی کارروائیوں میں حصہ لینے کے لئے طویل اور مشکل سفر کیا انہیں تہ دل سے خوش آمدید -

یہ مصنفوں کا معمولی اجتماع نہیں ہے جہاں خالص ادبی مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوتے ہیں - یہاں ہم جس موضوع پر بات چیت کریں گے وہ ہے مصنف کا فرض منصبی، ہمارے کام کا مقصد اور نوع انسانی کے روبرو مصنف کی ذمہ داری -

ہیئت کے اعتبار سے ادبی پیشہ دنیا کے سب سے زیادہ انفرادیت پسندانہ پیشوں میں سے ہے - اس کے لئے مصنف کو یوگیوں کی سی تنہائی میں گھنٹوں اپنے قلمدان کے سامنے بیٹھنا پڑتا ہے - اور میرے خیال میں کسی مصنف کے لئے دوسرے مصنف سے مشابہت سے زیادہ تباہ کن کوئی اور

چیز نہ ہوگی۔ یہ ایک ایسا پیشہ ہے جس پر شہری ذمہ‌داری کا انتہائی بھاری بوجھ لدا ہوا ہے۔ اور اس اعتبار سے حقیقی فنکاروں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتا۔ ہم میں سے ہر ایک اس امید میں لکھتا ہے کہ اس کے بول سننے کے خواہشمندوں کے زیادہ سے زیادہ کانوں تک پہنچ سکیں‌گے۔ ہمیں مسرت اس وقت ہوتی ہے جب اپنی ''ذات'' کی ننھی سی دنیا کے اظہار میں نہیں بلکہ کسی ایسی چیز کو ظاہر کرنے میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے جو کروڑوں لوگوں کے دل ودماغ میں ہلچل پیدا کر دے۔

دنیا میں واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اور ایسا زمانہ آجاتا ہے جو ہم پر لازم کر دیتا ہے کہ سر جوڑ کر بیٹھیں تاکہ مل جل کر اپنے اہم مسئلے طے کر لیں، اور اپنی کوشش کی باطنی ماہیت، مصنف کے ضمیر، انسان دوستوں کے ضمیر سے متعلق سوالوں کے جواب تلاش کریں۔

سوال یہ ہے کہ جب پوری ایک قوم کی جدوجہد اور صعوبتوں کا معاملہ ہو تو مصنف کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟

انسان دوستی، انسان سے، نوع انسانی سے محبت... مختلف لوگ، انسانی سماج کی کن قوتوں کی وہ نمائندگی کرتے ہیں اس کے مطابق اس تصور کی کتنی مختلف تعبیریں پیش کرتے ہیں!

ہم کمیونسٹوں کا جو یقین ہے اس کے مطابق ہم سوویت مصنفوں کی رائے یہ ہے کہ جب کوئی قاتل یا لٹیرا کسی کو قتل کرنے یا لوٹنے کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے تو سچا انسان دوست اس بات کی جدوجہد کرے گا کہ قاتل کی کلائی موڑ دے، اور اس کی بدی کی خواہش کو ناکارہ کر دے اور محض بیچارے مقتول کا ماتم کرنے اور اس حقیقت پر آہ و زاری کرنے پر ہی اکتفا نہ کرے کہ دنیا میں قتل کا اب بھی وجود ہے۔

تو پھر اس وقت انسان دوستوں کی ذمہ‌داری اور فرض میں کتنا گنا اضافہ ہو جاتا ہے جبکہ کسی بڑے، طاقتور ملک کے سامراجی وحشیانہ قتل وغارتگری کا بازار گرم کرتے ہیں جن کا نشانہ بننےوالے کسی چھوٹے سے ملک کے پروقار اور جوانمرد لوگ ہوتے ہیں جو اپنی خودمختاری کے لئے بہادری کے ساتھ نبرد آزما ہوتے ہیں۔

فن کار کا دائمی موضوع نیک و بد کے درمیان، اجالے اور اندھیرے کے درمیان جدوجہد ہوتی ہے۔ ہمارے دور میں اس جدوجہد کے واضح طبقاتی معنے ہوتے ہیں۔

ہر قوم کا اٹل، مقدس حق ہوتا ہے کہ اپنی خودمختاری اور عزت

کی حفاظت کرے، اور اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کی تعمیر اپنی مرضی کے مطابق کرے۔ سوویت عوام اپنے دلسوز تجربے سے جانتے ہیں کہ خون کے پیاسے دشمن کے خلاف جو ہمیں اپنی آزادی اور خود زندگی تک سے محروم کرنے میں کسی چیز سے بھی دریغ نہ کرتا ہو، لڑنے کے کیا معنے ہیں۔ ہم ہمیشہ ان لوگوں کی طرف‌داری کرتے ہیں جو اپنی قومی آزادی حاصل کرنے کے لئے سامراجی ظالموں کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔

آج اس گول میز پر جو مصنف جمع ہوئے ہیں ان کو اس ضرورت کا سامنا ہے کہ اپنے لئے غیرمبہم نتائج اخذ کریں۔ سوویت مصنفین عرصہ ہوا اپنا فیصلہ کر چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے مہمان، اپنے اپنے ادیبوں کے نمائندے ہماری نیت کی قدردانی فرمائیں‌گے۔ ہمارے برادر ویت‌نامی عوام کو اور ساری دنیا میں قومی آزادی کی تحریک کو عملی امداد اور سہارے کی ضرورت ہے۔

اور کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ آج دنیا کی قوموں کے لئے جو واقعات باعث تشویش بنے ہوئے ہیں ان سے مشابہت نہیں رکھتے ہیں جو تیس برس پہلے رونما ہوئے تھے جبکہ فاشزم نے عالمگیر مسلح تصادم سے قبل اسپین میں اپنی زورآزمائی شروع کر دی تھی۔ یہ کہاوت تو سب ہی جانتے ہوں‌گے کہ ''دیوتا آ کر ہانڈی نہیں پکاتے''۔ میرا خیال ہے کہ اگر زمانۂ قدیم میں دیوتاؤں کو ہانڈیاں بنانے اور پکانے کا پیشہ اختیار کرنے پر رضامند کرلیا گیا ہوتا تو نوع انسانی کا اسمیں کوئی خسارہ نہ ہوتا۔ لیکن آج کے سیاسی کمہار، جب اپنے آپ کو دیوتا سمجھ کر ہر جگہ بزور شمشیر اپنا ''نظام‌نو'' مسلط کرنا شروع کر دیتے ہیں تو یہ بالکل مختلف چیز ہے۔ اس سے ہمیں، سب سے پہلے ہم مصنفوں کو خبردار ہو جانا چاہئے۔ ہر صاحب‌فکر کے دل میں اس سے مصنفانہ خفگی اور غم و غصے کے جذبات پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمیں آنجہانی جیولیس فوچک کے قول کو ہرگز فراموش نہ کرنا چاہئے: ''لوگو، خبردار رہو!''۔ اور مصنفوں کے معاملے میں کہا جا سکتا ہے: عمل کا وقت آ گیا ہے!

ہماری قوت، مصنفوں کی قوت ہمارے ان الفاظ کے خروش میں مضمر ہے جو لوگوں کے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں، ان کی قوت کو بڑھاتے، ان کے عزم کو تقویت پہنچاتے ہیں، انسان کے لئے، انسان‌دوستی، نوبنو کی آزادی اور اخوت کی روشنی کے لئے، سامراجی درندگی کی تاریکی کے خلاف جدوجہد کے لئے انہیں بیدار کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم سوویت مصنفین، دنیا میں رونما ہونےوالے واقعات پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ایشیا اور افریقہ کے مصنفوں سے، تمام ملکوں اور براعظموں کے مصنفوں سے یکجہتی کی، اتحاد کی اپیل کرتے ہیں۔ یہ مصنفوں کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے، انسان دوستوں کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے، بین الاقوامیت پسندوں کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے۔

ہر بڑھتا ہوا قدم منزل کو قریب تر لاتا ہے۔ آج کا جلسہ ایسا ہی ایک قدم ہو۔

۱۹۶۶ء

کتاب ''کیروف کارخانے کی تاریخ'' کا پیش لفظ

کیروف کارخانے کی تاریخ مرتب کرنے کا بےحد اہم کام کامیابی کے ساتھ انجام دے لیا گیا۔

کارخانے کی پیدائش، قیام اور ارتقا کی طویل مدت کے پورے اور ہر ایک پیچیدہ عمل کا، ایک ایسے عمل کا جس میں مزدوروں، انجینئروں اور تکنیکی ماہروں کی کئی نسلوں کی زندگی صرف ہوئی، کوئی بھی ناول احاطہ نہیں کرسکتا تھا۔

لیکن تاریخ اور ناول ایک دوسرے سے علیحدہ کے بجائے باہم تکمیلی اصناف تحریر ہوتے ہیں اور اس لئے اگر کیروف کارخانے کے مزدوروں کے متعلق، ان کے الوالعزم اور ڈرامائی تجربوں پر مبنی پلاٹوں کی مدد سے ناول اور افسانے لکھے جاتے ہیں تو افسانوی ادب کے مصنفوں کی ان کتابوں اور مورخوں کی موجودہ کتاب کا زندگی میں باہم ساتھ رہیگا۔

اس کارخانے کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے معاً خیال آنے لگتا ہے کہ آنےوالی نسلوں کے لئے (اور صرف کیروف کارخانے کے مزدوروں کی نسلوں کے لئے ہی نہیں) یہ کتاب اس احوال واقعی کی حیثیت سے بےحد قدر و قیمت کی ہوگی کہ سینٹ پیٹرس برگ — پیٹروگراد — لینن گراد کے جانباز مزدور طبقے نے کس طرح مصیبتیں اٹھائیں، جدوجہد کی، فتوحات حاصل کیں اور کامیاب ہوگیا!

۱۹۶۶ء

بین الاقوامی ادبی سمپوزیم کو ایک برقیہ

پیارے ساتھیو!

یہاں تاشقند میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی ادبی سمپوزیم میں شرکت کرنےوالے آپ حضرات کے ساتھ ذہنی طور پر جو بھی موجود ہوگا اس کے خیالات اور احساسات پر عہد پارینہ کی دانش اور زمانۂ حال کے مسائل چھائے ہوئے ہوں گے۔

یہ سالگرہ کا سمپوزیم ہے۔ دس برس ہوئے کہ یہاں تاشقند میں ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کے مصنفوں کا جلسہ ہوا تھا اور دنیا میں امن کے تحفظ اور نوع انسانی کی ترقی کے نیک مقصد کے لئے مصنفوں کی انجمنوں کے دائرے میں منظم مصنفوں کے درمیان نتیجہ‌خیز تعاون کی بنیادیں استوار کی تھیں۔

آج جو مسائل ہمیں درپیش ہیں وہ تاکیداً مطالبہ کرتے ہیں کہ ادب کا ہر باکمال ان سوالوں کا جواب دے: وہ کس کے ساتھ ہے؟ اپنے قلم، اپنے کام، اپنے فن سے وہ کس کی اور کیا خدمت انجام دیتا ہے؟ ہمارے دور کا مطالبہ ہے کہ ہم اس کے اہم مسائل چھیڑنے اور حل کرنے میں سرگرم عملی حصہ لیں۔

آپ کو نوائی کی جنم‌بھومی میں ان کے جشن میں بھی شرکت کرنے کی خوش‌نصیبی حاصل ہوگی۔ بہت سی قوموں کو اپنے عظیم شعرا پر فخر ہوتا ہے۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ پانچسو پچیسواں جشن ولادت منایا جائے۔ بہجت و سخاوت انسانی کے مغنی نے دنیا کےلئے علم و دانش کا جو خزانہ ورثے میں چھوڑا ہے اسے ان کے ہموطنوں نے سیکڑوں ہزاروں برسوں کے لئے سنبھال کر رکھا ہے۔ اس علم و دانش کی روشنی سے موجودہ سمپوزیم میں آپ بھی اپنی راہیں روشن کیجئے:

''اور انسان کے معزز نام
کا مستحق وہی ہے جس کے خیالوں
کا مرکز عوام ہوں۔''

یہ نوائی نے کہا تھا۔ ہمیں چاہئے کہ ان کے قول پر توجہ دیں۔

۱۹۶۸ء



۱۹۶۶ء کی ایک تصویر۔

سوویت کمیونسٹ پارٹی کی چوبیسویں کانگرس میں تقریر

ڈیلی گیٹ ساتھیو!

ہمارے لئے، سوویت مصنفوں اور فنون لطیفہ میں کام کرنے والوں کے لئے یہ پانچ سال کمیونسٹ پارٹی کے پرچموں کے زیرسایہ اور بھی قریب ہو کر مجتمع ہونے کے، اپنے سیاسی نظریات، اپنی جمالیاتی تہذیب اور سب سے اہم یہ کہ سوویت عوام یعنی قارئین، ناظرین اور سامعین کی، ان سب کی جن سے ادب اور فنون مخاطب ہوتے ہیں، کمیونسٹ تعلیم کے لئے ذمہ‌داری کا اور بھی زیادہ واضح احساس حاصل کرنے کے سال ثابت ہوئے۔

ہم فخر کے ساتھ توثیق کر سکتے ہیں کہ ہمارے ادب نے سوویت اقتدار کے قیام کے روز اول ہی سے وفاداری اور دیانت‌داری کے ساتھ عوام کی خدمت کی ہے اور اس کی آواز، بقول ہمارے روسی شاعراعظم، واقعی "مصیبت کے وقت اور مسرت و شادمانی کے دنوں میں سب کو آگاہ کرنے کے لئے گجر کی طرح گونجی"۔

حسب سابق اس کی آواز ہمارے ملک سے باہر بھی سنی جاتی ہے اور پہلے کی طرح وہ محنت کش نوع انسانی کو بیدار کرتی اور ہر محنت کش کے دل و دماغ کو حقیقی ترقی کے لئے، امن کے لئے اور ہمارے کرۂ ارض کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی انتہائی قابل اعتماد آرزو — کمیونزم — کے لئے جدوجہد کرنے کے لئے متاثر آمادہ کرتی ہے۔

بغیر کسی تصنع آمیز انکسار کے کہا جا سکتا ہے کہ آرٹ کے وسیلے سے ہم نے عوام کے اخلاقی اور روحانی ارتقاء کو بڑھاوا دیکر ان کی ازسرنو تعلیم میں قابل لحاظ پیشقدمی کی ہے۔ اس حقیقت کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہمارے ادب میں جسقدر بلند نظریاتی پیغام ہوتا ہے اتنا کسی اور ادب میں نہیں ہوتا۔ کیا آپ کسی ایسے ملک کا نام لے سکتے ہیں جو اس اعتبار سے ہمارے مقابلے میں آسکے؟ میں بلاخوف تردید دعوی کر سکتا ہوں کہ ایسا کوئی ملک نہیں ہے اور کوئی ادب ایسا نہیں ہے۔

تہذیبی ارتقاء کے عالمی عمل میں سوویت ادب اور فن جو مجاہدانہ کردار ادا کرتے ہیں اس کا سب سے پہلے تعین اس کمیونسٹ نظریے اور جانبداری سے ہوتا ہے جو ہمارے فنکاروں کی بہترین تخلیقات میں رچے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہی وہ خوبی ہے جو ہمارے نظریاتی دشمنوں اور ان کے



ایک جاپانی طالبہ آٹوگراف لے رہی ہے ۔

ٹکو آبشار کے پاس ۔





سپاٹ میدانوں کا ایک سفر ۔



یوری گاگارین کے ساتھ ساحل دان پر ۔

شولوخوف اپنے نوجوان پرستاروں سے باتیں کر رہے ہیں ۔





مختلف ملکوں کے نوجوان ادیب شولوخوف کی دعوت پر ویشنسکایا آتے رہتے ہیں ۔



شولوخوف اور یوری گگارین ادیبوں کے ساتھ۔

شولوخوف ناشروں کے ساتھ۔





بلغاریہ کے اشاعت گھر ''نرودنا ملادیژ،، کے ڈائریکٹر ایوان بونوف
شولوخوف کے ہاں مہمان آئے ہیں۔

ساجھیوں — ترمیمیت پرستوں میں جوش جنون پیدا کرتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہم ان کے قائل ہو کر سوشلزم اور کمیونزم کے بارے میں سلجھا ہوا رویہ ترک کر دیں اور پارٹی اور عوام کے مفادات کی خدمت کرنے کے اپنے بنیادی اصولوں سے ہٹ جائیں۔

سوشلسٹ حقیقت پسندی کا تختہ پلٹنے کے نمایاں امیدواروں میں سابق آسٹریائی کمیونسٹ فشر مین بھی ہیں۔ ''خالص،، اور مکمل طور پر غیرمحدود آزادی کے یہ مشہور ماہر ہمارے سوویت آرٹ کو نہایت جوش و خروش سے مطعون کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سوویت یونین میں آرٹ بیڑیاں پہنے ہوئے ہے اور ''پابند،، ہے اور اس وجہ سے وہ بہت ہی غمگین ہیں۔ ان کی تمنا ہے کہ ہمارے آرٹ کی بیڑیاں کاٹ دیں اور اس کو جانب داری سے، سماج کی خدمت کرنے کے نیک فریضے سے سبکدوش کر دیں۔

یہ فشرمین اور غیرممالک میں دیگر ماہی گیر اپنی بنسیوں کی ڈور میں بودار چارا لگا رہے ہیں اور یہ آس لگائے ہیں کہ جتنی بہت ساری سادہ لوح کارپ مچھلیاں نام نہاد ناپیدا کنار حقیقت پسندی کے گدلے پانی میں، کانٹے میں پھنس جائیں اتنا ہی زیادہ اچھا ہے۔

ہمارے ہاں بھروسے کی ان کارپ مچھلیوں کی بڑی قلت ہے اور اس لئے چالاک ماہی گیروں کا شکار بڑا ہی مایوس کن رہیگا!

لیکن انتہائی شدید نظریاتی جدوجہد کے موجودہ حالات میں اب وقت آ گیا ہے کہ ہم بھی پرعزم دھاوا بولیں اور بےخطا ہتھیار — کبھی ماند نہ پڑنےوالی لیننی سچائی — سے ہر رنگ کے بھگوڑوں اور ترمیمیت پسندوں کی کوششوں کا جواب دیں! یہ ہمارا فوری فریضہ ہے۔

اپنی تقریر کے شروع میں جو کچھ میں نے کہا تھا اس کا مقصد ہم مصنفوں نے جو کچھ حاصل کر لیا ہے اس کی اہمیت کو بڑھانا چڑھانا نہیں تھا۔ اگر یہ پارٹی نہ ہوتی جس نے ہمیں یہاں اس کانگرس میں اکٹھا کیا ہے تو ادب میں ریاضت کا کوئی ثمرہ حاصل نہ ہوتا اور حق تو یہ ہے کہ کسی سوویت ادب کا وجود ہی نہ ہوتا۔

ہزاروں ادبی شخصیتوں کو، لگاکر گورکی سے آجکل کے نوجوانوں تک، ایک ساتھ متحد کر کے اور ان کے ہنر کو عوام کی اور عوام کے مفادات کی خدمت پر مامور کرنا ایک ایسا کارنامہ تھا جسے صرف ہماری پارٹی اور اس کی رہبری کرنےوالے بلند تصورات ہی انجام دے سکتے تھے۔ اس پر جب آپ واقعی غور کرنے بیٹھیں تو ساتھیو، یہ درحقیقت محوحیرت کردینے والی بات ہے!



روستوف برساحل ڈان۔ فن کار نوجوانوں کے بلغاریائی سوویت کلب کے ممبروں سے ملاقات۔

ان نوجوان ادیبوں کا شوق و خوف استقبال کر رہے ہیں جو پانچویں کمیونسٹ کانفرنس میں حصہ لیکر آئے ہیں۔



سانجھو؛ میں اب سے سچ سچ کہوں گا۔ میرے قریب قریب رزمیہ اور قدرے سنجیدہ تعارف کا اور میں نے اپنے مصنف بیانیوں کی سابقہ خدمات کی جو جوابدہ دیا اس کا دراصل مقصد پچھلے پانچ برسوں میں ہم نے کیا حاصل کیا اور کیا غلطیاں کیں، ان کی تفصیل بتانے سے پہلے کسی بہانے سے آپ پر نیک‌دلی اور فیاضی کی کیفیت طاری کرنی تھی۔ کیونکہ مباحثوں میں بعض لوگوں نے جو کچھ کیا اس سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہم سے جنگ پر خاصے آمادہ ہیں۔

ادب اور فنون‌لطیفہ کی موجودہ صورت‌حال پر مرکزی کمیٹی کی رپورٹ نے نہایت تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ہم اس جائزے سے بلاشرط متفق ہیں۔

ہمارے ادبی کاروبار میں صورت‌حال کیا ہے؟ ہم ان مصنفوں کی بات نہیں کریں‌گے جو برسرعام مذمت کے لائق ہیں۔ جن سے نفرت ہو ان کی کوئی باتیں نہیں کیا کرتا۔ یہ خلاف شان بات ہوتی ہے۔ ہمیں ان مصنفوں کے بارے میں بات کرنی چاہیئے جو ہماری بخوبی توجہ کے مستحق ہیں، ہمیں اپنی کاروباری باتیں کرنی چاہئیں۔ ماسکو کی انجمن مصنفین کے سیکریٹری سرگیئی ناروفچاتوف نے شہر کی حالیہ پارٹی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم میں کمین‌گاہ سے گولیاں چلانے‌والے تو بہت نہیں ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ایسے وورو‌شلوف نشانہ‌باز بھی تھوڑے ہیں جو کسی تنظیم کا مضبوط سہارا ہوا کرسکتے ہیں۔ ان کے نہایت موزوں، شاعرانہ موازنے کے قریب قریب یہی معنے تھے۔ لیکن ناروفچاتوف نے جو بات نہیں کہی وہ یہ ہے کہ نشانہ‌بازوں میں خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کی گولی عین نشانے پر لگنے کی بات تو الگ رہی ٹھیک سمت میں بھی نہیں جاتی۔

”گولی دودھ پینے گئی ہے“ ایسی صورت میں فوجی یہی کہا کرتے ہیں۔ اور واقعی ادبی چاندماری میں عجیب واقعات رونما ہوتے ہیں: جو گولی نشانے پر نہیں لگتی وہ بومرینگ کی طرح خراب نشانے‌باز کے پاس واپس آ جاتی ہے لیکن اس کے لگتی نہیں بلکہ درحقیقت اس کے لئے دودھ نہیں بھی لاتی تو اس کے بچوں کے دودھ کے لئے مصنف کے محنتانے کی شکل میں موٹی رقم ضرور لاتی ہے۔

اگر یہ خراب نشانچی گولیاں بار بار نہ چلاتے اور بھاگم بھاگ بندوقیں نہ داغتے تو شاید حالت اتنی بری نہ ہوتی۔ خاصے بہت سارے

قیمتی کارتوس ضائع ہو جاتے ہیں اور ہمارے بعض قابلیت کو جو نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے وہ خاصا بڑا ہوتا ہے۔ مگر ذرا کوشش تو کیجئے کہ ایسا خراب نشانہ‌باز چاند ماری سے چلا جائے! وہ بہ‌اصرار یہی کہیگا کہ میں تو پہلے ادبی سرحدی مورچے پر جا رہا ہوں۔ وہ ہر ایک کو یقین دلائےگا کہ آئندہ اس کی گولی ٹھیک نشانے پر لگنے‌والی ہے۔ اس کی مراد اصل میں یہ ہرگز نہیں ہوتی کیونکہ نشانے پر گولی مارے بغیر ہی وہ تو موج مارتا آیا ہے۔ کم از کم اس کا حال ویسا تو ہے ہی جیسا کہ گوشت کی دکان میں رہنے‌والی بلی کا ہوا کرتا ہے۔

اس کا علاج کیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ اشاعت گھروں اور رسالوں کے مدیروں کو اپنے مطالبات کے معیار ایک دم بلند کر دینے چاہئیں۔ کیونکہ کسی خراب کتاب کی راہیں سب سے پہلے اشاعت گھروں اور رسالوں کے مدیر مسدود نہیں کریں‌گے تو اور کون کریگا؟ ادبی نقادوں کو اس وقت خاموشی اختیار کرلینے کی عادت ترک کر دینی چاہیئے جبکہ معاملہ اس کتاب کا ہو جسکی تعریف نہ کی جا سکتی ہو۔ ان کا فرض ہے کہ تجزیہ اور کتاب کی اصل قدروقیمت کا جائزہ پیش کریں۔ مصنفوں کی انجمنوں کا بھی بڑا قصور ہے کہ وہ فضول کتابوں کی ڈھیلی‌قبا کا دامن پکڑ کر گھسیٹ کیوں نہیں لیتے۔

اس معاملے کا ایک پہلو اور بھی ہے اور میری مراد مصنف کے محنتانے سے ہے۔ ہم سوویت مصنفوں کے لئے تصنیف کا کام قدرتی طور پر کبھی بھی مالدار بننے کا ذریعہ نہیں بنا اور نہ کبھی ہو سکتا تھا۔ یہ ہمارا ایک اصول ہے۔ مغرب میں کتاب کی فروخت سے ناشروں کو جو منافع حاصل ہوتا ہے اس کا کچھ فیصد حصہ اس کے مصنف کو مل جاتا ہے اور اس طریقے سے مشہور و معروف یا محض سب سے زیادہ فروخت ہونے‌والی فیشن‌ایبل کتابوں کے مصنفوں کو موقع ملتا ہے کہ وہ نہایت ہی مالدار افراد بن جائیں۔ لیکن بہت سے ترقی‌پسند ادیب گذارہ بھی مشکل سے کر پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خالص کاروباری نظام ہمارے لئے قطعی ناقابل قبول ہے۔ پھر بھی ہمارے کاپی‌رائٹ میں کچھ نکتے ایسے ہیں جن پر غور کرنا لازمی ہے۔ یہ بات اگرچہ الٹی معلوم ہوگی مگر حقیقتاً ہے کہ جو کتابیں سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہیں — جس کا مطلب ہمارے لئے یہ ہے کہ جن میں نظریاتی اور فنی خوبیاں بدرجۂاتم موجود ہوتی ہیں —

ان کے مصنف کو ہر اگلے ایڈیشن پر کم سے کم تر معاوضہ ملتا ہے یہاں تک کہ اس کی کتاب اس کے مجموعہ تصانیف میں شامل کر لی جاتی ہے۔

متعدد اور بھی نکتے ہیں جن پر ہماری انجمن کو مصنفین کے کام کے سلسلے میں غور کرنا چاہیئے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مجھے آپ کا بہت زیادہ وقت نہیں لینا چاہیئے اور اس لئے اب میں ان کے متعلق زیادہ نہیں بولوں گا۔ جون میں مصنفوں کی ایک کل یونینی کانگرس منعقد ہونے والی ہے اور ہم اس میں شرکت کرنے کے لئے ادب میں جوش و خروش سے دلچسپی لینے والے تمام حضرات کو مدعو کریں گے۔ وہیں ہم اپنے تمام ادبی قالینوں کی اچھی طرح ڈھول جھاڑیں گے! اور خاکم خاک ہو جائیں گے۔

ہماری کتابیں حقیقی معنوں میں بے حد بڑی تعداد میں شائع ہوتی ہیں۔ پھر بھی طلب رسد سے زیادہ ہوتی ہے۔ پبلک لائبریریوں تک کو بھوکا رہنا پڑتا ہے۔ پانچ میں سے صرف ایک کو ایسی کتابوں کی ایک جلد مل جاتی ہے جو نسبتاً زیادہ مقبول ہوتی ہیں۔ اور پھر ہمیں کسی مزدور، اجتماعی کاشتکار یا دانشور کی اس جائز خواہش کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ وہ ان کتابوں کو خرید کر اپنے گھر میں رکھے جنہیں وہ کبھی دوبارہ بھی پڑھنا چاہے۔ ایسے ہی موقع پر شہر یا ضلع پارٹی کمیٹیوں کے ان ساتھیوں سے ہمدردی ہونے لگتی ہے جنہیں کتابوں کو اس طرح تقسیم کرنا پڑتا ہے جیسے کہ وہ انتہائی ضرورت کی جنس تجارت ہوں۔ اور یہ سب اس وجہ سے کہ ہمارے پاس ضرورت کا کافی کاغذ نہیں ہے!

مجھے یاد ہے کہ کانستنتین ایوانووچ کالنشین نے پچھلی کانگرس میں افسانوی ادب کی کس گرمجوشی سے حمایت کی تھی۔ ان دنوں وہ پیرم کی علاقائی کمیٹی کے اول سیکریٹری تھے اور انہوں نے ہم سے عشق کا گویا اعلان کر دیا تھا۔ اب وہ لگدی اور کاغذ کی صنعت کے وزیر ہیں اور انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔

پیارے کانستنتین ایوانووچ، ہم نے آپ کے اعلان محبت پر یقین کر لیا تھا اور اب ہم آپ پر بیوفائی کا الزام لگا رہے ہیں۔ دیکھئے ذرا لفظ ''بیوفائی،، پر خواتین ڈیلی گیٹوں کے کان کیسے کھڑے ہو گئے! دنیا کی تمام عورتوں کی طرح اس لفظ سے ان کو پھریری آ جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ میری باوفا ساتھی بنینگی۔ اور بہر حال

یہ کس قسم کی محبت ہے؟ پیار محبت کے معاملات میں، جیسا کہ سب جانتے ہیں، میٹھی میٹھی باتیں ہوتی ہیں، اگر ایثار نہیں تو کچھ خرچ بھی کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں آپ سے، کانستنتین ایوانووچ گلدستوں کی یا پیاری پیاری مردانہ مسکراہٹ کی آس نہیں ہے۔ ہمیں تو کاغذ اور دیجیئے! کاغذ! منصوبے سے، جو ہماری خوش قسمتی سے آپ پورا کر رہے ہیں، فاضل کاغذ اور بہتر قسم کا کاغذ۔ ہمیں کاغذ دیجیئے اور پھر ہمیں یقین آئیگا کہ آپ واقعی ہم سے محبت کرتے ہیں۔ اور پھر ہم، نثرنگار جھولی پھیلا کر گھومیں گے اور آپ تو ایک شاندار گلدستہ اتنے ہی خوبصورت کاغذ میں لپیٹ کر پیش کریں گے اور ممکن ہے کوئی نوجوان شاعرہ — دنیا مظہرالعجائب ہے! — کوئی مثنوی عشق لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کرے۔ سوچئے تو مثنوی عشق! سحرانگیز بات ہے یہ تو۔ میں بھی اپنے اس بوڑھے منہ اس پر اعتراض نہیں کروں گا اور جہاں تک، پیارے کانستنتین ایوانووچ آپ کا تعلق ہے آپ کو تو اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

ساتھیو، دیکھا آپ نے؟ اس کاغذ کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں؟ میں نے محبت کا واسطہ دیا، دل پر ہاتھ رکھ کر ناممکن کو ممکن بنا دینے تک کے وعدے کئے... لیکن مذاق بر طرف، مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ جو کاغذ ہمارے پاس موجود بھی ہے اس کا استعمال معقول نہیں ہوتا۔ اس کے لئے نہ تو کامریڈ کالنشین قصوروار ہیں نہ ہم، مصنف۔ ہر چیز پر اور کسی بھی مقدار میں اس کو ضائع کر دیا جاتا ہے۔ کاغذ تو، جیسا کہ سب جانتے ہیں، اس کو محفوظ کرلیگا جو اس پر لکھا گیا ہو۔ ذرا غور فرمائیے — پچھلے سال ملک میں کل یونینی کتابیں شائع ہوئیں تو ان میں سے قریب قریب نصف عنوانات اس کے تھے جو ''محکمہ جاتی ادب،، کہلاتا ہے۔ اس چلمن کے پیچھے کون چھپا بیٹھا ہے؟ سب کچھ۔ موٹی موٹی دفتری رپورٹیں، اسی حیرت انگیز ضخامت کی یادداشتیں، ہر قسم کی تحفہ جاتی تقویمیں — کسی نہ کسی کارخانے سے متعلق البم جو شائع ہونے کے فوراً بعد ہی چوہوں کی غذا بننے کے لئے الماریوں میں رکھ دئے جاتے ہیں۔ اور ہر ایک کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنی مخصوص کتاب کی جلد خوبصورت بندھوائے چمکدار، ہفت رنگ گردپوش ہو اور چھپنا تو اسے چکنے سفید کاغذ پر ہی چاہیئے۔ ڈیلی گیٹ ساتھیو، اس

معاملے کو تو درست کرنا ہی پڑیگا، یہ تو ہاتھوں سے بالکل ہی نکل گیا ہے۔ اگر درستی منظور ہے تو سخت رویہ اختیار کرنا ہی پڑیگا کیونکہ محکمہ‌جاتی ادب شائع کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور تسوینر کا سارا سامان موجود ہے۔

اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے آئیے ہم وہیں چلیں جہاں سے آغاز کیا تھا۔ کامریڈ ناروفچانوف نے درست کہا تھا کہ ادب کی تخلیق کے بوجھ کا بڑا حصہ انہیں لوگوں کو اٹھانا پڑتا ہے جنہیں انہوں نے وورو‌شلوف نشانہ‌بازوں کا نام دیا تھا۔

ہماری جگہ لینے کے لئے خداداد صلاحیتوں والی نئی پود پروان چڑھ رہی ہے۔ بزرگ مصنفین اس کمک پر بڑی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ بےخوف ہوکر کہا جا سکتا ہے کہ ادب میں نہایت عمدہ کمک پہنچ رہی ہے۔ ان نوجوان مصنفوں کی ہمارے سماج کو ضرورت ہے اور اپنے ادب کا مستقبل ان کو سونپتے ہوئے ہمیں مسرت ہے۔ یہ دلچسپ لوگ ہیں جن کا اندازفکر وطن دوستانہ ہے اور جن میں زندگی کی گہرائیوں تک پہنچ جانے کی تڑپ ہے۔ نوجوانوں میں بانکپن کا ہونا لازمی سی چیز ہے اور اپنی رائے کے اظہار میں وہ قدرے منہ‌پھٹ بھی ہوتے ہیں، مگر ان میں بےاعتنائی نام کو نہیں ہوتی اور ان کو متواتر تلاش کی دھن لگی ہوتی ہے۔ تجربے کی ان میں یقیناً کمی ہوتی ہے مگر وہ آتے آتے آ جائیگا۔ ہمارے ادب کا مستقبل ان نوجوان مصنفوں ہی کے ہاتھ ہے، وہی اس کی تعمیر کریں گے اور وہی اس کے لئے جواب‌دہ ہوں گے۔ آپ سمجھ ہی رہے ہوں گے کہ میں نوجوانوں کا اپنی کمک کا، سوویت ادب کی تازہ‌دم فوجوں کا بحیثیت مجموعی ذکر کر رہا ہوں اور میں ان کو ”پاک،، اور ”ناپاک،، میں تقسیم نہیں کر رہا۔

مگر میں آپ سے اس بات کو ذہن میں رکھنے کی بھی گذارش کرتا ہوں کہ ہم، پرانی نسل کے مصنف اب بھی کچھ نہ کچھ قدر تو رکھتے ہی ہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہمارے عظیم سوویت یونین کے دوسرے باشندوں کی طرح مصنفین کے نام بھی فوجی خدمت کے رجسٹر میں درج ہیں اور چونکہ کامریڈ گریچکو اور کامریڈ یپی‌شیف ہمیں محفوظ فوج کے زمرے سے خارج نہیں کر رہے اس لئے مراد یہ ہے کہ وہ اب بھی ہمیں کارآمدوں میں شمار کرتے ہیں، ان بوڑھے فوجیوں میں جن پر کسی بھی آڑے وقت میں اور کسی بھی صورت‌حال میں بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ اس بات کا کافی ثبوت نہیں، ہمارے لئے کافی تسکین‌بخش ثبوت کہ ہماری، نہ صرف ہم میں بلکہ دفاع میں بھی اب بھی ضرورت ہے!

آپ تو سمجھتے ہی ہوں گے کہ نئے پنجسالہ منصوبے کا ذکر کرتے ہوئے میں اعداد وشمار اور فی‌صد کی زبان استعمال نہیں کر سکتا۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ اگلے پانچ برسوں میں کتنی بڑی بڑی، منجھولی اور چھوٹی کتابوں کے شائع ہونے کی توقع ہے تو مجھے بھی جواب دینا پڑیگا کہ سوویت یونین کے مصنفوں کا پورا سیکریٹریٹ بھی اس کا جواب نہیں دے پائیگا۔

لیکن بہر حال جو چیز اہم ہوتی ہے وہ تعداد نہیں بلکہ خوبی ہوتی ہے۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ آئندہ پانچ برسوں میں ہم اہم ادبی تخلیقات شائع کریں گے جو قارئین کے اب مقرر کئے ہوئے اعلی فنی اور نظریاتی معیاروں پر پوری اتریں گی۔

ہمارے وعدے کی ضمانت پارٹی اور عوام کے نصب‌العین کے لئے ہمارے وقف ہونے سے اور اپنی پوری قوت اور صلاحیتوں سے کمیونزم کے عظیم تصورات کی خدمت کرنے کی ہماری پرخلوص خواہش سے ہوتی ہے۔

۱۹۷۱ء

تیسرا حصہ

نوجوان

میکسم گورکی کے متعلق تقریر

(اقتباس)

... گورکی ان لوگوں سے پرجوش محبت کرتے تھے جنھوں نے نوع انسانی کے تابناک مستقبل کے لئے جہاد کیا تھا اور اپنی آتش مزاجی کی پوری قوت کے ساتھ لوٹنے کھسوٹنے والوں، دکانداروں اور صوبجاتی روس کے پرسکون دورافتادہ علاقوں میں اونگھتی ہوئی پیٹی بورژوازی سے نفرت کرتے تھے...

نہایت مختلف موضوعات پر معلومات کا گورکی کے پاس جو بےپناہ ذخیرہ تھا اس پر، ان کی انتھک محنت پر اور اپنے سے وہ جو سخت مطالبات کرتے تھے اس پر میں ہمیشہ حیران ہوا کرتا تھا۔

ان کی کتابوں نے روسی پرولتاریہ کو زارشاہی حکومت کے خلاف لڑنے کا سبق دیا۔ میں جب غیرممالک میں گیا تو خود دیکھا تھا کہ گورکی سے جن کی لافانی تخلیقات سے مغربی پرولتاریہ سرمایہ‌داری کے خلاف لڑنا سیکھ رہا ہے وہ کتنا واقف ہے اور ان کو کس قدر پسند کرتا ہے۔

گورکی کو، جو عزم محکم اور کمیاب خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے، ادبی حلقے میں داخلہ حاصل کرنے کے لئے شدید جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ زارشاہی کے زمانے میں عوام الناس میں سے ابھر کر آنےوالے پیدائشی صلاحیتوں کے لوگوں کو پنپنے ہی نہیں دیا جاتا تھا کیونکہ علم کے سرچشموں تک لڑ بھڑ کر پہنچنے کی ان میں سکت ہی نہیں ہوتی تھی۔ پرانا نظام حکومت عام لوگوں میں سے آنےوالوں کی صلاحیت و جوہر کے مظاہر کچل کر رکھدیا کرتا تھا۔ سوویت یونین میں نوجوانوں کے لئے تہذیب کی وہ بلندیاں حاصل کرلی گئی ہیں جن کی پہلے کہیں کوئی مثال نہیں ملتی...

۱۹۳۶ء

ویشنسکایا میں اجتماعی فارم کے کاسک نوجوانوں کے تھیٹر کی پہلی سالگرہ

اپنے وجود کے پہلے سال میں اجتماعی فارم کے کاسک نوجوانوں کے ویشنسکایا تھیٹر نے بہت کچھ حاصل کر لیا ہے۔ ان کی تازہ‌ترین پیشکشوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تربیت کا یہ ایک سال ضائع نہیں ہوا۔ پیشکشوں میں زیادہ تال میل ہے اور اداکاری نے نمایاں طور پر زیادہ پختگی حاصل کرلی ہے۔ پھر بھی اگر تھیٹر کے عملے کو یہ سوچتے ہوئے کہ اب آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں، ناروا گھمنڈ نہ ہو جائے اور اپنے آپ سے مطمئن ہو جانے کی مہلک بیماری میں وہ مبتلا نہ ہو جائیں تو یہ تھیٹر جتنا کچھ حاصل کر سکتا ہے اس کی بہ نسبت یہ بہت تھوڑا ہے۔ اپنے ہنر کو جلا دینے کے لئے ان کو اور بھی محنت سے مطالعہ کرنا ہے اور فن کی حقیقی بلندیوں پر پہنچنے سے پہلے طویل اور دشوار چڑھائیاں چڑھنی ہیں۔ میری دعا ہے کہ اجتماعی فارم کے کاسک نوجوان، جن پر ہمیں بجا طور پر فخر ہے اس میں کامیاب ہوں۔

۱۹۳۷ء

ہم دل وجان سے تمہارے ساتھ ہیں

پیارے سوویت لڑکو اور لڑکیو!

کومسومول اپنی بیسویں سالگرہ منا رہی ہے اور یہ ایک ایسا موقع ہے جسے میں نہیں چھوڑ سکتا۔ خوشیاں مناتے ہوئے نوجوانوں کی ایک بھیڑ کے پاس سے گزرتے ہوئے کوئی بھی بوڑھا آدمی ایک لمحے کے لئے ضرور ٹھیر جائیگا اور اکارڈین کی دھن سنتے ہوئے اور خوش وخرم نوجوان چہروں کی طرف مسکراکر دیکھتے ہوئے اپنی عمر کئی برس چھوٹی محسوس کرنے لگ جائیگا۔ میں بھی، پیارے قارئین، تمہارے بارے میں صرف سوچکر ھی خود کو نوجوان محسوس کرنے لگتا ہوں اور کچھ افسردہ بھی کیونکہ میں تینتیس کا ہو چکا ہوں اور تمہارے شاندار جشن میں تو خاصا بوڑھا نظر آؤں گا۔ میری تسلی صرف ایک اس بات سے ھی ہوتی ہے کہ تمہاری سالگرہ کی دعوت میں جو ہمارے حیرت انگیز جوان سال اور حسین دیس میں ہر جگہ ایک

بڑے جشن کا موقع ہوگا، میری عمروں کے اور مجھ سے بھی بوڑھے دوسرے بھی ہوں گے۔ پرانے کومسومول میمبر ہوں گے — جو اب باریش اور بال بچوں‌والے ہو چکے ہوں گے — اور وہ اپنی نوجوانی میں خانہ‌جنگی کے زمانے کو یاد کریں گے جب انہوں نے اس نصب‌العین کے جس کی وہ حفاظت کر رہے تھے، حق بجانب ہونے سے جوش و خروش حاصل کر کے وائٹ جرنیلوں، کلکوں، ڈاکوؤں اور دوسرے بدمعاشوں کا صفایا کر دیا تھا۔ آج، اپنے شاندار دیس سے سب کے ساتھ فخر محسوس کرتے ہوئے وہ کہیں گے: ”ہم جس چیز کی تکمیل کر رہے تھے وہ حیرت انگیز ہے۔“

پارٹی کی رہبری میں ہمارے نوجوانوں نے خانہ‌جنگی کے محاذوں پر دشمن کا صفایا کیا، اجتماعی فارم قائم کئے، اپنے عالی صنعت تعمیر کی اور ملک گیر پیمانے پر سوشلسٹ مقابلہ بازی کی مہم شروع کر دی۔ ہمارے نوجوانوں کی صفوں ھی میں سے استخانوف اور وینوگرادووا جیسے مزدور آگے آئے اور اب وہ بوڑھے اور تجربہ‌کار لوگوں کو سکھا رہے ہیں کہ کام کیسے کیا جائے۔

بالشویزم کی تخم ریزی واقعی زرخیز زمین پر ہوئی ہے!

مستقبل تمہارا ہے اور ہم، عمررسیدہ لوگ، دل‌وجان سے تمہارے ساتھ ہیں!

۱۹۳۸ء

ویشنسکایا میں اجتماعی فارم کے کاسک نوجوانوں کے تھیٹر کی دوسری سالگرہ

ساتھیو،

آج ہم اجتماعی فارم کے کاسک نوجوانوں کے ویشنسکایا تھیٹر کی دوسری سالگرہ منا رہے ہیں۔ آپ سب کو یاد ہوگا کہ تہذیبی مرکزوں سے دور گاؤں اور نگلوں میں کیا حالت تھی۔ کبھی کبھار سفری منڈلیاں آتی تھیں جیسے کوئی کاروباری ذہنیت رکھنےوالا مینیجر بعجلت جمع کر لیتا تھا جس کو غرض صرف اس بات سے ہوتی تھی کہ جتنا زیادہ ہو سکے روپیہ بٹور لیجائے۔ فن سے ان لوگوں کا قطعی کوئی تعلق نہیں تھا اور جو کچھ وہ کرتے تھے وہ آرٹ کی ایک افسوسناک نقل ہوتی تھی۔ یا اچانک ہمارے علاقوں میں کوئی ”جنگی اپاہج“

نمودار ہو جاتا۔ معذوروں کی کسی کارگاہ میں چمچے بناتے بناتے اکتا جانے کے بعد وہ فیصلہ کرتا تماشے دکھا کر لوگوں کا دل بہلایا کروں گا اور بس وہ گاؤں گاؤں، نگلے نگلے گھومتا پھرتا اور تاش کی کھیل اور دوسرے تماشے دکھایا کرتا۔ گانے والوں کی سفری ٹولیاں بھی کبھی کبھی آتیں اور جو موسیقی وہ پیش کیا کرتیں وہ سماعت پر نہایت ہی گراں گزرتیں۔ جیسا کہ مقامی لوگ کہا کرتے تھے اس کو سنکر تو دم گھٹنے لگتا تھا۔ یہاں کے بہت سے باشندوں نے اپنی عمر میں کبھی کسی اداکار کو نہیں دیکھا تھا اور ان کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ تھیٹر کیا چیز ہوتی ہے۔ نہ صرف اجتماعی کاشتکار نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا بلکہ ہمارے لڑکے لڑکیوں نے بھی اسکول میں جاکر تعلیم حاصل کی، بڑے ہو گئے اور انہیں کبھی تھیٹر کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔

یہ تھیٹر ہماری پارٹی اور ہماری سوویت حکومت نے لوگوں کی تہذیبی نشوونما اور ترقی کی متواتر فکر کرتے ہوئے شروع کیا ہے۔

جشن سالگرہ کی تقریبات کا دستور ہوتا ہے کہ تعریفیں کی جائیں، آداب و تسلیمات قبول ہوں۔ یہ جشن نہایت ہی پرمسرت تقریب ہے۔ اس تھیٹر کی کمپنی نے اپنا کام بحسن وخوبی انجام دیا ہے۔ اور قدرتی بات ہے کہ ہم ان کو مبارکباد دیتے اور ان کی واہ واہ کرتے ہیں۔ لیکن اپنے تھیٹر کی مزید نشوونما اور ترقی کے لئے ہمیں سنجیدگی سے بات چیت کرنی ہے۔ اب بھی اس کی شیرخواری کا زمانہ ہے۔ لیکن ہر بچے کی طرح اس کو بھی نشوونما پانی ہے۔ ہمارے ملک میں اٹھارہ برس کی عمروالوں کو بالغ شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن ہماری خواہش یہ قطعی نہیں ہے کہ اپنے تھیٹر کے بالغ ہونے کے لئے سولہ برس تک انتظار کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے ترقی کرےگا اور زیادہ عرصہ گزرنے سے قبل ہی سن بلوغیت حاصل کر لیگا۔

تو پھر تھیٹر کو کیا کرنا چاہیئے؟ صرف اچھے ڈراموں پر ہی کام کرو — سب سے اہم بات یہی ہے۔ جدید ڈراموں کا بڑی احتیاط کے ساتھ انتخاب کرنا چاہیئے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وقت کے اہم موضوع پر مبنی ہونے کے باعث برے ڈرامے اسٹیج تک پہنچنے کی راہ تلاش کر لیتے ہیں۔ ہر اہم موضوعاتی ڈرامہ اچھا ڈرامہ نہیں ہوا کرتا۔ ہمارے تماشائی گریبوئیدوف، گوگول، اوستروفسکی کے اور

مغربی کلاسیکی ڈرامے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اوستروفسکی کے دو ڈرامے اب تک پیش ہو چکے ہیں اور دیکھئیے وہ کتنے مقبول ہوئے!

اس مسئلے پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے کہ ہم اپنے کھیل انتہائی دورافتادہ اجتماعی فارموں تک کیسے لیجائیں۔ ہمارے تھیٹر کو ان کے پاس کنسرٹ، بے احتیاطی کے ساتھ اندھادھند سے جمع کی ہوئی کچھ پیشکشوں کو لے کر نہیں پہنچنا چاہیئے بلکہ مکمل اور اچھے ڈرامے لیجانے چاہیئیں۔ آپ کا نصب العین یہ ہے کہ عوام الناس میں عظیم اور حقیقی آرٹ کو مقبولیت دیں۔

فنون لطیفہ کی علاقائی انتظامیہ، معلوم ہوتا ہے کہ اس تھیٹر کی اہمیت کو اصلیت سے کم آنکتی ہے۔ آرٹ ڈائریکٹروں کی باربار تبدیلی کمپنی کے کام کی خوبی پر برا اثر ڈالتی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ انتظامیہ ایک ایسے آرٹ ڈائریکٹر کا تقرر کرے جو یہاں کئی برس تک کام کرنے کو راضی ہو، ایسا شخص جو اپنے پورے علم اور تمام صلاحیتوں کو حقیقی معنوں میں پکے پورے تھیٹر کی تعمیر میں بخوشی صرف کر دے اور جو اس کمپنی سے محبت کرنے لگ جائے اور اس سے جدائی اس پر بار گزرے۔

مجھے یقین ہے کہ ہمارے ویشنسکایا میں آرٹ کا جو ننھا سا شعلہ روشن ہوا ہے وہ جلدی ہی ہمارے علاقے کے اضلاعی مرکزوں میں بھی پھیل جائیگا۔ اور آرٹ عوام الناس میں گہرائیوں تک سرایت کر جائیگا۔

ویشنسکایا تھیٹر ہماری امیدیں پوری کرےگا، سوشلسٹ حقیقت پسندی کا تھیٹر، اعلی درجے کی پیش کشوں کا تھیٹر بن جائیگا۔

آئیے، ہم دعا کریں کہ ہمارا تھیٹر اتنا اچھا کام کرے کہ لوگوں میں اس کی مقبولیت کو چارچاند لگ جائیں!

۱۹۳۹ء

تمہاری باوفا ساتھی

نوع انسانی کے سپوت، وہ لوگ جنہوں نے دنیا میں ہر جگہ محنت کش عوام کی مسرت کے لئے جدوجہد کی اور آجکل کر رہے ہیں بچپن ہی سے کتابوں کے بےحد شوقین رہے ہیں اور کتابوں کی مدد سے انہوں نے زندگی کے متعلق اپنے علم میں بےحد اضافہ کیا ہے۔

علم کی روشنی جو پہلے تاریکی میں ایک شگاف کے اندر سے چمکتی ہوئی سی نظر آتی ہے، اس بچے کو حیران و ششدر کر دیتی ہے جو الگ الگ اور اتنے سحرانگیز حروف کو یکجا کرکے وہ الفاظ بنانے کی پہلی کوشش کر رہا ہو جو اس کی سمجھ میں آتے ہیں۔ پیارے لڑکو اور لڑکیو، تم اس منزل سے، جو چاہے بہت قریب کی ہے، گزر چکے ہو۔ اب جو تم اپنے سامنے دیکھ رہے ہو وہ شگاف میں سے چمکتی ہوئی روشنی نہیں ہے بلکہ جھمجھماتی ہوئی دنیا میں، اس زندگی میں کھلنے والا ایک بڑا سا دروازہ ہے جس کے قوانین پر اب تمہیں عبور حاصل کرنا ہے اور جس کی اب تم، کمیونزم کے شاندار تصورات کی ہدایت میں تعمیر کروگے۔

یہ بات ہرگز فراموش نہ کرنا کہ روشنی اور علم کی اس دنیا کے دروازے بلا استثنا تم سب کے لئے کھولنے کی غرض سے اور یہ دروازے کھلے رکھنے کے لئے تمہارے بزرگوں، تمہارے باپ دادا اور بڑے بھائیوں کو بہادری کے ساتھ لڑائیاں لڑنی پڑی تھیں جن میں بڑی قوت صرف ہوئی تھی اور ان کا بہت خون بہا تھا۔

تمہیں چاہیئے کہ روشنی کی طرف بہادری کے ساتھ قدم بڑھاؤ اور دل و جان سے کتابوں سے محبت کرو! کتاب تمہاری بہترین دوست ہی نہیں بلکہ ساری عمر کے لئے تمہاری باوفا ساتھی بھی ہوتی ہے۔

۱۹۵۲ء

قزاخستانی مصنفوں کی تیسری کانگرس میں تقریر سے اقتباس

....یہ کہنے کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ بیس تیس برس پہلے ہم جو کچھ لکھا کرتے تھے اب اس سے بہتر لکھنا چاہیئے۔ ہمارے قارئین کی تہذیبی ضرورتیں جو بےحساب بڑھ گئی ہیں، ہم سے یہی مطالبہ کرتی ہیں۔ اور یہ بھی کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان حالات کے تحت دوستانہ تنقید انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔ جمے جمائے اور نوجوان مصنفوں دونوں کی تنقید کرنی چاہیئے۔

لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں، تنقید میں فرق ہوا کرتا ہے۔ اپنی تقریر میں مختار عیونوف نے بالکل درست کہا کہ تنقید آپ اسی کی کرتے ہیں جسکی پروا کرتے ہوں، جس کے لئے فکرمند ہوں۔

15—95



قزاق نوجوانوں کے بلغاریائی سوویت کلب کے ایک اجلاس میں۔

شولوخوف تقریر کر رہے ہیں۔





اپنے گھر میں۔

اجتماعی کسانوں کی تیسری کل یونینی کانگرس میں شولوخوف تقریر کر رہے ہیں۔



ایسی دوستانہ تنقید کی ایک مثال ان تجویزوں میں ملتی ہے جو قزاخستان کے سربرآوردہ ادیبوں نے پیش کی ہیں۔ اگر ان کی تجاویز میں قدرے تیکھاپن ہے تو اس کی محرک اپنے ساتھیوں کے ادبی مستقبل کے بارے میں ان کی فکرمندی ہے۔

ثابت مقانوف کے بارے میں لیوژی منبیب کے مضمون کا جو "لٹیراتورنایا گزیتا" میں چھپا تھا، معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اس میں جس طنزآمیز تنقید کو اس بات کی خواہش کسی طرح تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ایک ساتھی کو اپنی کتاب کی کوتاہیاں دور کرنے میں مدد دی جائے۔ اس مضمون کے پیش نظر مقصد مصنف کی مدد کرنا نہیں بلکہ اس کو ختم کرنا ہے۔

جب کوئی مصنف جان بوجھ کر نظریاتی اعتبار سے نقصان دہ کتاب لکھتا ہے اور کسی نہ کسی بہانے ایسے نظریات کی تبلیغ کی کوشش کرتا ہے جو سیاسی اعتبار سے عوام اور پارٹی کے لئے ضرر رساں ہیں تو میں ایسی تنقید کے حق میں پوری طرح ہوں جس کا مقصد بیخ کنی ہو۔ اس صورت میں نرمی اور شائستگی سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور قلم کو مہلک ہتھیار کی طرح استعمال کرنا قطعی جائز ہے۔ لیکن جب ہمارے مصنفوں میں سے کوئی ٹھوکر کھا کر پڑے، تو اس کی دوستانہ مدد کرنی چاہیئے، اس کو بتانا چاہیئے کہ اس سے غلطی کہاں سرزد ہوئی تاکہ آئندہ وہ اسی قسم کی غلطی نہ کرے۔ اگر وہ اپنے متعدد ساتھیوں کی رائے پر کان دھرنا کسرشان سمجھے تو اس کو اجتماعی امداد منظور کرنی ہی پڑے گی اور اس کی کتاب پر وسیع پیمانے پر تخلیقی مباحثہ اس کو صحیح اور غلط کی پہچان کرنے میں مدد دینے کا بہترین طریقہ ہوگا۔ مغرورترین آدمی بھی، بشرطیکہ قدرت نے اسے عقل‌سلیم بخشنے میں کوتاہی نہ کی ہو تو سمجھ جائیگا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ صرف "سارجنٹ قدم ملائے چل رہا ہو اور پوری کمپنی کے قدم گڑبڑ ہوں"۔

ایک ایسی تنقید کی مثال کے طور پر جو زیادہ بااصول نہیں ہے ایلیا اہرن‌برگ کے ناول "برف پگھلی" پر کانستنتین سیمونوف کے مضمون کا نام لیا جا سکتا ہے۔ سیمونوف نے اس کتاب کی خامیوں کا صاف صاف اور تیکھے انداز میں ذکر کرنے کے بجائے ان کی لیپاپوتی کرنے کی کوشش کی ہے۔ جی نہیں، سیمونوف جب یہ مضمون لکھ رہے تھے تو ان کے پیش نظر ادب کی بھلائی نہیں تھی۔

نوجوان مصنفوں کی تخلیقات پر تبصرہ کرتے ہوئے نقادوں کو چاہئے کہ ان کے ساتھ پدرانہ سختی اور احتیاط کا برتاؤ کریں۔ ایک دفعہ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ سنہری شاہین اپنے بچوں کو اڑنا کیسے سکھاتا ہے۔ وہ ان کو پہلے تو اپنے پر مار کر اڑاتا ہے اور پھر نیچے اترنے نہیں دیتا بلکہ اوپر اور اوپر پرواز کرنے پر مجبور کرتا ہے اور اس وقت تک اڑاتا رہتا ہے جب تک کہ وہ تھک کر بے دم نہ ہو جائیں۔ صرف اس طرح سے ہی سنہری شاہین کے بچے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرنا سیکھ پاتے ہیں... اپنے نوجوان مصنفوں کو سکھانے کا ہمیں یہی طریقہ اپنانا چاہیئے، انہیں بلند سے بلندتر پرواز کرنے پر مجبور کرنا چاہیئے تاکہ انجام کار وہ ادب کے حقیقی شاہین بن جائیں اور بھیگے کوے یا پالتو مرغیاں نہ بنیں۔ لیکن سنہری شاہین پہلی کوشش میں مطلوبہ بلندیوں تک پرواز نہ کر سکنے یا اس سے خوفزدہ ہونے پر اپنے بچوں کے پر توڑ نہیں ڈالتا۔ نقادوں کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ ابھرتے ہوئے مصنفوں کے پر توڑ ڈالیں۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی حد سے زیادہ پرعزم نقاد کسی نوجوان مصنف کے سر پر موٹا سا ڈنڈا مار دیگا، اس کا رہا سہا اعتماد بھی ختم کر دیگا اور پتہ نہیں پھر یہ شاہین زادہ ہمت پرواز کر بھی سکے یا نہیں۔

میں اس اندیشے سے متفق نہیں ہوں کہ نوجوان مصنفوں کو اچھا معاوضہ لازماً ان کے دماغ آسمان پر چڑھا دیگا اور ان کی تخلیقی قوت کمزور پڑ جائیگی۔ صحتمند اخلاقی اصولوں والے کسی شخص کا چاہے وہ نوجوان ہو یا بوڑھا دماغ آسمان پر نہیں پہنچیگا خواہ وہ کتنی ہی شہرت اور ناموری کیوں نہ حاصل کر لے۔ اور ایک ایسا شخص جس کی روح میں گھن لگا ہوا ہو وہ اپنے گہوارے ہی میں کیمنلی ہو جائیگا....

زندگی میں صورت حال یوں بھی ہوتی ہے: کوئی نوجوان مصنف اوسط درجے کی کتاب تصنیف کرتا ہے اور فرض کیجئے تین برس کی اس محنت کے بدلے اس کو حقیر معاوضے کی صورت میں ملتا ہے۔ یہ کتاب دوسرے ایڈیشن کے قابل تصور نہیں کی جاتی اور مصنف اپنی غلطیاں درست کرنے کے لئے پورا وقت صرف کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا اور نئی کتاب لکھنے کی تو اس کو مہلت ہی نہیں ملتی کیونکہ پچھلے تمام قرضے چکانے کے بعد اس کے پاس صرف اتنا بچتا ہے

کہ تن کے ٹکڑے نہ بکیں۔ اور اس طرح وہ ادب کو خیرباد کہہ بیٹھتا ہے، غالباً پھر کبھی اس کی طرف رخ نہ کرنے کے لئے۔

اور میں جو آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے: بڑے مصنفوں میں سے کونسا ہے جس نے شاہکار تخلیقات سے آغاز کیا ہو؟ عموماً ان کی پہلی کوششیں ہمیشہ ہی اوسط درجے کی ہوتی ہیں۔

آپ چاہے کچھ کہیں مگر میں تو اس بات کے حق میں ہوں کہ واجب التعظیم مصنفوں کو، اور خصوصاً واجب التعظیم ڈرامہ نگاروں کو، نوجوانوں کے فائدے کے لئے حق محنت کے معاملے میں ذرا بھینچنے۔

مستقبل کی ہماری امیدیں ان سے وابستہ ہیں اور وہی ادب کو بوڑھا نہ ہونے دیں گے...

۱۹۵۳ء

عوام کے لئے لکھنا ایک بڑا اعزاز ہے

(روستوف اور کامینسک علاقوں کے نوجوان مصنفوں کے سیمینار میں تقریر)

پیارے دوستو! ہم سب جو یہاں جمع ہوئے ہیں، وہ لوگ ہیں جو مختلف اصناف میں اور مختلف طرز تحریر میں تصنیف کرتے ہیں، ایک ہی سے نظریات کے حامل ہیں اور ایک ہی سی خواہش رکھتے ہیں کہ عوام سے حقیقت بیانی کریں۔ ہماری ذمہ داری بے پناہ ہے۔ کیونکہ عوام کے لئے لکھنا ایک بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ میں کامریڈ میخائلوف کی، جو ایک نوجوان شاعر ہیں، نظمیں اور ان پر ان کے ساتھیوں کی سخت تنقید سن رہا تھا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ ان کی شاعری میں پانی حد سے زیادہ ہے۔ فاضل پانی تو جب چاہیں نچوڑ کر نکال سکتے ہیں۔ جو چیز اہم ہے وہ یہ کہ یہ نوجوان شاعر، اپنے بزرگ ساتھیوں کی طرح، عوام سے سچ بات کہنا چاہتا ہے۔

عوام کے روبرو ایک مصنف کی ذمہ داری بڑی، بہت ہی بڑی ہوتی ہے۔ ہم سب کو مل کر اور فرداً فرداً ہم میں سے ہر ایک کو عوام کا ضمیر ہونا چاہیئے۔ اور مجھے، میرے نوجوان دوستو،

تم سے جو کہنا ہے وہ یہ ہے: نوجوان مصنف کو ہمیشہ ہی آسانیاں میسر نہیں ہوتیں۔ اکثر اس کو بہت سی مشکلیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن پھر بھی تمہارے ذہن میں جس چیز کی ابھی پوری طرح تشکیل نہیں ہوئی ہے اس کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں عجلت سے کام نہ لو۔ تم جو کتاب تخلیق کرو اسے دل پر اثر کرنا چاہیئے اور طویل زندگی پانی چاہیئے۔

ادب میں روزبروز نیا خون آرہا ہے اور روستوف کے مصنفوں کی انجمن کے میمبروں کی تعداد بتدریج بڑھتی جا رہی ہے۔

روستوف میں جنگ سے پہلے بھی مصنفوں کے ستاروں کا ایک روشن جھگمٹ تھا۔ شاعر گریگوری کاتس تھے اور قابل تعریف نثرنگار الکساندر بوسیگین تھے۔ وہ دونوں بےجگری سے مادروطن کی حفاظت کرتے ہوئے لڑائی میں کام آئے۔ نئے، نوجوان ادیب ان کی جگہ پر کرنے صفوں میں آگئے اور تم بھی، انجام کار، اپنے بزرگ ساتھیوں کی جگہ لوگے۔ ہم سب مل کر سوویت مصنفوں کی ایک عظیم فوج ترتیب دیتے ہیں، گویا کہ ایک طاقتور ادبی فوجی دستے کے ''مکرے'' کی تشکیل کرتے ہیں۔

اب تم یہاں ہماری تخلیقی کوششوں کے بارے میں بات چیت کرنے جمع ہوئے ہو۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ ان مسئلوں پر گرما گرمی اور جوش وخروش کے ساتھ بحث کرنی ہے۔ تمہیں اپنا کام جی جان سے کرنا چاہیئے، اور ہمارے دشوار پیشے کے لئے تمہیں تن من سے اپنے آپ کو وقف کر دینا چاہیئے۔

میں ایک بار پھر تمہیں خبردار کرنا چاہتا ہوں: شروع شروع میں تمہیں چاہے کیسی ہی مشکلوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے، سہل کامیابی کی جستجو ہرگز نہ کرنا۔ آخرکار تمہیں ہی ہماری جگہ لینی ہے، تم ہی ہماری امید کا مرکز ہو۔ تم ہی ہمارے مستقبل ہو۔ ابھی سے تم میں سے بہتوں کا حال بن چکا ہے، اور تم سب کا مستقبل ہے، ایک مصنف کا مستقبل۔ تم ایک شاندار قوم کے شاندار نمائندے ہو۔ میرے پیارے دوستو، میں تمہاری بھلائی کا خواہاں ہوں، میں تمہاری کامیابی اور عظیم الشان کارہائے نمایاں کا متمنی ہوں!

۱۹۵۵ء

نوجوان مصنفوں کی تیسری کل یونینی کانفرنس میں تقریر

ہم مصنفوں کی قیادت میں میرے دوست یہ اصرار کر کے میرے لئے بڑی الجھن پیدا کر دیتے ہیں کہ نوجوان مصنفوں سے مجھے کوئی ''گہری'' عالمانہ باتیں کرنی چاہیئیں۔

''دراصل، کیا؟''

''بھئی، یہی کہ ان کو بتاؤ مصنف کا کام آسان نہیں ہوتا، یہ کہ بعض اوقات بڑا ہی دشوار ہوتا ہے، یہ کہ ادب ایک مقدس عمل ہے وغیرہ وغیرہ۔''

تو لیجئے میں حاضر ہوں، اور ہوتا کیا ہے؟ میرے روبرو ۳۶۰ سب سے زیادہ باصلاحیت اور سب سے زیادہ قابل نوجوان مصنفین بیٹھے ہیں۔ اور کیا ایسے لائق لوگوں کے سامنے مبادیات کے متعلق وعظ پڑھنے کے کوئی معنے ہیں؟ چنانچہ میں ان کے سامنے اسی طرح بولنےوالا ہوں جیسے برابر کے لوگ اپنے برابر کے لوگوں سے بات چیت کرتے ہیں۔

ادب کے اور اس موجودہ کانفرنس کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ میں کامریڈ اژائیف سے جنہوں نے یہاں تقریر کی ہے کچھ معاملوں پر متفق نہیں ہوں۔

مثلاً میں ان کی تقریر کے اس حصے سے اتفاق نہیں کرتا جہاں انہوں نے کسی بھی کتاب کی تعریف کرتے ہوئے اس کی عیب جوئی کرنا ضروری سمجھا ہے۔ انہیں اسے سیمینار تک اٹھا رکھنا چاہیئے تھا جہاں کتاب کی تمام خوبیوں اور خامیوں، مصنف کے طرز تحریر اور تمام تخلیقی اجزاء پر تفصیلی بحث ہوگی۔

کیا اس منبر سے تمام تفصیلات اور جزئیات کا ذکر کرنا ضروری تھا؟

میرا خیال تھا کہ کامریڈ اژائیف نے گورکی کا نہایت موزوں حوالہ دیا تھا کہ درختوں کی چھال کاٹنے کا طریقہ آنا ایک بات ہے اور اس چھال کو بنکر جوتے بنانا دوسری بات۔

میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ اسی تشبیہہ کو جاری رکھیں تو بہترین طریقہ یہ ہے کہ جنگل کے کسی مانوس مقام پر درختوں کی چھال کاٹنا اور کام کو مکمل طریقے سے انجام دینا اس کی بہ نسبت

بہتر ہوتا ہے کہ تھوڑا ایک جگہ کیا جائے اور تھوڑا دوسری جگہ۔ اپنی بات کی وضاحت کے لئے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ ہمارے مصنفین، بزرگ اور نوجوان یکساں، ان علاقوں کی طرف دوڑ پڑے جہاں اچھوت زمینوں کو زیرکاشت لاکر فروغ دیا جا رہا تھا تاکہ وہاں جا کر موضوعات اور پلاٹ تلاش کریں اور نتیجہ کچھ اچھا برآمد نہیں ہوا ہے، درحقیقت بہت سی صورتوں میں تو خاصا افسوسناک رہا۔ انہوں نے وہاں ایک یا دو مہینے قیام کیا یا غالباً چھ مہینے بھی اور خاصے بہت سارے درختوں کی چھال اتار لی لیکن ان کو ابھی تک یہ نہیں آیا کہ اس چھال سے جوتے کیسے بنیں۔

آپ میں سے بیشتر وہ لوگ ہیں جو صوبجات سے آئے ہیں اور یہ بہت ہی اچھی بات ہے کیونکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ آپ زندگی سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔

میں جس چیز سے آپ کو خبردار کرنا چاہوں گا وہ معمر نوجوان ادیب، یوں کہنا چاہیئے ادب میں نوجوان خرانٹ بنتا ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ میں تخلیقی پختگی جلد آجائے۔ اس کا صرف ہم مصنف ہی نہیں بلکہ قارئین بھی — ہمارے سخت گیر دلچسپی رکھنے والے قارئین بھی خیرمقدم کریں گے جو غالباً دنیا میں سب سے زیادہ نکتہ سنج قارئین ہیں۔

اور اسی سلسلے میں ایک اور بات بھی ہے: برائے مہربانی بڑھاپے تک بچوں کا لباس زیب تن مت کئے رہیئے، کیونکہ ہم میں اب بھی کچھ مصنف ایسے ہیں جو، مجھے افسوس ہے کہ، ایسا کرتے ہیں۔

اپنی مختصر تقریر کے آخر میں دعاگو ہوں کہ محض اس سال ہی نہیں بلکہ آئندہ پوری زندگی میں آپ کو اپنے کام میں اور بھی جرأت آزما اور عظیم کامیابیاں حاصل ہوں۔

۱۹۵۶ء

دوستی کبھی نہ بھولو

اس جشن کے تمام شرکاء کو، اپنے پیارے نوجوانوں اور اپنے پیارے مہمانوں کو میں گرمجوشی سے گلے لگاتا ہوں۔ "گلے لگانے" کے نام سے آپ پریشان نہ ہوں: میں جانتا ہوں کہ یہاں، ماسکو میں آپ لوگ اتنی کثیر تعداد میں جمع ہیں کہ سب کو واقعی گلے لگانا

ایک آدمی کے بس کی بات ہرگز نہیں ہے۔ لیکن تمام مصنفوں کی طرح میرا دل اس قدر پیار بھرا ہے کہ اگر آپ موجودہ تعداد سے دگنے بھی ہوتے تو پھر بھی خیالی طور پر میں سب کو گلے لگا لیتا!

افسوس کہ یہ ۱۹۵۷ء ہے ۱۹۲۷ء نہیں کیونکہ تیس برس پہلے میں اس اجتماع کا پورا اور برابر کا شریک ہوتا اور معمر مہمان نہ ہوتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گیا اور اس بات کا قصوروار صرف میں ہی ہوں۔

مجھے امید ہے کہ آپ اس میلے سے محظوظ ہو رہے ہوں گے اور بڑا مزہ آرہا ہوگا۔ لیکن اس ہنگامی جشن میں آپ کو تمام براعظموں اور ملکوں کے نوجوانوں سے دوستی اور اتحادعمل کو کبھی نہ بھولنا چاہیئے، یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اتحادعمل نوع انسانی کو دنیا میں امن برقرار رکھنے میں مدد دے گا۔

۱۹۵۷ء

ڈان کے اپنے ہموطنوں کے نام

اب جبکہ میں پھر گھر واپس لوٹ آیا ہوں تو اپنے گاؤں والے ساتھیوں کو جلد از جلد مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ روسی فیڈریشن کی مجلس وزراء کے فیصلے کے بموجب کارگینسکایا گاؤں میں اسکول کی نئی عمارت کی تعمیر امسال شروع ہو جائیگی۔ اپنا پورا لینن انعام میں نے نئے اسکول کی تعمیر کے لئے دیدیا ہے جو اس اسکول کی جگہ تعمیر ہوگا جس میں ایک زمانے میں میں نے لکھنا پڑھنا سیکھا۔

کارگینسکایا کے تمام باشندوں کو میرا سلام محبت۔

۱۹۶۰ء

دلی شکریہ

("جب زمین جاگی"، پر لینن انعام پیش کئے جانے کے موقع پر کریملن میں کی جانے والی جوابی تقریر سے اقتباس)

اس یادگار موقع پر میں سب سے پہلے تو سوویت عوام کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے مجھے ایک مصنف کی حیثیت سے اور نئے ناولوں کے لئے مجھے مواد کا ایک لازوال سرچشمہ فراہم کیا۔

میں ان بیشمار دوستوں کا — قارئین کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے لینن انعام کے لئے مجھے نامزد کیا۔

مرکزی کمیٹی اور سوویت حکومت کو میرا تہ‌دل سے شکریہ کہ میری تصنیف کو انہوں نے یہ بلند اعزاز بخشا۔ اور قدرتی طور پر میں لینن انعام کمیٹی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اس بات کے لئے معافی کا خواستگار ہو کر کہ اس کا نام سب سے آخر میں لیا۔

مجھے معلوم ہے کہ جب کسی شخص کو انعام دیا جاتا ہے تو عام رواج کے مطابق وہ وعدہ کیا کرتا ہے کہ آئندہ اتنی ہی محنت سے کام کریگا۔ میری عمر کا اور میرے پیشے کی خصوصیات کا تقاضا ہے کہ اس لحاظ سے میں ذرا زیادہ محتاط رہوں۔

یقیناً مجھ سے ایک اچھے طالب‌علم کی طرح یہ وعدہ کرنے کی توقع تو کوئی نہ کرتا ہوگا کہ اگلے سال جو کچھ بھی میں لکھوں‌گا اس میں سب سے اچھے نمبر حاصل کروں‌گا۔ لیکن ایک انسان کے عزم کے ساتھ اور اپنی صلاحیت و قوت پر قطعی اعتماد کے ساتھ میں آپ سے اتنا ضرور عرض کر سکتا ہوں کہ اپنی پارٹی اور اپنے عوام کی اپنے قلم سے اتنی ہی مخلصانہ خدمت انجام دیتا رہوں‌گا۔

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ قارئین سے میرے تعلقات نہایت خوشگوار ہیں اور بحیثیت مجموعی وہ اچھے ہیں۔ قارئین سے متواتر تعلق اپنی طاقت میں مصنف کے اعتماد کو تقویت بخشتا ہے اور اسے اپنے کام میں مدد دیتا ہے۔ لیکن اپنے کچھ قارئین سے میرے معاملات بالکل خراب تو نہیں ہیں، مگر ان کو کیا کہوں — یوں کہہ لیجئے کہ ہمارے تعلقات قدرے سرد ہیں۔ اکثر جو مطالبات مصنف سے کئے جاتے ہیں وہ خاصے بے‌انداز ہوتے ہیں۔ ایک قاری نے مثلاً نہایت سنجیدگی سے شکایت کی کہ ''یوری سیلوسلافسکی'' کے مصنف نے تو اپنے مرکزی کرداروں کو زندہ رکھا تھا لیکن شولوخوف نے ناگولنوف اور داویدوف دونوں کو مار ڈالا۔ اس نے سوال کیا: ''اس کا سوشلسٹ حقیقت‌پسندی سے بھلا کیا تعلق ہے؟'' یہ اس قسم کا مشورہ نہیں ہے جس پر کان دھرنے چاہئیں۔ اور آئندہ بھی میں اسی طرح لکھوں‌گا جس طرح میں سمجھوں‌گا کہ مناسب ہے۔

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے۔ مجھے لیسٹینغ‌سیرئے کے عملے کی جانب سے ایک غضبناک خط موصول ہوا جس پر کارخانے کے مینیجر اور تین لڑکیوں کے دستخط تھے۔ ان کو غصہ اس بات پر آیا تھا

کہ ''جب زمین جاگی'' میں جہاں میں نے بہت ساری مختلف چیزوں کے بارے میں لکھا وہاں ادویاتی جڑی بوٹیاں جمع کرنے کے ذرائع کا کہیں تذکرہ نہیں کیا۔ یہ بھی ایک ایسا مطالبہ تھا جس پر عمل ناممکن تھا۔ اس قسم کی بہت ساری شکایتیں ہیں۔ لیکن میں ہر ایک کو تو خوش نہیں کر سکتا۔

میرے معاملے میں لینن انعام کا ملنا ایک کڑی جوئی منزل تصور کی جا سکتی تھی۔ میں چاہوں‌گا کہ اگلے سال کوئی نوجوان مصنف (اور اگر ایک سے زیادہ ہوں تو اور بھی اچھا تھا) میری جگہ کھڑا ہو۔

جب ہم نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا تو ہم، پرانی نسل کے مصنفوں کا ضرورت سے زیادہ توجہ دے کر لاڈ پیار نہیں کیا جاتا تھا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ادب کے میدان میں داخلہ پہلے سے زیادہ آسان کر دیا گیا ہے، لیکن جو کچھ ہو رہا ہے وہ بوڑھے کی جگہ نوجوان کو دینے کے منطقی عمل کے مطابق ہے۔ اور میں پوری طرح اس بات کے حق میں ہوں کہ اس منبر پر نوجوان چڑھے۔

میں قطعی طور پر یہ تسلیم کر لیتا ہوں کہ کوئی اور لینن انعام مجھے کبھی نہیں ملیگا لیکن اس بیان سے نتیجہ یہ اخذ نہیں ہوتا کہ ادب میں اپنا مقام میں بغیر کسی معرکے کے چھوڑ دوں‌گا!

یہاں مجھے اپنے رفقائے‌کار، پرانی نسل کے مصنفین نظر آ رہے ہیں اور زندگی اور ادب کے تجربے سے جس قدر لدے پھندے ہیں اس سے میرا خیال ہے کہ لوہا لئے بغیر ہم اپنے مورچے سے ہٹنے‌والے نہیں ہیں۔

میں پوری طرح اس بات کے حق میں ہوں کہ نوجوان ہماری جگہ لے لیں، مگر ہماری قطار میں آن کر کھڑے ہونے سے پہلے انہیں چاہیئے کہ کچھ خون پسینہ ایک کرلیں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ پچھلے برسوں کے لینن انعام یافتگان یہاں موجود ہیں، اور اس میں کچھ برائی نہیں کہ انعام دئے جانے کی تقریب میں ان کی موجودگی ایک روایت بن جائے۔ اگلے سال جب ہمارے نوجوان مصنفوں میں سے کسی کو اس کی محنت کے شایان شان یہ انعام دیا جا رہا ہوگا تو میں بھی ان کے درمیان بیٹھا ہوں‌گا۔

یہ بھی خیال برا نہیں کہ ادب اور فنون لطیفہ میں سوشلسٹ آرٹ کی ابدی مشعل علامتی طور پر دینے کو ایک روایت بنا لیا جائے۔

۱۹۶۰ء

سوویت کمیونسٹ پارٹی کی بائیسویں کانگرس میں کی گئی ایک تقریر سے اقتباس

پیارے کامریڈ ڈیلی گیٹو!

مجھے یقین ہے کہ اگر میں کہوں کہ کانگرس کے ان اہم دنوں میں جبکہ ہم اپنی لیننی پارٹی کا نیا پروگرام منظور کر رہے ہیں، تو ہماری خود زندگی، کل سوویت عوام کی زندگی ایک نئے اور نہایت ہی خاص جذبے میں رچی ہوئی ہے، تو میں اس کا اظہار کر رہا ہوں گا جو ہر فرد بشر محسوس کر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہ تازہ اور فرحت بخش ہوا کا جھونکا آیا ہو جس نے دور کے مسحور کن افق ہماری آنکھوں کے سامنے عیاں کر دئیے ہوں۔ ہمارا تنفس رواں اور گہرا ہو گیا ہے اور ہم اس من پسند مستقبل کے خدوخال واضح طور پر دیکھ سکتے ہوں جہاں آج سے بیس برس بعد ہم یقینی طور پر پہنچ جائیں گے۔

یہ پروگرام واقعی اتنا ہی پرشکوہ اور عظیم الشان اور اپنی تمام تر ماہیت اور ہیئت میں محنت کش نوع انسانی کی مسرت و شادمانی کا نقیب ہے!

تو کیا اس خواہش کا پیدا ہونا فطری نہیں کہ تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کیا جائے جنہوں نے یہ پروگرام مرتب کیا، جنہوں نے حقیقی لینن دوراندیشی کے ساتھ مستقبل قریب و بعید کو پیش نظر رکھتے ہوئے عوام کے خوابوں اور دیرینہ دلی آرزوؤں کو واضح طور پر متعین فرائض کا روپ دیا۔

جب بھی یہ سوچتے ہیں کہ ہماری طاقتور پارٹی نے کیسی کیسی مشکلوں پر عبور حاصل کیا، کیا کیا کچھ حاصل کر لیا اور کیا کیا کچھ اور حاصل کرنا ہے تو ایمان کی بات یہ ہے کہ رقت طاری ہو جاتی ہے کیونکہ سچ مچ یہ بڑا ہی قابل تعریف کارنامہ ہے! اور سچ پوچھئے تو بعض اوقات پارٹی اور سوویت عوام پر اس قدر فخر کرنے کو جی چاہتا ہے کہ دل ہی دل میں بے اختیار، بے تکلفی کے ساتھ یوں تعریف کرتا ہوں: ''واقعی تو خداداد صلاحیتوں والی قوم نہیں تو اور کیا ہے! تجھ میں جناتی طاقت نہیں تو اور کیا ہے! طاقتور بھی ہر جہت سے!،،

ہم سب جانتے ہیں کہ تاریخ نے ہمیں تجویز کیا ہے کہ کمیونزم

کی عمودی چڑھائی چڑھیں۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ کبھی کبھی بڑا صبرآزما دور بھی آئیگا، ایسا کہ منہ خشک ہو جائیگا، ہونٹوں پر پپڑیاں جم جائیں گی۔ لیکن جب ہم چوٹی پر پہنچ جائیں گے تو وہ بے نظیر افق دعوت نظارہ دیں گے جنہیں کسی نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ اور اس بلندی پر چڑھ جانے کے بعد اگرچہ جسم تھک کر چور ہو چکا ہوگا مگر روح ہمیشہ کی طرح تروتازہ ہوگی تو وہیں ایک چشمۂ شفا اور آب حیات ہماری پیاس بجھا دیگا۔

اس چوٹی کا سر کر لینا اپنی عالمگیر اہمیت کے اعتبار سے ایک عظیم اور پرفخر کارنامہ ہوگا، اتنا ہی عظیم جتنا کہ وہ نصب العین جس کے حصول کے لئے ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ مگر پھر عظیم قوم کو عظیم شاہراہ ہی طے کرنی چاہیئے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ بڑے جہاز بڑے بڑے سمندروں میں ہی سفر کیا کرتے ہیں۔

اور کوئی بھی رکاوٹ یا مشکل ہمارے دلیر عوام کی، جن کی قیادت کمیونسٹوں کی نڈر اور دانشمند پارٹی کر رہی ہے، کمرہمت نہ توڑ سکیگی۔ دشمنوں کی سازشوں کے باوجود اور یقین نہ رکھنے والے کم ہمتوں کی بڑبڑاہٹ کے برعکس ہم کمیونزم حاصل کر کے ہی رہیں گے۔ اسے ہم ضرور ہی حاصل کر لیں گے کیونکہ ہمارے عوام کا جو محنت کے کارہائے نمایاں اور مسلح کارہائے نمایاں دونوں شاندار طریقے سے انجام دیتے ہیں ایک کروڑ کمیونسٹوں کا ہراول مستقبل کی راہ روشن کر رہا ہے۔

مصری اہرام اور دوسری قدیم یادگاریں قوموں کی وہ قابل رحم کوششیں نہیں تو اور کیا ہیں کہ نوع انسانی کی تاریخ میں اپنی یاد کو دوام بخشدیں! زمانے کے ساتھ ساتھ یہ ساری یادگاریں غائب ہو جائینگی کیونکہ خاک ہونا اور پیوند زمین بن جانا ان کا مقدر ہے۔ کمیونزم مگر واقعی ایک ایسی لازوال یادگار ہوگی جو زمانے اور قدرت کی قوتوں سے بے نیاز ابد تک قائم رہیگی اسی طرح لافانی جس طرح مقدس نام لینن۔ کمیونسٹ سماج کے تمام معمار زندہ باد! زندہ باد ہمارے غیرملکی برادران، یاران و رفیقان، جو اپنے قول و فعل سے، بے دریغ و بلا پس و پیش ہماری، جو ہراول ہیں جو نگہبان ہیں، مدد کر رہے ہیں۔

جب میں پارٹی کے، پارٹی دوستوں اور رفیقوں کے متعلق سوچتا ہوں تو گوگول کے ناقابل فراموش الفاظ یاد آ جاتے ہیں۔ آپ کو ''تاراس بلبا،، میں وہ حصہ یاد ہے جہاں بوڑھا تاراس دوستو کے مشاغلات

میں لڑائی شروع ہونے سے پہلے زاپوروژیئے کاسکوں کو خطاب کرتا ہے۔ وہ ان سے کہتا ہے: ”دوستی سے زیادہ مقدس رشتہ اور کوئی نہیں ہوتا! باپ اپنے بچے کو پیار کرتا ہے، ماں اپنی اولاد سے محبت کرتی ہے، اور بچہ اپنے ماں باپ سے پیار کرتا ہے۔ مگر بھائیو، یہ تو الگ بات ہے کیونکہ اپنے بچوں سے پیار تو جانوروں کو بھی ہوتا ہے۔ صرف انسان ہی خون کا نہیں بلکہ روح کا رشتہ قائم کر سکتا ہے۔“

ایمان کی بات ہے کہ یہ بڑا ہی شاندار قول ہے۔ ہم، کمیونسٹ مارکس — اینگلس — لینن کے خیالات کے ذریعے، اس تصور کے ذریعے جس کے لئے کمیونسٹ پارٹی ایک فاتحانہ لڑائی لڑ رہی ہے، ایک دوسرے سے متعلق ہو گئے ہیں اور ہمارے لئے اپنی پارٹی رفاقت سے زیادہ مقدس اور کوئی رشتے نہیں ہیں۔ ہم بھی اپنے بچوں اور اپنی بیوی سے محبت کرتے ہیں مگر جیسے کہ تاراس بلبا کہتا ہے: ”مگر بھائیو، یہ الگ بات ہے۔“ اس سے ہمارے بچوں اور ہماری بیویوں کو ناراض ہونا نہیں چاہئے۔ مگر اس کا کوئی چارہ کار نہیں، انہیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑیگا اور بس۔ لیکن یہاں آکر ہی ہار ماننی پڑتی ہے... صاف ظاہر ہے کہ ہماری بیویاں اس تصور ہی سے برا مان جائینگی کہ پارٹی رفاقت کے ہمارے رشتے رشتہ ازدواج سے زیادہ مقدس ہیں۔ شاید میں نے بیویوں کا ذکر کرکے ہی اپنی ٹانگ پھنسالی ہے۔ تاراس بلبا نے درحقیقت ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ اور اب غالباً میں ہی پہلا شخص ہوں گا جسے گیر لوٹنے نی گوگول کی لافانی تخلیق کے اس اقتباس کو ڈھونڈ نکالنے کا خمیازہ بھگتنا پڑےگا۔ لیکن میں خوفزدہ نہیں ہوں کیونکہ مجھے آپ کی پرخلوص ہمدردی پر اعتقاد ہے اور، اس کے سہارے، میں گھربار کی سخت‌ترین صعوبتوں کا بھی مقابلہ کرنے کے لئے ڈٹ جاؤں گا۔ مگر میری آپ سے صرف ایک التجا ہے، آج شب اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھنا نہ بھولئے!

لیکن رفاقت کے جذبات کو ہم اور سرمایہ‌دار مختلف طریقوں سے سمجھتے ہیں۔ اس کی نمایاں مثال او۔ ہنری کا افسانہ ”ہماری راہیں“ پیش کرتا ہے۔ اس افسانے کا پلاٹ نہایت سادہ ہے: تین لٹیرے ایک امریکی ڈاک گاڑی پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ گاڑی کے سنتری کی گولی سے ایک ڈاکو مارا جاتا ہے۔ دوسرے دو مال غنیمت لیکر فرار ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے گھوڑوں پر سوار اڑتے چلے جا رہے ہوتے ہیں کہ

ایک گھوڑا ٹھوکر کھایا کرتا ہے اور اس کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے۔ صرف ایک گھوڑا جس کا نام بولیوار ہے باقی رہ جاتا ہے جو اتنا مضبوط ہے کہ دو آدمیوں کو بآسانی لیجا سکتا تھا۔ مگر اس کا مالک جو اسم باسمی شارک ڈاڈسن کے نام سے موسوم ہے بعد اور ہی فیصلہ کرتا ہے۔ نہایت پرسکون لہجے میں وہ کہتا ہے کہ ”بولیوار دو سواریاں نہیں لیجا سکتا۔“ اور اسی سکون سے اپنے دوست کو گولی مار کر وہیں ٹھنڈا کر دیتا ہے۔

لوٹ کا مال جو ہاتھ آتا ہے اس سے شارک ڈاڈسن ایک خوشحال باعزت بورژوا بن جاتا ہے اور آڑھت کے کاروبار کے لئے اپنا دفتر کھول لیتا ہے۔ جب اس کے دوست ایک اور شخص کو جس نے سرمایہ لگایا ہوا تھا، دیوالیہ ہونے کا سامنا ہوتا ہے تو ڈاڈسن اسی سکون کے ساتھ اس کو دیوالیہ قرار دلوا دیتا ہے جس طرح اس نے اپنے دوسرے دوست کے سینے میں گولی پیوست کر دی تھی اور وہی فقرہ دہرایا: ”بولیوار دو سواریاں نہیں لے جا سکتا“...

اس کانگرس میں تقریر کرنے والوں نے فرقہ‌بندی کرنے والوں کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے، ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے پارٹی رفاقت کے مقدس رشتوں کا مذاق اڑایا ہے۔ یہاں کانگرس میں ہمیں ان کی مجرمانہ سرگرمیوں کے متعلق نئی تفصیلات کا علم ہوا۔ قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے: پارٹی کی صفوں میں ہمیں ان لوگوں کے شانہ بشانہ کب تک کھڑے رہنا ہوگا جنہوں نے پارٹی کو اس قدر ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ کیا ہم ان لوگوں کے ساتھ حد سے زیادہ صبر و تحمل سے پیش نہیں آ رہے جن کا ضمیر پارٹی اور ملک کے ہزاروں وفاشعاروں کی موت اور یوں کام آنےوالوں کے لواحقین کی تباہ‌وبرباد زندگی کے بوجھ تلے دبا ہوا نہیں ہے؟

کانگرس پارٹی کا اعلی‌ترین ادارہ ہوتی ہے۔ اسے چاہئے کہ فرقہ بندی کرنےوالوں اور بھگوڑوں کے متعلق سخت لیکن منصفانہ فیصلہ کرے۔

اور ناگوار لوگوں کے متعلق اس ناگوار گفتگو کو ختم کرنے کے لئے میں آخر میں آپ سے پھر اجازت چاہتا ہوں کہ تاراس بلبا کی تقریر کا ایک اور اقتباس پیش کروں جہاں وہ دوستی کا ذکر کرتا ہے۔

بوڑھے تاراس بلبا نے بھی اپنے زمانے میں فرقہ بندی کرنے والوں کے خلاف جدوجہد کی تھی، فرق یہ ہے کہ ان دنوں وہ منحرف کہلاتے

تھی - اور اس نے جو کہا تھا وہ یہ ہے: ''لیکن بدترین منحرف میں، چاہے وہ کتنا متعفن کیوں نہ ہو گیا ہو، چاہے وہ غلاظت میں لتھڑا ہوا ہو اور شیطان کی پرستش کر رہا ہو، اس میں بھی بھائیو روسی ہونے کا ذرہ برابر احساس ضرور ہوتا ہے - یہ احساس اس میں ایک نہ ایک دن ضرور بیدار ہوگا اور وہ بیچارہ بدحال سربسجود ہو جائیگا، اپنے سر کو ہاتھوں میں تھام لیگا اور پکار پکار کے اپنی بزدلانہ زندگی کو کوسیگا اور اپنی شرمناک حرکتوں کی کوئی بھی سزا بھگتنے کو تیار ہوگا - ''

لیکن ظاہر ہے زاپوروژیئے کاسکوں میں سے جن لوگوں نے غداری کی تھی یہ بات ان کے متعلق کہی گئی تھی اور یہ مسئلہ بحث‌طلب ہے کہ آیا آج کے بھگوڑوں میں اتنی جرأت ہوگی کہ وہ ''پکار پکار کے اپنی بزدلانہ زندگی کو کوسیں'' اور آیا وہ ''اپنی شرمناک حرکتوں کی کوئی بھی سزا بھگتنے کو تیار ہوں - '' نہ جانے کیوں ایسا لگتا ہے کہ وہ ایسا نہیں کریں گے - یہ اس خمیر کے نہیں ہیں - بھگوڑے تو وہ ضرور ہیں مگر مختلف چھاپ کے - بہرحال وقت سب کچھ بتا دیگا -

بورژوا اخبارات جو غل مچائیں گے اس کا تصور کیا جا سکتا ہے: دیکھئیے یہ کمیونسٹ مصنفین اصل میں کیسے ہیں - انسانی محبت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے جس کا تقاضا ان کا پیشہ کرتا ہے یہ لوگ بدلہ لینے کا مطالبہ کر رہے ہیں! تابعدار بورژوا تحریرفروشوں میں سے کوئی اس قسم کی بات ضرور لکھیگا - ان کے لئے میرے پاس جواب تیار ہے - ''کم ظرف حضرات، اپنے جامے میں رہئیے، بدلہ کوئی نہیں لے رہا، فرقہ بندی کرنےوالوں کا سازشی زہریلا خون کسی کو نہیں چاہئیے، لیکن عوام اور پارٹی کے خلاف جنھوں نے جرائم کا ارتکاب کیا ہے ان کو اس کا جواب دہ ضرور ہونا پڑیگا - یہ وہ قانون ہے جو ساری انسانیت پر یکساں عائد ہوتا ہے - ''

رفاقت کی طرح انسان دوستی بھی ایک ایسا تصور ہے جسے ہم اور سرمایہ‌دار یا ان کے عالمی نقطۂ نظر سے اتفاق رکھنےوالے لوگ مختلف طریقے سے سمجھتے ہیں - دندان سازوں کی طرح خراب دانت کو ہم نکال دیتے ہیں جو تندرست اور صحت‌مند اعضاء کو تکلیف پہنچاتا ہے اور یہ فعل انسان دوستانہ ہوتا ہے - موازنے کے لئے انسان دوستی کے مختلف تصور کی ایک اور مثال پیش کرتا ہوں - جب میں اٹلی گیا تھا تو روم کے نواحی علاقے میں ایک شاندار عمارت کی طرف

توجہ گئی - مجھے بتایا گیا کہ یہ بلیوں کا سینی‌ٹوریم ہے - ظاہر ہے ان دبلی پتلی، مریل بلیوں کے لئے نہیں جن سے شہر کی گندی بستیوں میں بھوکے، کمزور بچے کھیلا کرتے ہیں - بلکہ نرم نرم گدگدی بلیوں کے لئے جو اطالوی اور دوسرے کروڑپتی خواتین و حضرات شوقیہ پالتے ہیں -

ان بلیوں کا علاج جو بیکاری اور موٹاپے سے بیمار ہو جاتی ہیں تجربےکار ڈاکٹر کرتے ہیں، تربیت‌یافتہ نرسیں انہیں نہلاتی دھلاتی ہیں، برش کرتی ہیں اور انہیں خوشبو میں بساتی ہیں، اور ان ملعون مریضوں کو طرح طرح کی لذیذ غذائیں دیتی ہیں، انہیں ہواخوری کو لے جاتی ہیں، غرض ہر طرح ان کی مدارات کرتی ہیں - اور وہاں سے تھوڑی ہی دور بھوکے بچے کوڑے کے ڈھیروں کو کھنگال رہے ہوتے ہیں، دھنسی ہوئی آنکھوں میں غیرطفلانہ نا امیدی لئے آتے جاتوں کو گھور رہے ہوتے ہیں - کیا اس کو انسان دوستی کہتے ہیں؟ ہماری زبان میں اسے بددماغوں کی رذالت کہتے ہیں - سرمایہ‌داروں کو چاہئیے کہ لفظ ''انسان دوستی'' کو اپنے لغت سے نکالدیں کیونکہ یہ انسان کے بھیس میں درندوں کے استعمال کےلئے نہیں ہے -

پیشہ‌ور مصنف کی حیثیت سے مجھے ادب کے متعلق بات کرنی چاہئیے لیکن آپ سب کی طرح میں سب سے پہلے کمیونسٹ ہوں اس لئے میں نے آغاز اسی سے کیا جس سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوں حالانکہ میں یہ ایک لمحے کےلئے بھی فراموش نہیں کر رہا کہ ادب بھی عام پارٹی نصب العین کا ایک جزو ہے - قصہ مختصر یہ کہ میں اس طویل تعارف کےلئے آپ سے معافی کا خواستگار ہوں اور میں ادبی معاملات پر آتا ہوں...

بہت ساری ایسی کتابیں شائع ہوتی ہیں جو بہت جلدی ہی گویا دوبارہ پگھلانے کے لئے کٹھالی میں ڈالدی جاتی ہیں - وجہ؟ وجہ ہم سب کو معلوم ہے - گھٹیا تخلیق اور بڑھیا تخلیق کے لئے قارئین کی مانگ کے درمیان عدم توازن - پھر بھی پہلی سرسری نظر میں صورت‌حال جتنی تباہ‌کن معلوم ہوتی ہے اتنی ہے نہیں - نہایت ہی خوش آئند عمل جاری ہے جو قارئین کو کم ہی محسوس ہوتا ہے: نوجوان اور حقیقی معنوں میں خداداد صلاحیت رکھنےوالے مصنفین کا پورا ایک گروہ ایسا ہے جن کے افسانے رسالوں میں شائع ہوچکے ہیں اور جو پختہ اور ہونہار باکمالوں میں تبدیل ہوتے جارہے

ہیں- یہ صرف روسی نہیں بلکہ سوویت یونین کے تمام قومی ادیبوں کی بھی خصوصیت ہے- یہاں میں ان کے نام نہیں گنوا رہا کیونکہ قارئین ان کے ناموں سے بخوبی واقف ہیں اور میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ صرف یہی ہے: ان کی ہر طرح سے مدد کرنی چاہئے تاکہ انہیں دو تین سال تک کام کرنے کا موقع مل جائے اور انہیں مستقبل کی فکر نہ کرنی پڑے، اور جن بڑی تصانیف پر انہوں نے کام شروع کیا ہے اور جن کی تصویر عرصۂ دراز سے ان کے ذہن میں محفوظ تھی، اور جن کے لئے انہوں نے نہایت مہارت کے ساتھ مواد اکٹھا کیا ہے، اس سے ان کو الگ نہ ہٹنا پڑے-

اگر ہم یہ مدد صرف ان مصنفوں تک ہی محدود نہ رکھیں جو صدرمقاموں میں رہتے ہیں بلکہ ان صوبجاتی لوگوں تک بھی پہنچائیں جو ملک بھر میں بڑی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں تو ایسے مصنفوں کی تعداد میں قابل لحاظ اضافہ ہو جائے- یہ سب کے سب اپنے تجربے سے زندگی کو اچھی طرح جانتے ہیں، انہوں نے بہت سے سفر کر رکھے ہیں اور بہت کچھ دیکھ رکھا ہے، لیکن خاص بات یہ ہے کہ خداداد صلاحیت رکھنے والے یہ ایسے مصنفین ہیں جو بدقسمتی سے بڑے بڑے — صرف ضخامت ہی میں نہیں — ناول لکھنے کے کام پر اپنا پورا وقت صرف نہیں کرسکتے- یہ وہ لوگ ہیں جن پر ہمیں داؤ لگانا چاہئے- بہرحال اکثریت ہمیں مایوس نہ کرے گی — اور یہ کچھ کم نہیں-

پچھلے دنوں کچھ اچھی کتابیں شائع ہوئی ہیں مگر ان کی تعداد تکلیف دہ حد تک کم ہے- ہم اور بھی زیادہ تخلیق کرسکتے تھے اور یہ خیال ڈیلی گیٹ ساتھیو اور قارئین، آپ سے کہیں زیادہ ہمارے لئے افسوسناک ہے-

میرا کہنا اب بھی یہی ہے کہ اس بات کی سب سے بڑی وجہ کہ ہمارا ادب کیوں زندگی کے ساتھ ساتھ نہیں بڑھ رہا اور کیوں معمولی قسم کی کتابیں نمودار ہو رہی ہیں، یہی ہے کہ ادیب حقیقی زندگی سے کٹ کر الگ ہو گئے ہیں- یہ ایک ایسا مظہر ہے جو مصنفوں کے ماحول میں قائم ہو کر رہ گیا ہے- اور ہماری تیزرفتار زندگی سے اور اس کے متواتر تبدیل ہوتے ہوئے خدوخال سے ان ادیبوں کی واقفیت محض سطحی ہے...

جو مصنف اجتماعی فارم یا ریاستی فارم کے لوگوں کے متعلق لکھتا ہے اس کو، میری رائے میں، زراعت کے متعلق کم از کم زرعی

معیشت کے ماہر کی سطح کی معلومات حاصل ہونی چاہئیں- جو نوٹ اور فولاد کے کارخانے کے متعلق، اس کے مزدوروں، انجینئروں اور مستریوں کے متعلق لکھتا ہے ان کو کم از کم ایک اعلیٰ قابلیت رکھنے والے مزدور کی طرح پیداوار کا اچھی طرح علم ہونا چاہئے- جو مصنف ہماری فوج پر قلم اٹھائے اس کو عسکری معاملات میں کوبرین اور لیو تالستائی سے کم مہارت کا مالک نہ ہونا چاہئے ورنہ اس کی باتیں بے سروپا ہوں گی اور اس کا نغمہ بےسرا- اکثر یہی ہوتا ہے- اب افسانۂ محبت ایک ایسی چیز رہ جاتی ہے جسے لکھنے کو ہر ایک آزاد ہوتا ہے- یہی ایک ایسا موضوع ہے جو کسی خاص علم کی مہارت کا طلبگار نہیں ہوتا...

نوجوان صوبائی شاعروں کو جو "غیرفانی قدریں" تخلیق کر رہے ہیں ماسکو یا دوسرے بڑے شہروں میں سے کہیں جانے کی ممانعت نہیں کی جاسکتی- وہ ہمارے نیشن ایبل خلوت نشین شعرا کے ماسکو کے ادبی اجتماعات میں شان و شوکت سے نمودار ہونے کا شہرہ اور اس کے لوازمات کی تفصیل سنا کرتے ہیں کہ کیسے سواروں کا دستہ مجمع کو آگے بڑھنے سے روکتا ہے اور کس طرح ان کی مداح ادب و آرٹ کا دم بھرنے والی لڑکیوں کے غول کے غول والہانہ مدح سرائی میں آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں- صوبجاتی نوجوان شعرا بھی چاہتے ہیں کہ بے انتہا تنگ موریوں کے پتلون اور بے وجہ لمبے چوڑے سویٹروں میں ملبوس یہ لڑکیاں انہیں اپنی دیوانگی کا مرکز بنالیں- وہ بھی چاہتے ہیں کہ ناموری کے میٹھے پھل کا مزہ چکھیں- چنانچہ وہ بھی اسی جوش عقیدت کے ساتھ ماسکو پر ٹوٹ پڑتے ہیں جس یقین کے ساتھ زائرین سفر مکہ پر روانہ ہوتے ہیں- اور اس سے انہیں باز رکھنے میں کوئی حجت، کوئی قرنطینہ باز نہیں رکھ سکتا- ان پر تو یہی دھن سوار ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح بس ماسکو پہنچ جائیں-

مثلاً بھلا فیدین، لیونوف، میکسم ریلسکی یا مجھے اس سے کیا کہ کوئی نوجوان عورت بازار میں جو بھی اس کے ساتھ ہو اس کو ہماری طرف اشارہ کرکے بتائے: "دیکھو، وہ فلاں فلاں ہے!" ہمارے لئے اس میں اب کوئی لطف نہیں رہ گیا ہے- جب کوئی اس قدر بے تکلفی سے نام لے تو جھرجھری سی آتی ہے- مگر یہی وہ چیز ہے جس سے کسی نوجوان مصنف کے دل میں لڈو پھوٹنے لگتے ہیں اور بعض نوجوان تو واقعی پھولے نہیں سماتے- مروت کرنے کی ضرورت نہیں مگر

پھر بھی نوجوانوں کے جذبات کی قدر کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

آپ میں سے بہتوں نے غالباً دیکھا ہوگا کہ پرانے زمانے میں کسان بوائی سے پہلے بیجوں کو ایک بڑے سے چھلنے میں چھان لیا کرتے تھے جو چھینکے کی طرح ٹنگا ہوتا تھا۔ خاک اور بھوسہ ہوا سے اڑ جاتے اور پورے وزن کے بیج باقی رہ جاتے۔ یہی صورت ادب میں ہوگی۔ بھوسہ اڑجائیگا اور بیج رہ جائیں گے۔ وقت اس چھلنے کو جھلاتا ہے اور صفائی کا لازمی عمل یقیناً انجام پائیگا۔

یہ تو ہے نوجوانوں کی کیفیت۔ بزرگ مصنفوں کا بھی چنداں بہتر حال نہیں ہے۔ شہر میں رہنےوالے سے بھلا آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بڑھاپے میں ہمت کرکے صوبائی علاقے میں نکل کھڑا ہو جو اسے نہایت خوفناک جگہ معلوم ہوتی ہے؟ اور پھر وہاں اس سے کسی کا کیا بھلا ہوگا۔ ذاتی طور پر میں تو مصنفوں کو ان لوگوں کے قریب جن کے متعلق وہ لکھتے ہیں، منتقل ہو جانے کی آس عرصہ ہوا چھوڑ چکا ہوں۔ اس امید کے پورے ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی...

یہاں کانگرس میں توقع ظاہر کی گئی ہے کہ مصنفین اور فنون لطیفہ میں حصہ لینےوالے لوگ عوام کے مشفق و دانا مشیر بنیں گے۔ مگر جو شخص زندگی سے واقف ہی نہ ہو وہ ایک اچھا مشیر مشکل ہی سے بن سکتا ہے۔ اپنے مشورے سے وہ جن گتھیوں میں پھنسادےگا ان سے نکلنا ہی مشکل ہو جائیگا... واقعی ایک مصنف — خالص شہری باشندہ جس نے تیس یا چالیس برس پہلے کبھی گاؤں دیکھا ہوگا اور جس کا اس سے تعلق قطعی ٹوٹ چکا ہو، اور بعض کا تو کبھی تعلق ہی نہ رہا ہو — کسی اجتماعی فارم کے صدر کو یا ریاستی فارم کے ڈائریکٹر کو جو تجربہ کار ہو اور اپنے کام کے اسرار و رموز سے آشنا ہو، پیداوار کے معاملات میں بھلا کیا مشورہ دے سکتا ہے؟ اخلاقی مسائل میں بھی فارم کے بظاہر سیدھے سادے نظرآنےوالے یہ لوگ بعض مصنفوں کو بہ‌آسانی پیچھے چھوڑ سکتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ جو مصنف بہار اور سرما کی فصلوں میں تمیز نہ کر سکتا ہو، یا جو اور جوار کا فرق نہ جانتا ہو اسے ناخواندہ مشیر بن کر پہنچنے کی آرزو نہیں کرنی چاہئے اور اگر نادانی کی بنا پر اس کے سر میں سما جائے اور وہ کوئی مشورہ دے بیٹھے تو بہتر یہی ہے کہ بن پڑے تو جان چھڑا کر بیباک نکلے۔

مجھے احساس ہے کہ میری تقریر سے قدرے مایوسی ٹپکتی ہے مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ میں اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاتا: لالچ مجھے آن دبوچتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اچھی کتابیں بہت ساری ہوں اور وہ ہیں اتنی تھوڑی۔ مجھے اپنے آپ پر اور دوسروں پر غصہ آتا ہے مگر کیا فائدہ؟ ان مسئلوں پر اجتماعی طور پر اور غیرضروری عجلت کے بغیر فیصلہ کرنا چاہئے۔

اس قسم کے معاملے میں عجلت سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا اور یہاں ایک اور مصیبت ہے — اور مصیبت، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اکیلی نہیں آتی۔ اپنی نہایت اچھی اور دلچسپ تقریر میں یوکرین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سیکریٹری کامریڈ پودگورنی نے ایک موقع جو میرے خیال میں بہت اچھا تھا، کھو دیا۔ انہوں نے اس بات کا ذکر کیوں نہیں کیا کہ جو یوکرینی مصنفین کانگرس کے ڈیلی گیٹ بن کر آئے ہیں وہ صرف کیف ہی سے آئے ہیں؟ وہ کہہ سکتے تھے: اس امر کے پیش نظر کہ کامریڈ مصنفین آپ سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی اس کانگرس کے لئے یوکرین کے علاقائی مرکزوں سے منتخب ہوئے تھے، اپنا گھر آپ وہیں کیوں نہیں بنا لیتے؟ وہیں ہنسی خوشی کیوں نہیں رہتے اور ان مقامی محنت کشوں کے بارے میں نہیں لکھتے جنہوں نے آپ کو ووٹ دیا ہے؟ اگر آپ علاقہ پولتاوا سے منتخب ہوئے ہیں تو پولتاواوالوں کے متعلق لکھئے، اگر آپ علاقہ چیرنی گوف سے منتخب ہوئے ہیں تو چیرنی گوف‌والوں کے بارے میں لکھئے۔ مگر نہیں۔ انہوں نے یہ نہیں کہا۔ اور اب مصنفین پھر صدر مقام کیف واپس چلے جائیں گے اور سب کچھ ویسا ہی ہو جائیگا جیسے کہ پہلے تھا۔ یہی شکایت ان دوسرے علاقوں کے سیکریٹریوں کے بارے میں کی جا سکتی ہے جو مصنفوں سے بھرے پڑے ہیں۔ سیکریٹریوں کو چاہئے تھا کہ مصنفوں کو مناتے اور ان کو اپنے صوبجاتی شہروں میں اور گاؤں میں آنے کی دعوت دی ہوتی جو اب کسی طرح بھی پرسکون نہیں رہ گئے ہیں تاکہ وہ جہادی اور وہ چاہے کچھ ہو مگر خوابیدہ نہیں ہے، زندگی بسر کریں جس سے ان کو زندگی کا گہرا علم حاصل ہو اور ان میں سچی تخلیقی کوشش کی امنگ پیدا ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس غلطی کی اب بھی اصلاح ہو سکتی ہے۔

ہمارا ادب صف اول کا ادب ہے اور اس کا سبب محض نظریاتی ماہیت ہی نہیں ہے۔ غیرممالک کے ناشرین سے ہمارے تعلقات بڑے

رہے ہیں۔ ہماری کتابیں ہر جگہ شائع ہوتی ہیں۔ ہیئت کی بہ نسبت موضوع قارئین کی دلچسپی کا خاص باعث ہوتے ہیں کیونکہ غیرملکوں میں ہماری زندگی سے، ہماری آج کی حقیقت سے گہری دلچسپی پائی جاتی ہے۔

لیکن ہم سوویت مصنفوں کو خود اپنے نقادوں کی بہ نسبت غیرممالک کے نقادوں سے زیادہ شکایت ہے۔ اگر ہمارے نقادوں میں سے اکثر و بیشتر کو زندگی کا کافی علم نہیں ہے تو غیرممالک کے نقادوں کو علم تو الگ رہا اس کا کوئی تصور تک نہیں ہے۔ ہمارے خلاف وہ جو شکایتیں کرتے ہیں بسا اوقات وہ نہایت غیرمعقول ہوتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنی تحریروں میں جانبداری سے کام لیتے ہیں۔ اور انہیں ہم سے کیا توقع ہے؟

فرض کیجئے میں ایک سوویت فوجی کے متعلق لکھ رہا ہوں، اس شخص کے متعلق جو مجھے بے انتہا عزیز اور پیارا ہے۔ میں اس کی برائی کیسے کر سکتا ہوں؟ وہ میرا ہے، اپنی دوپلی ٹوپی سے لیکر اپنے پاؤں کی جرابوں تک اور میں کوشش کرتا ہوں کہ اس کے چہرے پر چیچک کے داغوں کو، یا اس کی خصلتوں کی بعض خامیوں کو نظرانداز کر جاؤں۔ اور اگر میں ان چیزوں کو دیکھ بھی لیتا ہوں تو میں اس کے بارے میں کچھ اس انداز سے لکھتا ہوں کہ چیچک سے داغدار اس کے بھدے چہرے اور خصلت کی معمولی خامیوں سمیت قارئین اس کو چاہنے لگ جائیں۔

یہاں اپنے سامنے میں جن لوگوں کو دیکھ رہا ہوں ان میں سے بیشتر کے پاس زندگی کے اور دوسرے تجربوں کا بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بعض اوقات کسی سادہ سی عورت کے چہرے کی جھائیاں آدمی کو ساری دنیا کے بے داغ، حسین چہروں سے زیادہ عزیز ہو جایا کرتی ہیں۔ اور جس عورت سے وہ پیار کرتا ہے اس کی تھکی ہوئی آنکھوں کے پاس کرنوں کی طرح پھیلی ہوئی جھریاں اس کو کسی نوجوان حسینہ کی الھڑ مسکراہٹ کی آب و تاب سے زیادہ حسین معلوم ہوتی ہیں۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ایسی عورت کے عشق میں جس کی طرف آپ کبھی دوبارہ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں کوئی ایسا خوبرو نوجوان مبتلا ہو جاتا ہے کہ آپ دم بخود رہ جاتے ہیں! زندگی میں طرح طرح کے حادثات ہوتے ہیں اور یہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور میں بھی۔ تو پھر کوئی

مصنف، بشرطیکہ وہ ”مردہ دل“ نہ ہو ان لوگوں کے متعلق جن سے وہ محبت کرتا ہو سرد مہری اور بے نیازی کے ساتھ کیسے لکھ سکتا ہے؟

کہتے ہیں کہ چیخوف کا قول تھا: ”لکھنے بیٹھو تو برف کی طرح ٹھنڈے ہو کر“۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ فنکار بوقت تخلیق سرد کیسے رہ سکتا ہے! اگر آپ کا خون مچھلی کے خون کی طرح ٹھنڈا ہو اور دل پر چربی کی اتنی تہیں جم چکی ہوں کہ اس میں تڑپ باقی نہ رہی ہو تو آپ کوئی ادبی تخلیق نہ کر سکیں گے، اور قارئین کے دلوں تک پہنچنے کا راستہ آپ کبھی بھی تلاش نہ کر پائیں گے۔

میں تو چاہتا ہوں کہ جب کوئی ادیب لکھ رہا ہو تو خون اس کی رگوں میں جوش کھا رہا ہو، میں چاہتا ہوں جب وہ دشمن کے بارے میں لکھ رہا ہو تو فرط نفرت سے اس کا چہرہ زرد پڑ جائے، میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے کرداروں کے ساتھ جنہیں وہ تخلیق کرتا ہے، جن سے وہ محبت کرتا ہے جو اس کو عزیز ہوتے ہیں، ہنسے اور روئے۔ صرف اس طرح ہی حقیقی فن پارہ تخلیق ہوگا جعلی نہیں۔

اب تو میں اپنے پیشے سے مخصوص باتیں کرنے لگ گیا اور میرا خیال ہے کہ آپ کو ان سے دلچسپی نہیں ہوگی۔ اب میں مختصراً ان فرائض کا ذکر کروں گا جو سوویت ادب کو درپیش ہیں۔

بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کے لئے ہمیں جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اور میرے خیال میں سب سے پہلے اپنے ہاں کے نوجوانوں پر اثرانداز ہونے کے لئے۔ ہمارے نوجوان قابل تعریف ہیں۔ ہمارا ملک بہت کچھ ان کے جوش و خروش اور ان کی محنت کے کارناموں کا مرہون منت ہے۔ لیکن ہمارے نوجوانوں کا نہایت ہی خفیف حصہ جذباتی طور پر بے چین ہے، روزمرہ کی باتوں میں مہم جوئی کا متلاشی ہے اور وہ اس کو ان میں نہیں مل رہی۔ اور مہم وہیں موجود ہے، ان کو بس کرنا یہ ہے کہ ہاتھ بڑھا کر اس کو لے لیں اور اپنے اطراف و جوانب کی زندگی کو قریب جا کر غور سے دیکھیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ان نوجوانوں کو اجنبی اثر سے نجات دلائیں اور کام اور جرأت آزما کوششوں کی جانب ان میں صحیح رویہ پیدا کریں۔

آج مصنف صرف اسی مسئلے ہی سے دوچار نہیں ہیں اور آئندہ بھی صرف اسی سے ان کا سامنا نہیں ہوگا۔ ضرورت ہے کہ سوویت کنبے،

نئے انسان کے اخلاق اور عوام کی بےپناہ محنت کی فنی پیکروں میں تجسیم ہو، افسانوی ادب کی بڑی، ہمہ گیر تخلیقات میں ان کا مفصل بیان ہو۔ ہم لوگ جو فنون لطیفہ سے تعلق رکھتے ہیں، یہ سب باتیں اچھی طرح سمجھتے ہیں اور عوام کے اور پارٹی کے روبرو ہماری جو ذمہ‌داری ہے اس کی وسعت اور وقعت سے بخوبی واقف ہیں۔

آخر میں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں جو ڈیلی گیٹ موجود ہیں ان میں بہت سے ایسے ہیں جنہیں پیار سے "مشعل راہ" کہتے ہیں۔ یہ بہت اچھا اور مناسب لفظ ہے۔ میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ وہ یہ بات فراموش نہ کریں کہ وہ صرف اپنے خاص میدان عمل کے لوگوں کی راہیں ہی روشن نہیں کر رہے۔ سائنس، ٹکنیکی علم، صنعت اور زراعت کی "مشعلیں" ہم مصنفوں کے لئے بھی روشن ہیں۔ اور ہم ان کی طرف قدرے رشک کے ساتھ دیکھا کرتے ہیں کیونکہ اپنی کوششوں میں ہم نے اب تک وہ حاصل نہیں کیا جسے انہوں نے حاصل کر لیا۔ مگر ان کی روشنی ہمیں بھی مل رہی ہے، ہمیں بھی حرارت پہنچ رہی ہے اور وہ صبح کے دھندلکے میں اندھیرے کو چیر کر چمکتی رہتی ہے۔

جو یہ روشنی پہنچا رہے ہیں ان کا میں تہ‌دل سے شکرگذار ہوں۔

اور ویسا ہی دلی شکریہ ان کا جو ان روشنی برداروں کو توانائی فراہم کرتے ہیں، ان کا بہت بہت شکریہ جو ہمارے لئے گہری فکرمندی کا اظہار کرتے ہیں، جس کے غالباً ہم پوری طرح مستحق نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم آئندہ اس کے مستحق ضرور بن جائیں گے۔

۱۹۶۱ء

زمین کو کام کرنےوالے نوجوانوں کی ضرورت ہے

(نوجوانوں سے گفتگو سے اقتباس)

...دیہاتی نوجوانوں کو کسان کے کام سے محبت کرنے اور اس کا احترام کرنے کی تربیت دینی چاہئے کیونکہ یہاں اور دوسری جگہ لوگ بہت سے اسباب کی بنا پر کاشتکاری سے کنارہ کشی اختیار کر رہے ہیں۔ میں بہت سے بیرونی ممالک کا سفر کر چکا ہوں۔ ناروے، سویڈن، ڈینمارک میں بھی یہی کیفیت ہے۔ درحقیقت شہر میں منتقل ہو جانے کی خواہش ہر جگہ بڑھتی نظر آتی ہے۔ فن‌لینڈ

اور سویڈن میں جہاں کھیتی کے باڑے بنا کر کنبوں میں رہنے کا نظام جاری ہے یہ خواہش میری سمجھ میں آتی ہے۔ بڑے بڑے گاؤں نہیں ہیں، لوگ بکھرے ہوئے رہتے ہیں، مکان ایک دوسرے سے دو تین چار چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہیں اور اس لئے اس کی وجہ سمجھائی اور سمجھی جاسکتی ہے۔ سینما دیکھنے جانا ہو تو اس کے معنے بارہ پندرہ کلومیٹر کا سفر کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور جہاں تک لوگوں کے کلب یا کسی اور جگہ اکٹھا ہونے کی بات ہے تو اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہمارے ہاں کے حالات میں اس خواہش کو حق‌بجانب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہمارے ہاں اجتماعی اور ریاستی فارموں میں بڑا عملہ ہوتا ہے، ہمارے ہاں کلب اور سینما ہوتے ہیں۔ روستوف میں رہنےوالی لڑکیاں میرا خیال ہے کہ آپ سے زیادہ بار تھیٹر نہیں جاتیں۔ اس لئے وجہ یہ نہیں ہو سکتی۔ گاؤں کی زندگی میں ہیجان کی کیفیت یا نوع بنوع تاثرات کی کمی کو کام کی رفتار کی شدت اور اپنی عمر اور خیالات کے لوگوں سے خلط ملط سے پورا ہو جانا چاہیئے۔

زمین کو کام کرنےوالے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ آجکل سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے مارچ کے مکمل اجلاس کی قراردادوں کی روشنی میں بڑے پیمانے کے اقدامات کئے جا رہے ہیں، ریاستی فارم کے کارکنوں اور اجتماعی کاشتکاروں کے لئے اچھے امکانات پیدا ہو رہے ہیں، ان کی آمدنی بڑھیگی اور ظاہر ہے یہ ترغیب کا اچھا وسیلہ ہوگی۔ جو لوگ شہر میں خاصا اچھا رہائشی مکان حاصل نہیں کر سکے ہیں اور جتنی خوشحال زندگی وہ بسر کرنا چاہتے ہیں وہ حاصل نہیں کر سکے ہیں، گاؤں میں واپس آنا چاہیں گے۔ اس طرح کا الٹا عمل شروع ہو جانے کی مجھے قوی امید ہے۔

آپ کو سمجھنا چاہئے کہ حکومت اور پارٹی ان نوجوانوں کی راہ میں رکاوٹیں پیدا نہیں کر سکتی جو صنعت میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے کہ تاگنروگ میں کام کرنے جائیں یا روستوف یا یہیں ویشنسکایا میں رہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ زمین پر کام کرتے رہنے کے قابل‌تعریف رجحان کے آثار پائے جاتے ہیں۔ تیرنتی سیمیونووچ مالتسیف سے، جو یہاں ویشنسکایا آئے تھے، ماسکو کے مضافات میں واقع اربوزوف اسکول کے فارغ التحصیل طلبا' نے بات چیت کی۔ آپس میں انہوں نے اتفاق رائے

سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ان میں سے جو بھی کوسوسول کے میمبر ہیں وہ سب کام کرنے کے لئے اپنے گاؤں میں رہیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ مرکزی کمیٹی کے مارچ کے مکمل اجلاس سے متاثر ہوکر یہ فیصلہ کیا گیا۔

یہاں گاؤں میں تفریحی مشغلوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گاؤں میں وہ اتنے نہیں ہیں جتنے شہر میں ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں اگر پوری تھیٹر کمپنیاں نہیں تو ان کی ٹولیاں تو اکثر آتی رہتی اور ہماری مہمان کی حیثیت سے اپنے پروگرام پیش کرتی ہیں۔ روستوف کی انجمن موسیقی بھی اچھا کام کررہی ہے اور جیساکہ آپ سب جانتے ہیں اس کے موسیقار ہمارے ہاں آتے رہتے ہیں۔

یہی کیفیت ہمارے پڑوسی والگاگراد اور وورونیژ کے علاقوں کی ہے۔ وورونیژ کے مغنیوں کا طائفہ علاقے کی خدمت بحسن وخوبی انجام دیتا ہے۔ والگاگراد کے علاقے میں اوریوپنسک میں اپنا تھیٹر ہے۔ یہ چلتا پھرتا تھیٹر ہے اور یہ اپنے ضلع کے دورے کا آغاز سال کے شروع میں کرتا ہے اور پورے علاقے کا سفر کرنے کے بعد دسمبر کے آس پاس اسے ختم کرتا ہے۔

جیساکہ آپ خود دیکھ سکتے ہیں، حالات بدل رہے ہیں۔

مثلاً مجھے اپنے بارے میں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ جیسے میں تہذیب سے دور کہیں الگ تھلگ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ مجھے کم ازکم یہ احساس کبھی نہیں ہوا۔ (ممکن ہے اس کی وجہ میرے کام کی نوعیت ہو)۔

مختصر یہ کہ باربار اسی بات پر زور دینا چاہئے: زراعتی مہارت بہت اہم ہوتی ہے اور اس مہارت کی ہمارے پبلک کو سخت ضرورت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ فیصلہ آپ خود کریں کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔

اور اب آئیے ہم آرٹ کے مسئلے کو لیں۔

میرا اپنا منصوبہ یہ ہے کہ اپنا ناول ''وطن کے مجاہد'' مکمل کرلوں اور اس کے بعد میں تمثیل نگاری کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ جب یہ موضوع چھڑ گیا ہے تو میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس صنف میں صورت حال اچھی نہیں ہے۔ اپنے ہمعصروں، نوجوان محنت کشوں کے متعلق ہمارے ہاں اچھے ڈراموں کی بڑی کمی ہے جو ہمارے نوجوانوں پر تعلیمی اثر ڈال سکتے تھے۔

سینما۔ میری تصانیف میں سے فلم کے لئے سب سے زیادہ کامیاب منظرنامہ میرے خیال میں فلم ''مقدر انسان کا'' کے لئے تیار ہوا۔ یہ فلم مشہور و معروف اداکار اور ڈائریکٹر سرگئی بوندارچوک نے بنائی ہے۔ جہاں تک ''اور ڈان بہتا رہا...'' اور ''جب زمین جاگی'' کا تعلق ہے اس میں منظرنامہ لکھنےوالوں اور ڈائریکٹروں نے کچھ غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً ''اور ڈان بہتا رہا...'' میں کچھ ایسے اہم واقعات تھے جنہیں شامل کرنا چاہئے تھا مگر چھوڑ دیا گیا۔ اور ایسے حصوں کو شامل کرلیا گیا جنہیں نظرانداز کیا جاسکتا تھا اور ان کی کمی کو فلم میں محسوس بھی نہ کیا جاتا۔ آپ جانتے ہی ہیں فلم کا منظر نامہ سرگئی گیراسیموف نے لکھا تھا۔ اور یہ خالص ان کا اپنا تخلیقی کام تھا۔ میرا خیال ہے کہ اداکاروں کا انتخاب بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔

آجکل مالی تھیٹر ''اور ڈان بہتا رہا...'' کو اسٹیج پر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جو تھیٹر ''وطن کے مجاہد'' کا منظرنامہ تھیٹر کے لئے لکھنے کی بات سوچ رہے ہیں وہ میرے خیال میں حد سے زیادہ عجلت سے کام لے رہے ہیں۔ کیونکہ جو ناول ابھی مکمل نہ ہوا ہو اس کی بنیاد پر تمثیلی اعتبار سے کوئی مربوط چیز پیش کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

روستوف کا گورکی ڈرامہ تھیٹر میرے افسانے ''رجمنٹ آ رہی ہے'' پر مبنی ایک ڈرامہ کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ بھلا کیسا ڈرامہ ہوا جس میں کوئی عورت ہی نہ ہو؟

ایک صورت حال ایسی پیدا ہو گئی ہے جو میرے ناول ''وطن کے مجاہد'' کی تکمیل میں رکاوٹ بن گئی ہے۔ میں روستوف میں جرنیل لوکین سے ملا جو اب ریٹائر ہو گئے ہیں۔ ان کی زندگی کے حالات نہایت المناک ہیں۔ زخمی اور بیہوشی کی حالت میں جرمنوں نے ان کو قیدی بنا لیا تھا۔ وہ قابل اعتماد، بہادر آدمی اور سچے محب وطن ہیں۔ سابق جرنیل ولاسوف نے جس نے اپنے ملک سے غداری کی تھی، اپنے نازی اعلی افسروں کے حکم پر لوکین کو اپنا جیسا بنانے کی کوشش کی مگر لوکین ثابت قدم رہے۔ انہوں نے مجھے بہت ساری دلچسپ باتیں بتائی ہیں اور میں ان سے اپنے ناول میں استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔

نازی جرمنی پر سوویت عوام کی فتح کی بیسویں سالگرہ آنےوالی

ہے۔ اس موقع پر اخباروں میں جنگ کے متعلق بہت سے مضامین کہانیاں اور دوسری چیزیں شائع ہو رہی ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ حب الوطنی کی جنگ عظیم میں کام آنے والوں کی یادگاروں اور قبروں کی اعزازی سرپرستی کی ذمہ داری قبول کر لیں۔

نوجوانوں کی تعلیم سب سے اہم فریضہ ہے۔ کام کرنے کی عادت بچپن ہی سے ڈالنی چاہئے۔ جب میں جرمن جمہوری ری پبلک گیا تھا تو یہ دیکھنے کا موقع ملا کہ وہاں لوگ کس طرح کام کرتے ہیں۔ میں نے ایک کنبے — ماں، دادی اور کوئی نو سال کے ایک لڑکے کو چقندر کے کھیت کی نلائی کرتے دیکھا تھا۔ سچ مچ وہ گھٹنوں کے بل چل رہے تھے تاکہ گھاس پھوس کے ایک ایک پودے کو اکھاڑ پھینکیں۔ ہمارے ہاں بعض اوقات نوجوانوں سے کام لینا بھی ایک کام بن جاتا ہے۔ کومسومول کو اپنی سرگرمیوں کا رخ اسی طرف موڑ دینا چاہئے۔ کنبے میں اور اسکول میں تعلیم کی کارگذاری بڑھانی چاہئے تاکہ آجکل کے مطالبات پورے کئے جا سکیں...

۱۹٦٥ء

محب وطن ہر آن رہو
(داغستانی طالبات سے گفتگو)

ا۔ م۔ مردوزلیثوا، ایک اقامتی مدرسے کی صدر معلمہ: بہت سی داغستانی عورتیں عوامی تنظیموں میں کام کرتی ہیں۔ ان میں اسکول کی استانیاں، سائنسداں اور دوسری ماہرین شامل ہوتی ہیں۔ پھر بھی صدیوں پرانے تعصبات پر عبور پوری طرح حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بہت ہی مشکل سے ختم ہوتے ہیں...

م۔ ا۔ شولوخوف: واقعی یہ اب بھی ایک دشوار مسئلہ ہے، حالانکہ ملک کا عام تہذیبی ارتقا تیز رفتاری سے ہو رہا ہے۔ مگر اس کا خاموش تماشائی نہیں بنا جا سکتا۔ یا اس سے بھی بدتر یہ کہ پسماندہ رجحانات کو سر اٹھانے کا موقع دیا جائے۔ آپ کو اس کے خلاف نفاست اور ہوشیاری کے ساتھ، مذہب کے خلاف تصورات کی تبلیغ کرکے، لوگوں کو یہ سمجھنے میں مدد دے کر کہ کیا غلط ہے کیا درست، جہاد کرنا چاہئے۔

اسیات الاکووا، ایک طالبہ: کیا ہماری آج کی زندگی میں کارنمایاں انجام دئے جا سکتے ہیں؟

م۔ ا۔ شولوخوف: زندگی بحسن وخوبی اور سماج کے لئے کارآمد طریقے سے بسر کرنا بھی ایک کارنمایاں ہے۔ کومسومول کا اچھا ممبر ہونا بھی روزمرہ کا کارنمایاں ہے، اگرچہ مانی ہوئی بات ہے کہ چھوٹے پیمانے کا۔ پیارے بچو، سوویت یونین کی قوت صرف جنگ کے کارہائے نمایاں ہی پر مشتمل نہیں ہے۔ کھیتوں میں، اجتماعی فارموں میں، ریاستی فارموں میں، کارخانوں اور کوئلے کی کانوں میں ایماندارانہ کام کو کیا کہا جائیگا؟ ہمارے ملک کی عظمت، معاشی قوت اور نظریاتی طاقت روزمرہ کے لاکھوں، محنت کے ایسے کارہائے نمایاں سے مرتب ہوتی ہے جن میں نظارہ کرنے کے قابل کچھ نہیں ہوتا۔ مجاہدانہ شان وشوکت کے اعتبار سے وہ کارہائے نمایاں جو جنگ میں انجام دئے جاتے ہیں زیادہ رعب دار معلوم ہوتے ہیں۔ مگر تمہیں میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جنگوں نے کبھی کچھ تخلیق نہیں کیا۔ جنگ وہ قوت ہوتی ہے جو تباہ کرتی ہے۔ اور کام تعمیری کارنامہ ہوتا ہے۔ اگر مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں کی بہادرانہ کوششیں شامل حال نہ ہوتیں تو حب الوطنی کی جنگ عظیم کے چھوڑے ہوئے بہت سے کھنڈر اب بھی باقی ہوتے۔

اچھی طرح پڑھنا بھی ایک کارنمایاں ہے۔

بوڑھے لوگوں کو یہ کہنے کا بڑا شوق ہوا کرتا ہے کہ ان کے زمانے میں ہر چیز بہتر تھی۔ ان کی ہر بات پر ایمان لے آنا تو ٹھیک نہیں ہے مگر ان کی بعض باتوں سے اتفاق کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پرانی پیڑھی کے اپنے پیمانے اور اپنے معیار ہوا کرتے تھے۔ اب جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے نئی وضع کے جھاڑجھنکاڑ بال رکھنے اور بال بنانے کے طرز پر کوئی اعتراض نہیں ہے جو ایسا لگتا ہے جیسے کہ پھوس کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر ہوں۔ بنیادی طور پر ہمارے نوجوان اچھے لوگ ہیں۔ اسیات الاکووا نے ابھی مجھ سے کارہائے نمایاں کے متعلق سوال کیا ہے۔ یہ اہم بات ہے، بال بنانے کا طرز اہم نہیں ہے۔ میرے زمانے میں، خانہ جنگی کے دنوں میں ہمارے نوجوان بہادر ہوا کرتے تھے۔ اگر شدید آزمائش کا وقت آیا تو ہمارے نوجوان پھر بہادری کے ثبوت دیںگے۔ لیکن ہمارے نوجوانوں میں ایسے لوگ ہیں جو مغربی پروپیگنڈے کے اثر

کا شکار ہو جاتے ہیں۔ غیرملکی نظریات‌دان چاہتے ہیں کہ تذبذب اور بےاعتنائی کے بیج بو دیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کے مستقبل کے لئے اور پرانی نسلوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اس کے لئے جوابدہ تم ہی کو ہونا پڑے گا۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ”لاوارث“ نوجوان جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ اور ہمارا جی تو ہرگز نہیں چاہتا کہ تم جیسی اچھی لڑکیوں اور لڑکوں کو غیروں کے غلیظ ہاتھوں میں چلا جانے دیں۔ سرمایہ‌داری کے اثر کے خلاف ہم عملی جدوجہد کر رہے ہیں۔ خراب فلموں سے جو ہمارے ہاں کے فلمی پردوں تک پہنچ جاتی ہیں اور ضرررساں کتابوں سے جو کسی نامعلوم سبب سے ہمارے اشاعت گھر چھاپا کرتے ہیں بورژوا نظریات‌دان تمہیں بےراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم سوویت مصنفین اپنے نوجوانوں کی، زندگی اور آرٹ کے اپنے نظریات اور اپنے کمیونسٹ خیالات کے مطابق تربیت دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اسکول چاہے ماخچ کلا میں ہو، پسچانوو کپسکوئے میں، ویشسکایا میں یا کہیں اور، طالب‌علموں کو ہمہ گیر تعلیم ملنی چاہئے: اس میں سینما، تھیٹر اور ادب جیسے اثرات شامل ہیں جو اخلاق و عادات کی تشکیل کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جو چیز سب سے اہم ہے یعنی تعلیم، اس کے مضامین بھی ہوتے ہیں۔

ہماری وسیع و بسیط سرزمین کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو دانشمند، جفاکش اور کفایت‌شعار باکمال ہوں۔ ہمارے لاکھوں بہترین لوگ خانہ‌جنگی اور حب‌الوطنی کی جنگ‌عظیم میں کام آئے تاکہ امن اور سلامتی کی اس فضا میں تم زندگی بسر کر سکو جہاں تمہارے سروں پر بمبار ہوائی جہاز نہ گڑگڑا رہے ہوں تاکہ ہم زندگی اور معیشت کے اپنے مسئلے اور اپنے مستقبل کے بلکہ تمہارے مستقبل کے مسئلوں پر بحث کر سکیں۔ سوویت اقتدار کی نعمتیں بڑے مہنگے مول حاصل کی گئی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں تم کو اس قسم کے لوگوں کے سانچے میں ڈھالنا ہے جو ہماری سرزمین کی بےحساب روحانی اور مادی دولت سمیت ملکیت کی ذمہ‌داری قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

لوگوں میں حب‌الوطنی بچپن ہی سے، کنڈرگارٹن کی عمر سے پیدا کرنی چاہئے۔ پھر وہ آدمی کی ذہنیت میں رچ جائیگی، وہ کسی بھی آزمائش کا بےخوف ہوکر مقابلہ کریگا اور اپنے ملک اور پارٹی سے اپنی

وفاداری کو عملی جامہ پہنائیگا اور اپنے اس غیرمتزلزل اعتقاد کو جس کہ کمیونزم کے تصورات سے زیادہ دانشمندانہ، زیادہ نوکیا اور زندہ انسان دوستانہ کچھ اور نہیں ہے۔

۱۹۶۵ء

سوویت مصنفوں کی چوتھی کانگرس میں تقریر

پیارے ڈیلی گیٹ ساتھیو! ہمارے معزز مہمانو!

اس کانگرس کے ابتدائی چند دنوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں چین ہی چین ہے: کوئی کڑی نکتہ‌چینی نہیں ہوئی، ہر جگہ اطمینان و سکون کا دور دورہ ہے، صلح صفائی کا پہرہ ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایک سکھ چین سے سانس لے رہا ہے اور عام فضا اس قدر پرسکون ہے کہ بعض حاضرین پر غنودگی کی کیفیت طاری ہو گئی ہے...

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انجمن مصنفین کے رہنماؤں نے اس کانگرس کی تیاری میں بڑی محنت سے کام کیا ہے جس کے لئے وہ قدرتی طور پر ہمارے شکرئیے اور ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ پچھلی کانگرسوں میں حالات مختلف تھے: اپنی تقریروں میں قلم کے سپاہیوں نے تلواریں بےنیام کر لی تھیں، زرہبکتر کی جھنکار تھی، اپنے جوش‌جہاد میں ہم نے ایک دوسرے کو ذرا بھی نہ بخشا تھا اور جب میدان کارزار سے نکلے تو گھوڑوں کو سہلاتے اور زخموں سے تلملاتے آئے تھے، کیونکہ ”پرانے زمانے میں“ ہمارے ہاں ستائش کی قلت تھی اور نازبرداریوں میں کیک اور مٹھائی کھلانے میں کنجوسی برتی جاتی تھی — بہرحال اتنی فراخدلی سے باتیں نہیں ہوتی تھیں جو مارکوف اور دودین نے موجودہ کانگرس میں ہم کو عطا کی ہیں۔ ٹکریں ضرور ہم نے ایک دوسرے کو بڑے دھیان سے ماریں۔ اور بعض اوقات بیجا طور پر۔

میں خود اکثر اکھاڑے میں کودا، مارا بھی اور پٹ بھی۔ لیکن میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ سوچنے لگ جائیں کہ مجھے افسوس ہے کہ وہ طوفانی کانگرسیں اب سوائے یاد کے اور کچھ نہیں رہ گئیں اور یہ کہ میں اب پھر میدان میں کود پڑنے کو بےچین ہوں۔ اس کے برعکس میں پرسکون فضا میں مجھے چین آتا ہے کیونکہ آپ سب کی طرح میں بھی

کا اور پرامن بتائے باہم کا حامی ہوں، سوویت انجمن مصنفین کے حدود کے اندر بھی اور اس کے باہر بھی۔

سوویت حکومت کے قیام کی پچاسویں سالگرہ کے سال میں منعقد ہونے والی کانگرس ہمارے لئے بھی نتائج اخذ کرنے کا ایک طرح کا موقع ہے۔ اور قدرتی بات ہے کہ بیشتر مقررین نے بلاارادہ سابقہ کامیابیوں کا ذکر کیا۔

لیکن ہمیں یہ مشرقی دانشمندانہ قول کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے: ''جب راہ چلو تو بار بار پیچھے نہ مڑکر آگے دیکھو ورنہ ٹھوکر کھاؤ گے''۔ ہمیں مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہئے تاکہ زیادہ ٹھوکریں نہ کھائیں۔

مجھے خوشی ہے کہ اس کانگرس کی فضا پرسکون اور کاروباری وضع کی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے قدرے پریشانی بھی ہے کہ انجمن کے قائدین کھلے بندوں یہ کوشش کر رہے ہیں کہ بہر قیمت پیچیدگیوں سے بچ سکیں۔ یہ کسی طرح جائز معلوم نہیں ہوتا۔ کانگرس کا اختتام تو بخیروعافیت ہو جائیگا لیکن ہمارا اجتماع بہرحال سات سال سے نہیں ہوا تھا اور خالص ادبی مسائل اور فرائض کے علاوہ بھی بہت سی باتیں کرنی ہیں۔

میں انجمن کے کھیون‌ہاروں میں سے نہیں ہوں اور چونکہ عام صفوں کا ایک مصنف ہوں جسے یہ نہیں معلوم کہ ہدایات کیسے جاری کی جائیں اس لئے میں بعض ایسے مسائل چھیڑنے کی آپ کی اجازت کا خواستگار ہوں جن کے لئے میرا خیال ہے کہ فکرمند میں اکیلا ہی نہیں ہوں۔

شروع میں چند الفاظ اس کانگرس کے بارے میں۔ ہم سب کو بڑی خوشی ہے کہ مہمانوں میں ہمارے عزیز دوست دکھائی دے رہے ہیں جنھوں نے تشریف لاکر اور کارروائی میں دلچسپی لے کر اس کانگرس کو اعزاز بخشا ہے۔ یاروسلاف ایواشکیویچ، آننا سیگھرس، گیورگی جگاروف اور سوشلسٹ ملکوں کے دوسرے ادیب بھائیوں اور بہنوں سے ملکر اور پابلو نیرودا، چارلس اسنو، پامیلا جانسن، آرتھر لند کوسٹ اور ماریا وائن جیسے بڑے مصنفوں، اپنے اچھے پڑوسیوں اور دوستوں مارتی لارنی اور وائنے لند، ماریا تیریسہ لیئون اور تمام محترم غیرملکی دوستوں کی قربت کے احساس سے اطمینان ہوتا ہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ دوسرے ڈیلی گیٹوں کو کیسا لگ رہا ہے لیکن خود مجھے اپنے پیارے اور پرانے دوست ایلیا گریگوریئےوچ اہرن‌برگ

کی غیرموجودگی سے انتہائی پریشانی ہے۔ میں ڈھونڈتا ہوں، چاروں طرف تلاش کرتا پھرتا ہوں مگر ایلیا گریگوریئےوچ کہیں نظر نہیں آتے، وہ موجود ہی نہیں ہیں، اور اس سے مجھے ایک طرح کی بےچینی ہو جاتی ہے، جیسے کہ کوئی چیز ہونی چاہئے اور وہ نہ ہو، جیسے معدے میں کربناک درد ہو رہا ہو اور میری طبیعت اگرچہ ویسے بہت خوش تھی مگر اب افسردگی کا ایک تاریک سایہ اس پر پڑنے لگتا ہے۔ اہرن‌برگ کہاں ہیں؟ پتہ یہ چلتا ہے کہ کانگرس شروع ہونے سے کچھ ہی روز پہلے وہ ساحل اطالیہ کے لئے روانہ ہو چکے ہیں۔ بڑی عجیب بات ہے۔

کسی بھی کارخانے کے دستکاروں کو نہ صرف اپنا پیشہ‌ورانہ وقار کا، اپنے کارخانے کے وقار کا پاس ہوتا ہے بلکہ ان کو اپنے انسانی وقار کا بھی پاس ہوا کرتا ہے۔ ایلیا گریگوریئےوچ کو ہم سب کی توہین نہیں کرنی چاہئے تھی۔ جماعت کے اندر کسی کو اپنے آپ کو دوسروں پر سبقت نہیں دینی چاہئے اور چڑچڑی ساس کی طرح برتاؤ نہ کرنا چاہئے: ''میں گھر کی مالکہ ہوں، مجھے کوئی ناراض نہیں کر سکتا!''

اس سب کے بارے میں ایک اور افسوسناک بات یہ ہے کہ بری روایت کی تقلید کی جا رہی ہے اور اہرن‌برگ نے پبلک زندگی کے معمولات کی جو خلاف‌ورزی کی ہے اس سے شہ پاکر ہمارے معمر نوجوانوں نے ایسی اچھل کود شروع کر دی ہے کہ جب وہ واقعی بڑے ہو جائیں گے تو اسے یاد کر کرکے شرمندہ ہوا کریں گے۔

اگر نوجوانوں کے بارے میں باتیں کریں تو اپنے ماضی کو یاد کرنے کے بعد آئیے ہم یہ دیکھیں کہ مستقبل کیا امیدیں دلاتا ہے۔

سنہ تیس کی دہائی کے شروع میں فادیئف نے وسطی روس کے ایک چھوٹے سے قصبے کے دورے سے لوٹ کر مجھے ایک واقعہ سنایا تھا جو آپ بھی سنئے۔ انہوں نے مجھے بتایا: ''وہاں ایک قدیم خانقاہ تھی جسے میں دیکھنا چاہتا تھا۔ خیر تو میں وہاں گیا اور سب کچھ اچھی طرح دیکھا۔ اس خانقاہ کے ایک بہت ہی پرانے، کھنڈر گرجے میں اب بھی عبادت باقاعدہ ہوتی تھی۔ شہر واپس لوٹتے ہوئے میں نے دیکھا کہ خانقاہ کا حصار بنانے والی خندق کی ڈھلان پر بہت سارے بچے غل مچا مچا کر کھیل رہے ہیں اور کچھ دور ہی ایک بچہ بالکل اکیلا کھڑا حسرت سے انہیں دیکھ رہا ہے مگر ان کے قریب جانے کی جرات نہیں کر رہا بلکہ سرجھائی ہوئی گھاس کھینچ کھینچ کر اکھاڑ کے اور اپنی ایڑی سے زمین پر نشان بنا بنا کر اپنا جی بہلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں

سوچنے لگا کہ بیچارے کو کسی وجہ سے کھیل سے سب نے نکال دیا ہے۔ میں اس کے پاس گیا اور پوچھا: 'تم یہاں اکیلے کیوں کھڑے ہو؟ اوروں کے ساتھ ملکر کیوں نہیں کھیلتے؟ کیا کیا ہے تم نے؟'، اس نے نگاہ اٹھاکر میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں مجھے بڑوں کا سا کرب نظر آیا۔ اس نے مجھے بتایا: 'میرے ابا پادری ہیں۔ یہیں کے گرجے میں وہ پادری ہیں۔ اسی لئے لڑکے مجھے اپنے ساتھ کھیل میں شامل نہیں ہونے دیتے اور مجھکو اکیلے ہی کھیلنا پڑتا ہے۔'،، مجھے یاد ہے کہ فادیئف ایکدم خاموش ہو گئے تھے اور پھر انہوں نے عجیب سے تیز لہجے میں کہا تھا: ''اور تمہیں معلوم ہے، میں رو دیا تھا، میں نے منہ پھیر لیا تھا اور آنسو جاری ہو گئے تھے۔ کتنی خوفناک بات ہے کسی کے بچپن کا ایسا ہونا!،، قصے کا اختتام انہوں نے اسی طرح کیا تھا جیسے کہ ان سے توقع کرنی چاہئے تھی: ''مگر، بھائی میرے، تم تو جانتے ہو سارے پاجی قدرے جذباتی ہوا کرتے ہیں۔،،

ہمارے ''ٹیڑھے،، نوجوان مصنفین مجھے پادری کے خورد سال لڑکے کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں: وہ اکیلے ہی کھیلتے رہتے ہیں، ان میں رفاقت کا جذبہ ہی نہیں ہے، اور ہم بوڑھے ''جذباتی پاجیوں،، کو ترس تک نہیں آتا، رونا نہیں آتا اور ہم ان سے حقیقی تعلق قائم کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ ہمارا برتاؤ تو ان سے وہی ہوتا ہے جو بوڑھے سارجنٹ کا اپنے رنگروٹوں سے ہوا کرتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں اس وتیرے کو ترک کر دینا چاہئے، کسی کو صدقے کا بکرا بنانے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ ہمیں ایمانداری سے تسلیم کر لینا چاہئے کہ نوجوان ادیبوں کے ایک صدقے سے اپنے موجودہ خلافمعمول تعلقات کا الزام ہم پر عائد ہوتا ہے — کومسوبول اور انجمن مصنفین کی قیادت اور ہم معمر ادیب اس کے ذمہ دار ہیں۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ اس الزام سے خود کو میں سبکدوش نہیں کر سکتا، نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ اگر ہم صاف صاف مان لیں تو اصلیت یہی ہے۔ نوجوان مغرور اور زود رنج ہوا کرتے ہیں۔ تو پھر اگر ہم ایک حد تک خود کو تصوروار تسلیم کرتے ہیں تو مصالحت کی جانب پہلا قدم ہمیں اٹھانا چاہئے۔ ہماری کوئی ہیٹی نہیں ہوگی اور میرا خیال ہے کہ یہی سب سے زیادہ دانشمندانہ بلکہ سب سے دوراندیشانہ اقدام ہوگا۔

مجھے کہنا پڑتا ہے کہ یہ نوجوان بھی قصوروار ہیں، مثلاً فرائض جیسا رویہ اختیار کرنا اور وکیز کیاؤ کے مسلمہ معمولات کو تسلیم کرنے سے انکار کرنا۔ کچھ اور چیزیں بھی ہیں جو ان کے ضمیر پر بوجھ بنی ہوئی ہیں۔ مگر ہمیں چاہئے کہ یہ ان کی نوجوانی پر محمول کریں اور اب ان کو سزاوار نہ ٹھیرائیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم ان سے زیادہ سخت مطالبے کرنے لگیں گے۔

بحیثیت مجموعی نوجوان ادیبوں کا ذکر کریں تو وہ ہماری جگہ بحسن و خوبی لے سکتے ہیں اور یہ بات مجھے زیرلب کہنے کی ضرورت نہیں۔ سب سے زیادہ مسرت بخش حقیقت بہت بڑی تعداد میں ان بہت ہی نوجوان لوگوں کا ابھر کر سامنے آنا ہے جن میں خداداد صلاحیتیں موجود ہیں۔ یہ ان لڑکوں کی طرح ہیں جن کی آواز ابھی پختہ ہونی شروع ہوئی ہو۔ چنانچہ عین ممکن ہے کہ کبھی کبھار نوخیز مرغے کی طرح آواز بےسری نکلے۔ یہ لڑکے ہماری اصل دولت ہیں اور جوش و خروش اور جائز فخر کئے بغیر ان کا ذکر ہی نہیں کیا جا سکتا۔ قابل تعریف بات ہے، واقعی قابل تعریف ہے کہ ہماری زرخیز سرزمین اتنے بہت سارے ارباب ہنر پیدا کر رہی ہے!

لیکن یہ غور و فکر کا مقام بھی ہے اور مستقبل میں جھانک کر دیکھ لینا بھی سودمند ہوگا۔ میں کچھ اعدادوشمار پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے سخت فکر لاحق ہوتی ہے۔

مصنفوں کی پہلی کانگرس میں ۷۱ فیصدی ڈیلی گیٹ چالیس برس سے کم عمر کے تھے۔ دوسری میں فی صد تناسب گھٹ کر ۲۰۰۶ رہ گیا، تیسری میں ۱۳۰۹ اور موجودہ کانگرس میں یہ ۱۲۰۲ ہے۔ میرے مصنف بھائیو، ہم بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ وقت اب آن پہنچا ہے کہ کانگرسوں اور انجمن مصنفین کا انتظام سنبھالنے والے اداروں اور حلقوں کی سرگرمیوں میں جرأت کے ساتھ نوجوان کو کھینچ کر لائیں۔ اب جو کیفیت ہے وہ فوج کے انتظام جیسی ہے جہاں ترقیوں کی رفتار اتنی سست ہوتی ہے کہ جرنیل کے عہدے تک پہنچتے پہنچتے آدمی کی شکل ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ بری طرح کرم خوردہ سا نظر آنے لگتا ہے۔ سفید بال قابل احترام یقیناً ہوتے ہیں لیکن قیادت کا حقدار بنانے کی ایک یہی چیز تو نہیں ہو سکتی یا ہو سکتی ہے؟ اس کانگرس میں ڈیلی گیٹوں کی اوسط عمر قریب قریب ساٹھ ہے۔ کیا یہ افسوسناک صورت حال نہیں ہے؟ یہ کیفیت ہماری آج کی ہے لیکن ایک اچھا صاحب خانہ آنے والے کل کی فکر

کیا کرتا ہے اور ہمیں اپنے آپ کو ایک اچھا صاحب خانہ تصور کرنے کا حق پہنچتا ہے اور ہم ایسے نہیں ہیں کہ اپنے گھر کو خاک ہوتے دیکھیں۔

چنانچہ، جیسا کہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں، نوجوانوں کو ترقی دینا فوری مسئلہ بن چکا ہے جسے ملتوی نہیں کیا جا سکتا اور جس کے متعلق فیصلہ فوراً کرنا چاہئے۔

کچھ عرصے سے مغرب میں شورغوغا بلند ہو رہا ہے کہ ہم سوویت مصنفوں کو تخلیقی ''آزادی'' ملنی چاہیئے۔

۱۹۲۱ء میں میاسنیکوف کو جواب دیتے ہوئے جن کی تجویز یہ تھی کہ سب کو جن میں شاہی پسندوں سے لیکر نراجیوں تک شامل ہوں، آزادئی تحریر دی جائے، لینن نے لکھا تھا:

''بہت اچھا! لیکن ذرا ٹھہریئے: ہر مارکسی اور ہر مزدور ہمارے انقلاب کے چار سال کے تجربے پر غور و خوض کرنے کے بعد کہیگا: 'آئیے اس کے بارے میں تحقیق تو کر لیں — کس قسم کی آزادئی تحریر؟ کس غرض سے؟ کس طبقے کے لئے؟'''

مارکسی اور مزدور، انقلاب کے پچاس برس کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد ان لوگوں کے اصرار پر جو قطعی ''آزادئی'' تحریر کے خواب دیکھ رہے ہیں، اب کیا کہیں گے؟

دنیا تشویش اور خطرے میں مبتلا ہے۔ اور یہاں کوئی مطالبہ کرتا ہے کہ سب کو — شاہی پسندوں سے لیکر نراجیوں تک کو — آزادئی تحریر حاصل ہو۔ یہ کیا ہے — خالص بھولپن یا نری ڈھٹائی؟

یہ ''آزادی'' باز ہمارے نوجوانوں کو بےراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حضرات، آپ فضول کوشش کر رہے ہیں! آپ کے ساتھ نہ ''ٹیڑھے'' نوجوان مصنف آئیں گے اور نہ ''سیدھے''۔ ہماری مادر وطن کی خوشیوں اور غم میں وہ شریک ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اور ہم ایک کو بھی آپ کے حوالے نہیں کریں گے۔

حب الوطنی کی جنگ عظیم میں مصنفوں کے کام کی یہاں تعریفیں کی گئی ہیں۔ کوئی بات تو ہے جس کی وجہ سے سوویت فوج کا سیاسی انتظامی محکمہ ہمیں اولین محفوظ دستوں میں شامل کئے ہوئے ہے۔ اگر ہمارے ملک کو خطرہ لاحق ہوا تو ہم پھر سے اپنی وردیاں پہن لیں گے اور بوڑھے اور نوجوان، ''ٹیڑھے'' اور ''سیدھے'' سب خود اپنی سوویت فوج کی صفوں میں شامل ہو جائیں گے۔ وجہ یہ کہ ہم اپنے عوام کا گوشت وپوست

ہیں، اور اس نے جس چیز کے حق میں جہاد کیا ہے اور جو کچھ حاصل کیا ہے وہ ہمارے لئے بےانتہا بیش بہا ہے۔

میں آخر میں چند الفاظ مستقبل کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔

کانستنتین فیدین نے ناول کے بارے میں جو کہا ہے کہ نثر کی یہ واحد صنف ہے جس میں ہمارے سماج میں رونما ہونےوالی تمام سماجی تبدیلیوں کا احاطہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے، تو میں اس سے پوری طرح متفق ہوں۔ ناول مصنف کو موقع دیتا ہے کہ وہ ایک بڑا پردہ کھولے اور عوام کی ذہنیت اور نقطۂنظر میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ان کا عکس پیش کرے اور اپنے بنیادی کرداروں کی زندگی کے برسوں کے واقعات کی تفصیل پیش کرے۔

وقت آ گیا ہے کہ ہمارے مشہور و ماہر افسانہ نگار بڑے بڑے پردوں پر تصویرکشی کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ افسانوی ادب کی بڑی بڑی تخلیقات کی ان میں صلاحیت و جوہر بدرجہ اتم موجود ہے جو ہمارے ادب کو اور بھی مالامال کر دیں گے۔

گورکی کی پیشقدمی پر ہم مختلف کارخانوں اور فیکٹریوں کی تاریخ شائع کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ اجتماعی فارموں اور ریاستی فارموں کی تاریخوں کی تصنیف میں مصنفین مصروف ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ کتابیں ناولوں کا بدل نہیں ہیں۔ لیکن ان کو ایک رزمیہ ناول کی بنیاد ضرور بنایا جا سکتا ہے۔ اور ماخذ کی حیثیت سے وہ کسی بھی مصنف کو بےحساب مدد دے سکتی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہمارے ارادوں اور ہماری صلاحیتوں کے درمیان کوئی عدم توازن نہیں ہے۔ اور جشن سالگرہ کا زمانہ ختم ہو جانے کے بعد بھی ہمیں اتنی ہی محنت سے کام کرنا ہوگا۔ مجھے پکا یقین ہے کہ سوویت ادب اپنے ملک کو اور دنیا کو بہت سے نئے دلچسپ اور دلنشین ناول پیش کرےگا۔ اس کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لئے ہمارے پاس تمام امکانات اور صلاحیتیں موجود ہیں۔

میں دل کی گہرائیوں سے دعا کرتا ہوں کہ جستجو اور تلاش میں آپ سب کے حوصلے بلند رہیں اور تخلیقی کاوشوں میں کامیابی آپ کے قدم چومے۔

۱۹۶۷ء

ایسے شاندار لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا کتنی خوش نصیبی ہے !

(اجتماعی کاشتکاروں کی تیسری کل یونینی کانگرس میں تقریر)

ساتھیو !

مجھے خوشی اور فخر ہے کہ آپ کی کانگرس کے اس زبردست اہمیت کے موقع پر جو صرف اجتماعی کاشتکاروں کے لئے ہی نہیں بلکہ ہم سب کے لئے، پورے ملک کے لئے اہم ہے آپ کو تسلیمات عرض کروں۔

پچھلے چالیس سال میں بڑے بڑے واقعات رونما ہو چکے ہیں، اجتماعی فارم کے گاؤں کی زندگی کی ظاہری شکل و صورت بہت بدل گئی ہے، اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ خود اجتماعی کاشتکاروں کی ذہنیت میں تبدیلی آ گئی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا عام طور پر سب کو علم ہے اور آج میں تقریر اس کے بارے میں نہیں کروں گا۔

برسوں پہلے آغاز کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہوئے بار بار یہی خیال آنے لگتا ہے : کتنی حیرت انگیز دوراندیش ہوگی وہ ہستی جس کا جشن صدسالہ ہم عنقریب منانےوالے ہیں اور جس نے ہمارے ملک کے ارتقا کی راہیں متعین کی تھیں، اور جو نقشہ بنایا گیا تھا اس کی تکمیل کے لئے ہماری پارٹی میں کتنی حیرت انگیز قوت ارادی اور طاقت رہی ہوگی اور ملک کو صنعتی اعتبار سے ترقی دینے کے ساتھ ساتھ اجتماعی فارم کا نظام قائم کرنے میں کتنی جرأت کا مظاہرہ کرنا پڑا ہوگا!

دور افق میں ایک بڑی جنگ کی بجلیاں چمکنی شروع ہو گئی تھیں اور جب جنگ واقعی شروع ہو گئی تو اجتماعی فارم فوج کے لئے، مزدور طبقے کے لئے اور بحیثیت مجموعی پورے ملک کے لئے رسد فراہم کرنے کے قابل ہو چکے تھے۔ ست نچوڑ لینےوالی جنگ کے چار برسوں نے ہمیں پیٹ پر پتھر باندھ لینے کو مجبور کیا، مگر ہم ڈٹے رہے اور جیت کر ہی دم لیا اور سمندر پار کے چچا کے سامنے روٹی کے لئے ہاتھ نہیں پھیلایا۔

اس کی یاددہانی ہم بہت کیا کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اجتماعی کاشتکاروں کا ایک بار زیادہ شکریہ ادا کرنا چاہئے ہی چاہئے، اور ان کے سامنے ایک بار زیادہ جھک جانے سے کسی کی کمر ٹوٹ نہیں جائیگی۔

آجکل ہم سب پر کامریڈ بریژنیف کی تقریر کا اثر چھایا ہوا ہے۔ اس میں دل ہلا دینےوالے جو حقائق، اعدادوشمار اور نتائج پیش کئے گئے ہیں وہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مثلاً فی کس زیرکاشت زمین کے عدد ہی کو لیجئے۔ اپنی سادہ لوحی میں ہم میں سے اکثر و بیشتر کا خیال تھا کہ زمین کے اعتبار سے ہم بےانتہا مالدار ہیں اور درحقیقت پتہ یہ چلا کہ ہم کچھ زیادہ خوش حال نہیں...

یہ ان مسئلوں میں سے ایک ہے جنہیں سب پر سبقت دینی چاہئے کیونکہ اس کا تعلق صرف اجتماعی کاشتکاروں سے نہیں بلکہ ہم سب سے، سوویت یونین کے باشندوں سے، موجودہ اور آئندہ نسلوں سے ہے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ زمین اسی طرح ناقابل تقسیم ہے جس طرح کہ دنیا اور جہاں ہم اپنی مزروعہ زمین کو، اس زمین کو جو ہمیں غذا فراہم کرتی ہے پیار اور احتیاط سے برتتے ہیں وہاں ہم سب پر یہ بھی لازم ہے کہ باقی زمین کو بھی جس پر ہم رہتے اور کام کرتے ہیں، خوشیاں مناتے اور صدمے اٹھاتے ہیں اور انسان کی بھلائی کے لئے اس پر جو کچھ موجود ہے اس کو بھی اسی محبت اور احتیاط سے برتیں۔ میری مراد جنگلوں اور دریاؤں اور ان کے باسیوں سے ہے۔ ان مسائل کی جانب اپنے رویے پر ہمیں بار بار پھر سے غور کرنا چاہئے اور فوری فیصلے کرنے چاہئیں اور جہاں ضرورت ہو وہاں سخت اقدامات کرنے چاہئیں تاکہ قدرت نے ہماری فلاح وبہبود کا جو سامان فراہم کیا ہے اس کو محفوظ رکھ سکیں۔ لیونڈ ایلیچ بریژنیف کی تقریر میں ہم نے جو مدھم مدھم سخت تنبیہ سنی ہے وہ نہایت بروقت ہے۔ اور اس تنبیہ پر آپ جیسے کفایت شعار صاحب خانہ کے لئے کان دھرنا بھی مفید ہوگا۔

ڈیلی گیٹوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ان میں سے بہت سے اپنی فوری اہمیت کے اعتبار سے ولولہ انگیز ہیں۔ اور ہونا بھی یہی چاہئے کیونکہ ڈیلی گیٹ کفایت شعار آقائے زمین ہیں اور وہ ہمارے عظیم الشان سماج کے آئندہ ارتقاء کے امکانات کا خاکہ تیار کر رہے ہیں۔

اجتماعی فارم کی تحریک کے پرانے تجربہ کار لوگوں کے بارے میں اس منبر پر سے بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اسے میری گستاخی پر محمول نہ کیجئے مگر میں اپنے آپ کو بھی ان پرانے تجربہ کار لوگوں میں شامل کرتا ہوں کیونکہ اجتماعی فارم کے نظام کی پیدائش اور استحکام کا شاہد بھی تھا۔ اور آج جب کئی نسلوں کی نمائندگی کرنےوالے سوویت کسانوں کے جوہر کو میں یہاں اس ہال میں یکجا پاتا ہوں تو میں فخر

کے ساتھ اس شاندار تواریخی مسافت کے متعلق سوچنے لگتا ہوں جو ہمارے سوویت گاؤں نے گذشتہ چالیس سال کے عرصے میں کی ہے اور مجھے احساس ہو جاتا ہے کہ ادب اور آرٹ میں اس مسافت کو جرأت کے ساتھ، اس کے شایان‌شان انداز میں پیش کرنا کتنا ضروری ہے -

میرا پیشہ‌ورانہ فرض مجبور کرتا ہے کہ ادب کے بارے میں چند الفاظ عرض کروں - بات یہ ہے کہ کاشتکاری کی طرح ادب میں بھی اچھی فصل کے سال بھی ہوتے ہیں اور خراب فصل کے بھی، سوکھا بھی پڑتا ہے، آندھیاں بھی آتی ہیں - اپنے ہاں کے ضرررساں کیڑوں مکوڑوں کے خلاف آپ کامیابی کے ساتھ جدوجہد کر رہے ہیں مگر ہمارے ہاں، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب بھی کچھ کولوریڈو مکوڑے موجود ہیں - اس قسم کے جو کھاتے تو سوویت روٹی ہیں مگر پھر بھی خدمت اپنے مغربی بورژوا آقاؤں کی انجام دیتے اور اپنی تحریریں چوری چھپے انہیں بھیج دیتے ہیں - لیکن آپ کے کھیتوں کی طرح اپنے ادبی چمن کو ہم بھی ہر طرح کے کیڑوں مکوڑوں اور خس و خاشاک سے پاک کرنا چاہتے ہیں اور ضرور کرلیں گے -

پیداوار کے معاملے میں ہمارے مقاصد ویسے ہی ہیں جیسے آپ کے یعنی اچھی قسم کی چیزیں کافی مقدار میں پیدا کی جائیں - ہمیشہ ہی ہمیں کامیابی نصیب نہیں ہوتی لیکن آپ کو بھی تو نہیں ہوتی -

علاوہ ازیں ہمیں ایسی چیزیں تیار کرنی ہوتی ہیں جو قدروقیمت میں دیرپا ہوں لیکن بدقسمتی سے تمام کتابیں ہی ایسی نہیں ہوتیں جو وقت کی آزمائش پر پوری اتریں - لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ گاؤں کی زندگی کے متعلق ہمارے ہاں کچھ اچھی کتابیں تخلیق ہو چکی ہیں اور چونکہ میں کٹر رجائیت‌پسند ہوں اس لئے مجھے پورا یقین ہے کہ ہم‌عصروں کے متعلق نئے بڑے بڑے ناول بھی ضرور لکھے جائیں گے -

ایک چیز اور ہم میں مشترک ہے — وہ پرمسرت فخر جو ہمیں اپنے نوجوانوں پر ہوتا ہے اور وہ امیدیں جو ہم ان سے وابستہ کرتے ہیں - نوجوان مصنفوں میں بہت سے ایسے ہیں جن میں حقیقی صلاحیتیں موجود ہیں اور قدرتی بات ہے کہ اہم اور پوری قدروقیمت کی تصانیف کی ہمیں سب سے پہلے انہیں سے توقع ہے -

اور آخر میں سچ پوچھئے تو ساتھیو، میرے ہم‌وطنو، اس کانگرس کے ڈیلی گیٹوں میں آپ کو یہاں دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ میں

کتنا خوش قسمت ہوں کہ زندگی میں ایسے جلیل القدر لوگوں کا ہمسفر ہوں!

ایسے قوی ہیکل لوگوں، ایسی طاقتور پارٹی کا ساتھ ہو تو پورے کے پورے پہاڑ کھسکائے جا سکتے ہیں! اور جب ضرورت ہوتی ہے تو واقعی ہم پہاڑوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیتے ہیں -

پہاڑوں کا کھسکانا تو کیا، ہم خود شیطان کے سینگ مروڑ ڈالتے ہیں - اور ۱۹۴۵ء میں ہم نے اس کے سینگ توڑ ہی ڈالے - اگر نئے سینگ نکل آئے تو ہم ان کو پھر توڑ دیں گے - یہ نیک کام انجام دینے کی ہم میں قوت بھی ہے اور صلاحیت بھی -

جلد ہی یہ کانگرس ختم ہو جائے گی - وقت رخصت میری دعا ہے کہ عظیم، کثیر قومی سوویت دیس کی شان دوبالا کرنے کے لئے آپ بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کریں -

لینن کی مادر وطن کی جس پر اس کے ہم جاں‌نثار بیٹوں اور بیٹیوں کا تو ذکر ہی کیا کل محنت کش نوع انسانی کو، دنیا کے تمام ترقی پسند خیالات کے لوگوں کو بجا طور پر فخر ہے، شان دوبالا کرنے میں آپ کی کامیابی کا دعاگو ہوں -

۱۹۶۹ء

پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی آپ کا بہت شکر گذار ہوگا اگر آپ ہمیں اس کتاب، اس کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دے سکیں تو ہم ممنون ہوں گے۔

ہمارا پتہ: زوبوفسکی بلوار۔ نمبر ۲۱
ماسکو، سوویت یونین
21, Zubovsky Boulevard,
Moscow, USSR